خوفناک اور دہشتناک مختلف کہانیاں

# روپ بدلنے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا کبھی آپ نے ڈائری لکھی ہے؟ اکثر مرد ڈائری لکھتے ہیں اور میں بہت سی ایسی معزز خواتین کو بھی جانتی ہوں جو بلاناغہ اپنی ڈائری لکھتی ہیں۔ مردوں کے بارے میں تو مجھے اندازہ نہیں لیکن خواتین کی ڈائریاں غم و اندوہ سے بھری ہوتی ہیں کیونکہ ایک عورت کی زندگی میں انتظار کے سوا اور رکھا ہی کیا ہوتا ہے! لیکن میں جو ڈائری آپ کو پڑھوانے جا رہی ہوں' وہ ایک ایسی خاتون کی ڈائری ہے جو لومڑی بھی تھی --- دوسرے لفظوں میں ایک ایسی لومڑی کی ڈائری جو عورت بھی تھی۔ جی ہاں! میں ایسی روباہ ہوں جو عورت بنی' پھر عورت سے روباہ بننے پر مجبور ہوئی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس قصے کا آغاز کس طرح کروں؟ میں محض ایک لومڑی ہوں اور مجھے زبان کی نزاکتوں کا کیا پتہ! کچھ کہنے سے پہلے ظاہر ہے مجھ رک کر سوچنا پڑے گا۔

--------○☆○--------

ہم لوگ یوشی فیوجی کے اسٹور روم میں فرش تلے تنگ سی جگہ پر رہتے تھے۔ میں' میرا بھائی' دادا جان' امی یہی کچھ ہمارا خاندان تھا۔ اسٹور روم کچن گارڈن میں واقع تھا۔ اسٹور روم کے فرش تلے ہم نے اپنا بل کھود رکھا تھا۔ ہمارے سروں پر لکڑی کے تختوں کا فرش تھا اور نیچے کے گرد و غبار میں ہم اپنے شب و روز بسر کرتے تھے۔

یہ موسم گرما کی بات ہے۔ میں اور میرا بھائی باہر باغ میں نکلے اور یوشی فیوجی کے گھر کے عقب میں گھنے درختوں میں دوڑنے لگے۔ ہمیں سخت بھوک لگی تھی اور ہماری نظریں چوہوں' پرندوں اور خرگوشوں وغیرہ کو تلاش کر رہی تھیں لیکن شاید وہ ہم سے زیادہ چالاک تھے' اس لیے کوئی ہمارے ہاتھ نہ آیا اور ہم بھوکے ہی رہے۔ یوشی فیوجی کے گھر سے کھانے پینے کی اشیا چرانا آسان تھا' اس لیے ہم اسٹور روم کی آڑ میں چھپ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگے۔

یوشی فیوجی کا باورچی ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اس کی آنکھوں پر گوشت لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ دنوں بعد آ کر زمین سے جڑیں اکھاڑتا۔ یہ کھانے والی جڑیں تھیں۔ بعض اوقات ایک آدھ جڑ گر پڑتی' تو میں منتظر رہتی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جب جوانی جبلتوں پر انسانی جبلتیں غالب آگئیں، محبت کی قوت نے اسے انسانی روپ دھارنے پر مجبور کر دیا اور پھر...؟ ایک نہایت پُراسرار اور عجیب و غریب کہانی۔

# روپ بدلنے والی

ماسٹر جوہنسن

کہ میرے بال اور کان کھڑے ہوگئے ہیں۔ "میں جارہی ہوں کیونکہ یہ تمہارا حکم ہے۔" اس نے یوشی فیوجی سے کہا۔ "لیکن خدا کے لیے تم بعد میں گھر جلدی آنا۔" وہ چلی گئی تو یوشی فیوجی گھٹنوں کے بل باغ کی نرم زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور بولا: "اب تم جاؤ ننھی لومڑیو! چلی جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک نظم کے بند گنگنائے جس میں لومڑیوں کا ذکر تھا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا' اس نے اپنے گھٹنوں سے گرد جھاڑی اور بولا: "میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ اب یہاں سے جانا ہی عقلمندی ہوگی۔" وہ ایک ثانئے کو رکا۔ "بھاگ جاؤ ننھی لومڑیو! خود کو آزاد کراسکتی ہو تو کرالو۔"

وہ گھر کی جانب چل دیا اور میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ میرے بھائی نے میرے شانے پر منہ مار کر خبردار کیا تو میں نے کھلے دروازے سے اس کی پیروی کی اور ہم اپنے بل میں آگئے۔

اس رات مجھے احساس ہوا کہ محبت پہلی نظر میں کیسے ہو جاتی ہے۔ میں گھائل تھی۔ میرا مطلوب یوشی فیوجی تھا مگر میں ایک لومڑی تھی۔ میں بری طرح اپنی بے بسی پر روئی۔ میرے گھر والے خاموشی سے میری آہ وزاری دیکھتے رہے' پھر دادا مجھ سے مخاطب ہوئے: "تم میں جادو ہے' پھر تم کیوں روتی ہو! بتاؤ' تمہیں کیا چاہیے؟"

"سبھی لومڑیوں میں جادو ہوتا ہے دادا' لیکن سبھی لومڑیاں روتی تو نہیں ہیں نا؟"

"لیکن تمہارے والا جادو کسی میں نہیں۔" دادا نے کہا۔

-------○☆○-------

اس کے بعد میں اکثر و بیشتر باغ میں رینگ آیا کرتی۔ احتیاط سے ترشے ہوئے درختوں کے سائے سائے میں گھر کی جانب بڑھتی جو دیودار اور سیاہ لکڑی سے بنا ہوا بڑے بڑے چھجوں والا مکان تھا۔ آدھے چاند کی روشنی میں باغ میں بنی مصنوعی آب جو کے چھوٹے سے پل کو عبور کرتی ہوئی میں آرائشی چٹان کے قریب سے گزر کر بید کے چھوٹے سے درخت تلے آچھپتی۔ آرائشی چٹان کائی نما گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں کبھی گھاس' کبھی بید کے درخت اور کبھی سدا بہار جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ کر دیوانوں کی طرح گھر کی جانب تکتی رہتی جہاں میرے من مندر کا دیوتا رہتا تھا -----یا میں گھر کے فرش تلے بنے بل میں چھپی رہتی' ایک لومڑی کے چھپنے کو جگہوں کی کونسی کمی تھی!

جب بھی مجھے موقع ملتا' میں اپنے محبوب کی ایک جھلک دیکھنے' اس کی آواز سننے کے لیے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چھپ چھپا کر نکل آتی۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا تھا' کبھی دوستوں کے ساتھ شکار پر تو کبھی اپنی نوکری کے سلسلے میں دوروں پر۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ وہ ساری رات باہر گزار دیتا اور صبح ہونے کے قریب لوٹتا تو اس کے کپڑوں اور جسم پر باہر کی خوشبو چپکی ہوتی۔

مجھے اس کی بیوی شکیبو پر بڑا ترس آتا۔ اگرچہ اس کا کمرہ شمالی سمت اندرون میں تھا' لیکن جب بھی وہ پردے ہٹاتی تو میں اس کی ایک جھلک ضرور دیکھ لیتی۔ وہ وقت گزاری کے لیے اپنی خادماؤں کے ساتھ ایسے کھیل کھیلتی جو بچے کھیلا کرتے ہیں۔ کھیل سے اکتا کر وہ خوش خطی کی مشق کرنے لگتیں' نظمیں لکھتیں اور گیت گاتیں۔ جب جی میں آتی تو بگھی منگوا کر خانقاہ چلی جاتیں اور مناجات پڑھتیں۔ صاف ظاہر ہوتا کہ شکیبو کی یہ تمام مصروفیات یوشی فیوجی کے خلا کو پر کرنے کی ایک کوشش ہے تاآنکہ وہ لوٹ آتا۔ شکیبو کی زندگی میں دو ہی چیزیں نمایاں تھیں ----دھندلکا اور انتظار [illegible] اس [illegible] مجھے اس [illegible] پر اس سے حسد محسوس ہوتا جو وہ یوشی فیوجی کی معیت میں گزارتی۔

پھر ایک روز شکیبو چلی گئی۔ وہ دارالحکومت میں اپنے میکے گئی تھی۔ وہ اپنی بہت سی خادماؤں اور نوکروں کو بھی ساتھ لے گئی۔ ان میں وہ کیم سخیم باورچی بھی شامل تھا۔ اب گھر خالی خالی اور خاموش ہوگیا تھا۔ یوشی فیوجی اب بھی کم ہی گھر پر ہوتا تھا' لیکن جب بھی ہوتا تو تنہا ہی ہوتا۔ وہ زیادہ وقت لکھنے لکھانے میں گزارتا' یا پھر مصوری کرتا۔ شام کے جھٹ پٹے میں وہ اکثر باغ میں سے ہوتا ہوا گھر کے عقبی حصے میں سے جنگل کا رخ کرتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جنگل کا راستہ دو مندروں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ دونوں جانب دیودار کے گھنے درخت تھے۔ میں اس کا تعاقب کرتی اور گھپ اندھیرے میں اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔

ایک رات میں بید کے چھوٹے سے درخت تلے چلی آئی۔ یوشی فیوجی اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ کمرے کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ باغ میں پھیلی چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ آتشدان میں دہکتے سرخ کوئلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میرے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور سینے میں کوئی چیز اٹک سی گئی۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آرائشی چٹان پر سے ایک سایہ سا پھسلا اور میرے قریب آکر رک گیا۔ یہ دادا جان تھے۔ انہوں نے میرے بہتے آنسو دیکھ کر کہا: "تم مرجاؤ گی۔ کھانا نہ پینا۔ یہ تم کیا روگ لگا بیٹھی ہو!"

"مجھے پروا نہیں۔ میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں۔" میں سسک پڑی۔

وہ چند ثانئے خاموش رہے، پھر بولے: "اس کے باوجود بھی کہ تم ایک لومڑی ہو!"

"دادا! ہم لومڑیاں ہیں اور ہمارے پاس جادو ہے۔ کیا ہم اسے اپنے پاس نہیں لاسکتے؟"

"کیا تم سچ مچ ایسا چاہتی ہو؟" دادا نے پوچھا۔

"ہاں، ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

"اگر تم یہ چاہتی ہو تو پھر ہم ضرور وہ کریں گے جو اس سے پہلے نہیں ہوا۔" دادا نے بڑے عزم سے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔

-------○☆○-------

جادو کو روبہ عمل لانے کا مرحلہ بہت سخت تھا۔ ہم سب کو اس پر بہت وقت صرف کرنا پڑا۔ میں ایک روباہ تھی، لیکن میرے دادا نے مجھے عورت بنا دیا۔ میری سیاہ زلفیں اس قدر نرم و ملائم تھیں جیسے کسی جھرنے کا گرتا ہوا دھارا۔۔۔۔۔۔ اور دراز اتنی کہ گھٹنوں سے نیچے تک آتی تھیں۔ ایک رات میں نے ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اپنے حسین اور دلفریب چہرے پر چٹکی چاندنی دیکھ کر میں خود ہی شرما گئی۔

دادا نے مجھے ایک چھوٹی سی سفید گیند دی جو اندھیرے میں چمکتی تھی۔ میں نے تجسس سے اسے دیکھا۔

"تمہارے کھیلنے کو۔" دادا نے کہا۔ "تم اب ایک دوشیزہ ہو، اس لیے مزید اپنے بھائی کے ساتھ نہیں کھیل سکتیں۔ مزید برآں تمہارے ایسی روباہ عورت کے لیے اس طرح کی گیند بڑی روایتی ہے۔"

"مگر دادا! مجھے تو گیند کے ساتھ کھیلنا قطعاً پسند نہیں۔"

"تم ابھی نہیں جانتیں کہ تمہارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسے اپنے پیرہن میں رکھ لو۔ جلد یا بدیر تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

جادو کے ذریعے ہم نے اسٹور روم کے فرش کے نیچے کی خالی جگہ پر بے شمار کمروں اور در و بام والا عالیشان محل تعمیر کرلیا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین، دیواروں پر ریشمیں پردے، نوکر چاکر، باندیاں، قیمتی اور نایاب لکڑی کا فرنیچر جس پر سنہری روغن کیا گیا تھا، دیدہ زیب صندوقوں میں اطلس و کمخواب کی قبائیں، مرمریں ساغر، کچھوے کے خول سے بنی کنگھیاں، نقرئی اور طلائی ظروف جو یوں چمکتے تھے جیسے کسی جھیل کی تہہ میں دمکتے کنکر۔ نہیں! ہم نے یہ چیزیں بنائی نہیں تھیں، بس کچھ ایسا کردیا تھا کہ یہ سب کچھ نظر آتا تھا۔ بس میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتی۔ ہم نے اپنے قصر کو ان عالی شان اشیا اور مختلف النوع نوادر سے آراستہ کرنے کے بعد اردگرد خوبصورت چمن بنایا جس میں رنگ برنگ پھول اور شجر تھے، تالاب تھے اور سدا بہار کی جھاڑیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔

اگر میں اب بھی ایک روباہ ہی ہوتی تو یہ سب کچھ ایک روباہ کا خواب ہوتا مگر میرا خواب تو وہ تھا۔۔۔۔ یوشی فیوجی! ہمارے عالی شان محل پر سورج چمکتا تھا، چاند اپنی کرنیں بکھیرتا اور ستارے ٹمٹماتے تھے جیسے کہ اصلی دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے بے شمار خدام تھے جو سب کے سب مستعد، مودب اور تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔

ہم سب نے خود کو ایک آدم زاد خاندان کی شکل



دے دی تھی۔ میرا بھائی چھریرے بدن کا ایک خوبرو نوجوان تھا۔ ماں ایک نفیس اور نازک طبع خاتون تھیں۔ ان کے ٹخنوں تک لمبے بالوں میں چاندی کے تار لہراتے تھے۔ دادا کی وجاہت بے حد و حساب تھی۔ وہ گیروے رنگ کی پوشاک پہنتے تھے۔ میں نے ازراہ تفنن ماں سے کہا: "ماں! کیا ہو اگر وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لے؟"

ماں میرے اس سوال پر شرمندہ سی ہوگئیں اور دادا پوچھنے لگے کہ بات کیا ہے؟ میں نے وضاحت کی تو ہنس کر کہنے لگے: "وہ انسان ہے۔ اسے وہی کچھ نظر آئے گا جسے وہ دیکھنا چاہے گا۔ کیا تم خوش ہو بیٹی؟"

"ہاں دادا! یہ سب کچھ بہت خوبصورت ہے، میری سوچوں سے بھی زیادہ، لیکن اس کی کمی ہے جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے۔"

میری یہ بات سن کر بھائی نے ناگواری کا اظہار کیا تو دادا نے اسے سرزنش کی: "باادب بنو بھئی! جس قدر ممکن ہو، بشرطیکہ اپنی بہن کی خوشیوں کی خاطر۔"

"کیونکہ" میری ماں نے لقمہ دیا۔ "اسے ایک آدم زاد سے محبت ہوگئی ہے، اور ہم یہ سب کچھ اسی کے لیے کررہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" بھائی نے کہا۔ "میں اس کا اچھا بھائی اور آپ کا اچھا بیٹا بنوں گا.... لیکن میں افسردہ بھی ہوں۔"

"وہ آدم زاد ہماری مدد کرے گا۔" دادا نے کہا۔ "وہ ہمارا روزی رساں بن جائے گا اور شاید تمہیں کوئی اعلیٰ سرکاری منصب مل جائے۔"

"میں آپ لوگوں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" بھائی نے اداسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" دادا نے اطمینان ظاہر کیا، پھر مجھ سے پوچھا: "کیا تم اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو بیٹی؟"

"ہاں دادا۔" میں نے کہا۔ "میں سب کچھ کر گزروں گی۔"

------○☆○------

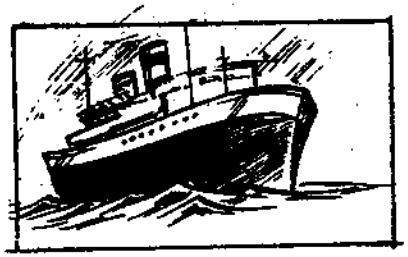

اگلے روز جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے دادا کی ہدایت کے مطابق اپنی خادماؤں کو ساتھ لیا اور



اس پگڈنڈی پر چل دی جو صنوبر کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی جنگل میں گم ہو جاتی تھی۔ ایک خاص مقام پر جاکر ہم رک گئیں۔ اب ہمیں یوشی فیوجی کا انتظار تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمیں اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ معمول کے مطابق شام کی چہل قدمی کے لیے گھر سے باہر آیا تھا۔ پہلے میں نے اسے دیکھا۔ وہ گھر کے سادہ کپڑوں میں تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا شاید اپنی بیوی کی جدائی پر اداس ہے۔ وہ تھی بھی بہت خوبصورت اور نازک اندام۔ میں سوچنے لگی کہ یہ میں کیا کرنے جارہی ہوں۔ میں شکیبو سے اس کا شوہر چھیننے والی تھی۔ اب وہ اپنے تاریک کمرے میں ہمیشہ اس کا انتظار کرے گی۔ اس کی غمزدہ زندگی کی یکسانیت دور کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ "ہاں کوئی نہیں آئے گا۔" میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

شائد اس نے میری آواز سن لی تھی یا خادماؤں کو دیکھ لیا تھا کیونکہ ان کی قباؤں کے شوخ رنگ اندھیرے میں بھی چمک رہے تھے۔ وہ بے قرار ہوکر ہماری جانب لپکا۔ میری خادمائیں کھسر پھسر کرنے لگیں۔ انہوں نے چہرے گھما کر اپنی پنکھیوں کی آڑ میں کرلیے۔ اس کی آنکھیں مجھ سے دوچار ہوئیں۔ میری آنکھوں میں طلسمی کشش تھی جس سے میں بخوبی آ… تھی۔ وہ ان نظروں کا اسیر ہوگیا۔ وہ میرے قریب آگیا تھا۔ میں پلٹ گئی مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی قبا سمیٹ کر بھاگنے لگتی، اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر کہا: "رکو!"

مجھے لگا جیسے کسی چوہے دان میں پھنس گئی ہوں۔ میری خادماؤں نے پریشان ہوکر شور سا مچایا۔ میں نے کہا: "پلیز! مجھے جانے دو۔"

"نہیں۔" اس نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔ "تم

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کس قدر حسین ہو!" وہ مبہوت سا ہو گیا۔

مجھے اپنی پنکھی یاد آئی۔ میں نے اسے اپنے چہرے کی ڈھال بنایا۔ اس نے شانے سے ہاتھ ہٹا کر میری کلائی تھام لی۔ اس کے یوں چھونے سے میں مضطرب ہو گئی۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ہم نے جو اپنا طلسمی جزیرہ آباد کیا تھا اس میں سجائی گئی چیزوں کا کوئی نام رکھا تھا اور نہ ہی روپ بدلنے کے بعد اپنے ہی کوئی نام رکھے تھے' لیکن اس نے جیسے میری بات کا یقین کر لیا۔

"میرا نام یوشی فیوجی ہے۔" وہ خود ہی بتانے لگا۔ "میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں' لیکن تم اس وقت یہاں جنگل میں کیا کر رہی ہو؟ تمہاری حفاظت کے لیے کوئی مرد بھی ہمراہ نہیں ہے۔"

"وہ میں ۔ ہم...." میں ٹاک ٹوئیاں مارنے لگی' پھر سنبھل کر کہا۔ "دراصل یہ ایک مقابلہ ہے۔ ہم نے' یعنی میں اور میری سہیلیوں نے شام کے دھندلکے پر نظمیں لکھی ہیں۔"

میری خادماؤں نے تائید میں سر ہلائے۔

"کیا تم یہیں قریب ہی رہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' بس جنگل کے اس پار۔" میں نے جواب دیا۔ جادو کے زیر اثر اس نے بلا جھجھک میری اس بات پر یقین کر لیا' حالانکہ جنگل مشکل سے ایک دن کی مسافت کے بعد ختم ہو جاتا تھا اور یقیناً شکار کے دوران یہ سارا علاقہ اس نے کھنگال رکھا تھا۔

"پھر بھی' بہت اندھیرا ہو گیا ہے۔" وہ بولا۔ "اس طرح آپ خواتین کا اکیلے جانا مناسب نہیں۔ میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا اگر آپ بطور مہمان میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔ میں اپنی ایک خادم بھیج کر آپ کے گھر اطلاع کروا دوں گا' تو وہ آکر آپ کو لے جائیں گے۔"

میں نے اس کے گھر کے متعلق سوچا۔ مجھے شکیو یاد آئی۔ "نہیں' یہ ممکن نہیں۔ آپ کو زحمت ہو گی۔" میں نے کہا۔

شاید اسے بھی اپنی حسین بیوی یاد آ گئی تھی۔ میرے انکار پر وہ کچھ مطمئن سا دکھائی دیا۔ کہنے لگا: "تب آپ یہ بتائیے کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"ہم وہاں رہتی ہیں۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ میرے جھوٹ کو شاید اسی وقت پکڑ لیتا جب اس نے پگڈنڈی پر پہلا قدم رکھا تھا' لیکن اس کی نگاہیں تو مجھ پر تھیں۔ اس کا سر اس انداز سے جھکا ہوا تھا جیسے وہ میرے ہاتھ کی پنکھی کی اوٹ سے میرے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ویسے بھی اس نے اس جادوئی پگڈنڈی پر قدم رکھا تھا جو ہمارے تعمیر کردہ طلسمی محل تک جاتی تھی۔ یہ ایک طویل پگڈنڈی تھی۔ بڑی دیر تک ہم چلتے رہے تا آنکہ قصر کی روشنیاں دکھائی دیں۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں نے "اپنا گھر" کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جو میں دیکھ رہی تھی' وہ اسے قطعاً نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی شان سے گداز قالینوں پر قدم رکھتا ہوا محل میں داخل ہو رہا تھا جبکہ میں تو یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا اسٹور روم کے فرش تلے بنے ہمارے بل میں جا رہا تھا۔

میں برآمدے میں کھڑی تھی۔ میرے گرد خادماؤں کا جھرمٹ تھا جو مجھے اس کی بے تاب نظروں سے تحفظ فراہم کیے ہوئے تھیں۔

"تم اس گھر کی بیٹی ہو؟" اس نے استفہامیہ انداز سے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے مختصراً کہا۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ چمن اور گھر قندیلوں سے بقعہ نور بنے ہوئے تھے۔ "آپ کا خاندان تو بہت عالی ہے۔"

وہ میری پیروی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا استقبالیہ کمرے میں چلا آیا' پھر شش و پنج میں پڑ گیا کہنے لگا: "میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔ آپ بحفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہیں۔"

"ارے نہیں! ازراہ کرم آپ تشریف رکھیے۔ میرے گھر والے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے۔" میں



نے اشارہ کیا۔ خادمائیں میرے ساتھ ہی پردوں کے عقب میں غائب ہو گئیں۔ چند ہی ثانیے گزرے تھے کہ پہلو کا دروازہ کھلا۔ مجھے اپنے بھائی کی آواز سنائی دی: "معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے خیر مقدم کو صرف میری ہمشیرہ تھیں۔ دراصل مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ آپ ہمارے غریب خانے کو رونق بخشنے آئے ہیں۔" میں پردے کی دوسری جانب تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یوشی فیوجی نے کوئی اشارہ کیا ہے۔ چند لمحے بعد بھائی نے سلسلہ کلام جوڑا: "میں ہی یوشی کا پوتا ہوں۔ ان کی جانب سے میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کی رات ہمیں شرف میزبانی بخشیے۔"

"بہت ممنون ہوں۔ مجھے یوشی فیوجی کہتے ہیں۔"

"ابھی آپ کے کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے دادا کو آپ کی آمد سے باخبر کر دوں۔ وہ اس وقت گوشہ نشین ہیں۔ جونہی ان کا تفکر ختم ہو گا' وہ ہم میں آ کر مل جائیں گے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔" دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور میں نے اپنے بھائی کے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔

اس رات پھر میرا بھائی واپس آیا نہ ماں اور نہ ہی دادا جان۔ میرے پاس میری سہیلیاں تھیں۔ ہم سب خاموش تھے جبکہ یوشی فیوجی تنہائی کے احساس سے کسی قدر بے چین تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی پنکھی اس انداز سے گرائی کہ پردہ تھوڑا سا ایک جانب سرک گیا۔ میں نے مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔

پھر مہمان کو کھانا پیش کیا گیا۔ مجھے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو آئی۔ عین اسی وقت میرے نتھنوں میں ایک مردہ چوہے کی بو بھی آ رہی تھی جس کا انتظام میرے بھائی نے کیا تھا۔ مہمان نے کھانا بڑی رغبت سے کھایا اور خشک چوڑے پتے پر سے بارش کا پانی پیا۔ پانی کی یہ صورت صرف مجھے نظر آ رہی تھی جبکہ یوشی فیوجی کے لیے تو یہ انتہائی صاف ستھرا پانی تھا جو مرمریں ساغر میں سے پیش کیا گیا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد یوشی فیوجی نے پردے کی جانب دیکھتے ہوئے ایک خوبصورت نظم کے اشعار پڑھے جن کا مطلب کچھ یوں تھا کہ چاند سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں ہے۔ اگر یہ بدلیاں چاند کے چہرے سے ہٹ جائیں تو میں اسے جی بھر کے دیکھوں۔ میں اس کے بامعنی اشعار سن کر مسکرا دی۔ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی' پھر میں نے سوچا اگر میں کچھ نہ بولی تو وہ جان جائے گا کہ وہ کسی عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔ وہ اردگرد دیکھے گا' ممکن ہے وہ خود کو اپنے گھر کے بجائے مٹی میں لتھڑا اور مکڑی کے جالوں میں پھنسا دیکھ لے جیسے کہ میں اسے اپنی دوسری نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ اس جانب تشریف لے آئیے۔" میں نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔ میری جانب سے یہ پیش کش کچھ قبل از وقت تھی' لیکن مجھے اس کی توجہ ہٹانے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا تھا۔ یوشی فیوجی کچھ دیر پلکیں جھپکاتا رہا' پھر اٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔

ایک عالی مرتبت خاتون شاذ ہی تنہا ہوتی ہے' اس لیے میری خادمائیں بھی میرے پاس آ گئیں' لیکن پھر وہ سو گئیں۔ ان میں سے ایک تو ہلکے ہلکے خراٹے بھی لے رہی تھی۔ میرے ہاتھ کی پنکھی اب بھی میرے چہرے کے سامنے تھی جسے یوشی فیوجی نے آہستگی سے پکڑ کر ایک جانب رکھ دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کو پکڑا اور ان پر مہر محبت ثبت کر دی۔ میں نہال ہو گئی۔

---

اس سے پہلے میری جوڑی میرے بھائی کے ساتھ بنی تھی' لیکن اس وقت ہم بہت کم سن تھے۔ ایک آدم زاد کے ساتھ جوڑی کوئی ایسا مختلف تجربہ نہ تھا' پھر بھی یہ مجھے بہت مختلف اور بہت منفرد لگا۔ یوشی فیوجی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اپنے بکھرے بالوں کے ساتھ تو وہ اور بھی خوبصورت لگتا تھا۔ میں اس کے جمال کو دیکھ کر خوشی سے رو پڑی۔ اس نے انگلیوں کی پوروں سے میرے آنسو پونچھے تو میں سسک پڑی اور اپنا چہرہ اپنے گیسوؤں میں چھپا لیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اضطراب سے پوچھا۔

"وہ کس قدر اداس اور غمگین ہو گی!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"کون؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری بیوی۔" میں نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"مگر میں تو صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

تب مجھے صحیح معنوں میں پتہ چلا کہ یہ ہمارا جادو تھا جو پوری طرح اس کے سر چڑھ کے بول رہا تھا۔

صبح ہوئی' لیکن یوشی فیوجی رخصت نہ ہوا۔ وہ اب میرا تھا اور میرے پاس تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے تو جیسے وہ تھکتا ہی نہیں تھا۔ مشاطہ نے مجھے خوب سنوارا تھا اور خادماؤں نے نیا معطر لباس زیب تن کرایا تھا' پھر پہلو کا دروازہ کھلا اور میں نے دادا کو وہاں کھڑے پایا۔ اس نے سرخ چوغا پہن رکھا تھا۔ میں کچھ خوفزدہ ہو گئی۔ کمرے کی بے ترتیبی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آدم زاد کے ساتھ میری جوڑی بننے کا مرحلہ انجام کو پہنچ چکا ہے لیکن دادا نے کچھ نہ کہا۔ وہ شاید انجان بن گئے تھے۔

"اوہ! تو آپ ہیں۔" دادا نے مسرت سے کہا۔

"میں ہی یوشی ہوں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

یوشی فیوجی نے جھک کر کہنا چاہا: "میں ہوں---"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔" دادا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے پوتے نے رات ہی مجھے بتا دیا تھا۔ دراصل میں گوشہ نشین تھا۔"

یوشی فیوجی ایک بار اور جھک کر آداب بجا لایا۔ بولا: "آپ کی پوتی لاکھوں میں ایک اور بے حد ذہین خاتون ہیں۔"

"ہاں۔" دادا مسکرائے۔ "مجھے یقین ہے آپ اپنے لفظوں کا پاس بھی کریں گے۔"

"یقیناً۔" یوشی فیوجی نے کہا۔ "اور آپ کا گھر------بہت عالی شان---"

"اب آپ یہیں ٹھہریں گے۔" دادا نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

"یہ تو میرے لیے ایک اعزاز ہوگا۔" یوشی فیوجی نے کہا۔

"تو پھر آیئے! میرے ساتھ جام صحت نوش فرمایئے۔" دادا نے دعوت دی۔ یوشی فیوجی بلا تامل اٹھ کھڑا ہوا۔

میں خوشی سے سرشار ہو گئی۔ دادا اور یوشی فیوجی کمرے سے نکل گئے۔ جب یوشی فیوجی لوٹا تو تمام معاملات طے پا گئے تھے۔ ہماری شادی ہونا قرار پا گئی تھی۔

شادی کی رسم کے آغاز میں ہمیں ۲۷ گھنٹے باہم گزارنے تھے۔ تیسری رات شادی کا کیک کھانا تھا اور بھکشو کی موجودگی میں شراب کے جام پینے تھے۔ میں نے اور یوشی فیوجی نے شادی کی رسمیں دیکھیں۔ بھکشو ہاتھ اٹھا کر دعائیہ کلمات کہہ رہا تھا' لیکن جب میں نے دوسری نظروں سے یہ سب کچھ دیکھا تو میں سسک پڑی۔ چار لومڑیاں اور ایک پاگل سا غلیظ آدمی گرد و غبار میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں یوشی فیوجی سے محبت کرتی تھی۔ اس کے لئے بہتر سے بہتر کی خواہاں تھی۔ کیا یہ سب کچھ اس کے اپنے خوبصورت گھر اور پیاری سی بیوی سے اچھا تھا؟ اس سوال کا میں کوئی جواب نہ دے پائی سوائے اس کے کہ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اس کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت تھی' میں نے اسے پالیا تھا' بس!

---------☆ ☆---------

ہماری معمول کی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں یوشی فیوجی ہر رات اور دن کا بیشتر حصہ گھر پر گزارتا۔ وہ چاندنی راتوں میں مجھے خوبصورت اشعار سنایا کرتا۔ جس رات ہمارا تکیہ مشترک نہ ہوتا' وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہوتا' یا پھر برش اور رنگوں سے تصویریں بنانے لگ جاتا۔ ایک روز اسی طرح وہ کچھ لکھنے میں مگن تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو؟

"میرے پاس ایک ڈائری ہے۔" وہ بولا۔ "میں ہمیشہ سے ڈائری لکھتا آیا ہوں۔ میری بیوی-------" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میرا سانس ایک دم سینے میں اٹک گیا۔ مجھے علم تھا کہ بیوی سے اس کی مراد میں نہیں۔ چند ثانئے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنا سر ہلایا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا: "جانے میں کیا کہنے لگا تھا۔ بھول ہی گیا۔ شاید کچھ دیر بعد دوبارہ یاد آجائے۔"

"چلو اب سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا اور گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔

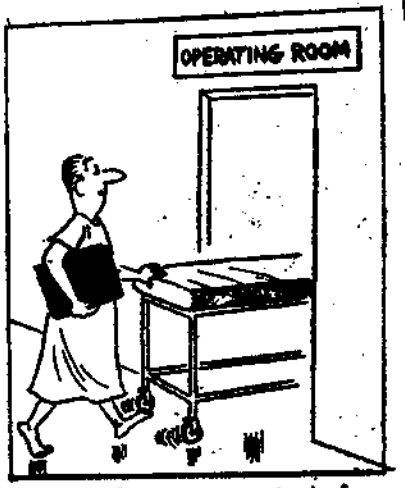



وقت گزرتا رہا۔ یوشی فیوجی نے اب مجھے تنہا چھوڑنا شروع کر دیا۔ میں اب دادا اور بھائی کے ساتھ ہوتی۔ میں آہ بھر کے رہ جاتی' لیکن میں جانتی تھی کہ یہ مجبوری ہے۔ آدمی کو اپنے جیسے کسی اور آدمی کی صحبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا جادو' یعنی فاکس میجک ایسا تھا کہ میرے سرتاج کی ذمہ داریاں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے کہ اس کی اصل زندگی میں۔ ہمارے گھر میں لوگوں کا مستقل آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان میں سے کچھ ضرورت مند ہوتے تو کوئی کسی کا پیغام لے کر آنے والے۔ میرے شوہر کے وسیع رابطے تھے۔ اس نے میرے بھائی کو ایک اچھی ملازمت دلا دی تھی۔

یہ کتنا عجیب تھا کہ خود مجھے بھی عجیب لگتا۔ میرا بھائی کیا ملازمت کر سکتا تھا؟ میں بھی روباہ تھی اور وہ بھی۔ حقیقت میں تو میرے بھائی کی کوئی نوکری تھی نہ لوگوں کا مستقل آنا جانا۔ یہ تمام باتیں خواب تھیں۔ میں اس سب کی وضاحت سے قاصر ہوں۔ یوں سمجھئے کہ یہ فاکس میجک تھا۔

ایک روز میرا شوہر دادا کے ساتھ شکار پر نکلا۔ میں گھر میں تنہائی محسوس کرنے لگی۔ مختلف کمروں میں بے مقصد ٹہلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کیا کروں۔ اچانک مجھے اپنی قبا کی آستین میں سے وہی چھوٹی سی سفید گیند مل گئی جو دادا نے مجھے ایک بار دی تھی۔ میں اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ میرا بھائی دوڑتا ہوا اندر آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"ہمشیرہ!" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "یوشی فیوجی کے گھر میں کچھ ہو رہا ہے جو ہمارے لیے خطرناک ہے۔"

"کیا؟ کیا ہو رہا ہے؟" میں بھی گھبرا گئی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یوشی فیوجی کے اصل گھر کی بات کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا کہ کہیں یوشی فیوجی ہمارے طلسمی حصار سے نکل کر اپنی اصل دنیا میں نہ لوٹ گیا ہو' اپنے گھر نہ پہنچ گیا ہو۔

"وہ اسے ہر جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے چاروں طرف نوکر پھیلا دیے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں۔" وہ مجھے آستین سے پکڑ کر باہر کی جانب کھینچتا ہوا بولا۔




مجھے فوراً ایک خیال آیا۔ میں خود کو چھڑا کر پیچھے ہٹی اور پوچھا: "کیا اس کی بیوی بھی وہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے وہ نہیں موجود۔ بس نوکر وغیرہ ہیں اور یوشی فیوجی کا بیٹا------"

"اس کا بیٹا بھی تھا؟" میں نے پوچھا اور باہر لپکی۔

ایک خوبرو عورت سے دوبارہ روباہ کی جون بدلنا خاصا مشکل تھا۔ اس عمل کے دوران مجھے یوں لگا جیسے میں پتھروں میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں اور میرے اعصاب چیخ رہے ہوں۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ لومڑی بن کر اسٹور روم کے فرش تلے گھس گئی اور یوشی فیوجی کے گھر میں ہونے والے ہنگامے کو بغور دیکھنے لگی۔

وہاں یوشی فیوجی کی شکل کا ایک لڑکا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ طلسم آزمائی سے قبل جب میں یوشی فیوجی کو دیکھا کرتی تھی تو اس لڑکے کو دیکھ نہ سکی تھی۔ اگرچہ وہ نو عمر تھا' لیکن اس کے احکامات میں اپنے باپ کا سا دبدبہ تھا۔ نوکر اس کے احکامات کی تعمیل میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ایک بھکشو چمن میں گھوم پھر کر کچھ تلاش کر رہا تھا اور گوتم بدھ کا نام لے کر مناجات پڑھ رہا تھا۔ وہ یوشی فیوجی کی واپسی کے لئے دعائیں کر رہا تھا۔ بھکشو ہمارے قریب سے گزرا تو ہم نے اپنے سانس روک لیے' لیکن وہ ٹھہرا نہیں اور کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ گوتم بدھ لومڑیوں سے مات کھا گیا تھا۔ ہم کچھ دیر تک اسٹور روم کے فرش تلے چھپے یہ سب کچھ دیکھتے رہے' لیکن کسی نے اسٹور روم کے فرش کے نیچے نہ جھانکا۔ ویسے بھی ایسی جگہ کسی

آدمی کی موجودگی کا کیا جواز ہو سکتا تھا!

جب میں دوبارہ عورت کی جون میں آئی تو مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔

---------☆ ☆---------

جب میں نے ماں کو بتایا تو وہ خوشی سے چیخ اٹھی: "کیا کہا؟ تم ماں بننے والی ہو؟"

"میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جب میں نے دوبارہ عورت کا روپ دھارا تو مجھے یہ محسوس ہوا۔ میں یہ بھی محسوس کر رہی ہوں کہ یہ بیٹا ہے۔"

"اوہ! بیٹا! کتنی اچھی خبر ہے۔ تم اس گھر کے لئے کتنی بڑی خوشی لانے والی ہو۔"

"لیکن ماں۔" میں نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہوگا؟ میں روباہ ہوں۔ میرا بچہ بھی روباہ ہوگا۔ یوشی فیوجی جب یہ دیکھے گا تو مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

ماں میری کم عقلی پر ہنس دی: "تم عورت بنی ہو۔ تمہاری شادی ایک آدم زاد کے ساتھ ہوئی ہے۔ تمہارا بچہ ایک انسان ہوگا۔ تمہارا شوہر دیکھے گا تو بہت خوش ہوگا۔ میں یہ خوش خبری تمہارے دادا کو سناتی ہوں۔"

ماں نے جیسا کہا تھا ویسا ہی ہو۔ یوشی فیوجی نے سنا تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ رفتہ رفتہ میرا وزن بڑھتا گیا۔ مجھے چلنے پھرنے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ اگرچہ میرے شوہر کو اپنی ذمے داریوں کے سلسلے میں گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا' لیکن اسے جو بھی لمحہ میسر آتا وہ میرے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا' پھر بھی میں بور ہونے لگی۔ ایسے وقت میں دادا کی دی ہوئی گیند نکال کر اس کے ساتھ کھیلنے لگ جاتی۔ میں اسے ہوا میں اچھال کر پکڑتی۔ جب کبھی یہ میری گرفت سے نکل جاتی تو میری خادمائیں دوڑ کر آتیں اور گیند اٹھا کر میرے حوالے کر دیتیں۔

بچے کی پیدائش بڑی آسانی سے ہو گئی' حالانکہ بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے ہی ماں نے اسے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دی' یوشی فیوجی دوڑتا ہوا سیدھا میرے پاس آیا۔

"میرا بیٹا! مجھے اسے دیکھنے دو۔" وہ خوشی سے پکار اٹھا۔ "تم کس قدر شاندار عورت ہو۔"

میں نے دایہ کو اشارہ کیا کہ بچہ میرے شوہر کو دکھائے۔ بچے کو دیکھتے ہی یوشی فیوجی نے کہا: "کتنا پیارا بچہ ہے۔ تم کس قدر غیر معمولی عورت ہو۔ اتنا صحت مند اور خوبصورت بچہ!"

میں خاموش رہی۔ میں تو یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ ایک گندے چیتھڑوں میں ملبوس آدمی کی پرچھائیں ہے جو تاریکی میں لومڑی کے بچے کی بند آنکھوں پر بوسہ دے رہا تھا۔

---------☆ ☆---------

عالم روباہ میں وقت بڑی انوکھی چیز تھا۔ برسوں بیت گئے---- ہمارے لئے بھی اور یوشی فیوجی کے لئے بھی۔ ہمارا بیٹا تیزی سے بڑا ہونے لگا حتیٰ کہ وہ کھلونا تیروں کے ساتھ پرندوں کا شکار کرنے اور ٹٹوؤں پر سواری کرنے لگا۔ ہم پر تو برسوں کا وقت بیت چکا تھا مگر اصل دنیا میں جہاں سے کہ یوشی فیوجی آیا تھا وہاں محض چند روز ہی گزر پائے تھے۔ میرے بھائی نے' جو ہمارے لئے کھانے کا انتظام کرتا تھا' مجھے بتایا کہ یوشی فیوجی کی دوسری بیوی میکے سے لوٹ آئی ہے۔

"اب وہ کیسی لگتی ہے؟" میں نے پوچھا اور اپنے بیٹے کی جانب دیکھا جو اپنے باپ کے نقش قدم پر رنگوں اور برش کی مدد سے تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بہت غمزدہ اور اداس ہے۔" بھائی نے جواب دیا۔ "تمہارا کیا اندازہ تھا؟"

میں نے اپنا سر نفی میں ہلایا' لیکن مجھے یاد آیا کہ میں تو پردے کے پیچھے تھی اور بھائی مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔ "میرا خیال تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ بھول جائے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بھائی نے کہا۔ "ہماری دنیا میں یوشی فیوجی کو آئے برسوں بیت چکے ہیں مگر اس دنیا سے باہر کی اصل دنیا میں اس کی گمشدگی کو فقط چند روز ہوئے ہیں۔"

میرے ہاتھ سے چھوٹی سی سفید گیند گر گئی اور فرش پر لڑھکتی چلی گئی: "یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے استعجابیہ



لہجے میں پوچھا۔

میرے بھائی نے آہ بھری اور بولا: "ہمشیرہ! تم کیوں باہر نہیں نکلتیں؟ کیا تم بیمار ہو؟ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے بچے کی پرورش کر رہی ہو' لیکن اب تو اس کا دودھ چھڑا دیا گیا ہے۔"

"جب میرا شوہر پاس ہو تو میں گھر میں رہنا پسند کرتی ہوں۔"

"ہمشیرہ! ہم کھیلا کرتے تھے۔ تم اور میں! یاد نہیں؟ ہم چاندنی راتوں میں جنگل میں چہلیں کرتے اور چوہے پکڑتے تھے۔ آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا' لیکن مجھے احساس تھا کہ میں جھوٹ بول رہی تھی۔ بہت کچھ ہو گیا تھا۔

"تو پھر آؤ اب میرے ساتھ باہر چلو۔" بھائی پردہ ہٹا کر اندر چلا آیا اور میرا بازو تھام لیا۔ میرے بیٹے نے [illegible] کی جانب دیکھا اور میں نے خادماؤں کو اشارہ کیا کہ [illegible] کمرے سے لے جائیں۔

"ٹھیک ہے۔" میں تیار ہو گئی۔ "ہم ایک بار پھر روباہ بنتے ہیں۔"

اس بار عورت سے دوبارہ لومڑی بننا بے حد اذیت ناک تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری اصلی چمڑی ادھڑ رہی ہو۔ جب میری حالت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے بھائی کی جانب دیکھا اور اسٹور روم کے فرش سے باہر نکل آئی۔

رات کا آغاز تھا۔ چاند تقریباً پورا تھا۔ مشرق میں ستارے چاند کی روشنی سے ماند ہو گئے تھے جبکہ دور مغرب میں ٹمٹما رہے تھے۔ ہم باغ میں چلے آئے۔ جب میں باغ میں بنی مصنوعی آب جو کے چھوٹے سے پل پر پہنچی تو میں چونک پڑی۔ نیچے پانی میں میرا عکس جھلملا رہا تھا۔

بھائی رک گیا اور میرے پاس آ کر پوچھا: "کیا بات ہے؟" اس کا انداز سرگوشی کا سا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا کہ کوئی بات نہیں۔ میں نے اسے یہ بات نہ بتائی کہ پانی میں میرا عکس عورت کا تھا۔

گھر سارا روشن تھا۔ برآمدوں میں مشعلیں لٹکا دی گئی تھیں جبکہ کمروں میں چراغ اور آتشدان روشن تھے حالانکہ یہ موسم گرما تھا اور رات تپ رہی تھی۔ بہت سے کمروں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ مکان کی روشنی میں' میں نے پروانوں کو دیکھا جو دیوانہ وار شعلوں میں جل رہے تھے۔

شمالی سمت کے کمروں میں' جہاں شکیبو کا کمرہ تھا' روشنی مدھم تھی۔ میں دبے قدموں برآمدے کے قریب کھسک آئی اور اندر جھانکنے لگی۔ شکیبو غم زدہ اور اداس بیٹھی تھی جب کہ ایک بھکشو سر جھکائے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔ گھر کے نمایاں کمرے روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ میرے شوہر کا دوسرا بیٹا بڑی عمر کے چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا گفتگو کر رہا تھا۔ بڑی عمر کے وہ آدمی سفری کپڑوں میں تھے۔ وہ شکیبو کے بھائی لگتے تھے۔ وہ درخت کا ایک تنا کاٹ کر لائے تھے جو آدمی کے قد جتنا تھا۔ سب اس تنے کے گرد جمع تھے۔ ان کے ساتھ ایک بھکشو بھی تھا۔ سبھی نے عجیب و غریب قسم کے لباس پہن رکھے تھے۔ شاید یہ ماتمی لباس تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس گھر میں کوئی مرگ تو نہیں ہوئی تھی' پھر ماتم کیسا؟ پھر مجھے خیال آیا شاید یہ لوگ میرے شوہر کا سوگ منا رہے ہیں۔ اس خیال پر مجھے ہنسی بھی آئی' لیکن پھر میرے سینے میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور میں آزردہ ہو گئی۔

لڑکے نے ایک چھینی اور ہتھوڑی کی مدد سے تنے کو کاٹنا شروع کر دیا۔

"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" میرے بھائی نے سرگوشی کی۔ "کیسے بے قرینہ لوگ ہیں یہ؟"

"پتہ نہیں کیا کر رہے ہیں لیکن مجھے بھی یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ! قریب آجاؤ۔ دیکھتے ہیں یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔" میرا بھائی پیٹ کے بل آگے رینگ گیا۔ میں نے اس کی پیروی کی۔ خاصی دیر تک لڑکا یہ عمل دہراتا رہا۔

لڑکے نے چھینی اور ہتھوڑی بالآخر شکیبو کے بھائی کو دے دی۔

"ختم؟" آدمی نے پوچھا۔

میں نے اور آگے ہو کر تنے کو غور سے دیکھا۔ اس پر کندہ کاری سے کوئی شبیہ بنائی گئی تھی' لیکن پتہ نہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چل رہا تھا کہ کس کی شبیہ ہے۔ بھکشو آگے بڑھا۔ اس کے دو معاونین نے آتشدان میں لوبان ڈالا' پھر بھی پیٹ کے بل لیٹ گئے اور آہستہ آہستہ بدبدانے لگے۔ بھکشو ان سے آگے لیٹ گیا اور اونچی آواز میں بھجن پڑھنے لگا۔

وہ گیارہ سروں والے دیوتا کنون سے مدد طلب کر رہا تھا۔ (اس بار میں نے اور آگے ہو کر غور کیا تو لکڑی کے تختے پر گیارہ سر' بازوؤں اور ٹانگوں والی شبیہ مجھے نظر آگئی۔) جب اس نے دیوتا کو پکارا تو میرے کندھوں کے بال کھڑے ہو گئے۔

"مجھے اس سب سے نفرت ہے۔" میں نے اپنے بھائی سے سرگوشی میں کہا' لیکن اس نے میری طرف رخ کر کے دوبارہ توجہ انہی کی طرف مبذول کر لی۔

بھکشو اپنے دیوتا سے بار بار ایک ہی التجا کر رہا تھا کہ یوشی فیوجی کی نعش کہاں ہے' اس کی وہاں تک رہنمائی کی جائے۔ اس کے چیلے آتشدان میں بار بار لوبان ڈال رہے تھے جس کا دھواں مرغولوں کی شکل میں فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ بھکشو کی التجائیں سن کر مجھے وحشت ہونے لگی' میرا دم گھٹنے لگا اور وہاں رکنا محال ہو گیا۔ میں بھاگ کر اسٹور روم کے فرش تلے آگئی۔ جلدی جلدی میں نے عورت کا روپ اختیار کیا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔

"یوشی! یوشی! کہاں ہو تم؟" میں محل کے کمروں میں دوڑتے ہوئے بے تحاشا چیخنے لگی۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ نوکر کیا سوچیں گے۔ میں شوہر کو آوازیں دیتی دیوانہ وار کمروں کے چکر لگانے لگی۔ اچانک ایک کمرے سے یوشی فیوجی گھبرائے ہوئے انداز میں باہر نکلا۔

"بیوی!" اس نے میری حالت دیکھ کر قدرے غصے سے کہا۔ "کیا بات ہے؟ کیوں اس طرح چیخ رہی ہو؟ میرے مہمان آئے ہوئے ہیں' ان تک بھی تمہاری چیخ پکار جا رہی ہے۔"

"یوشی!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے...... لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے...... وہ...... وہ......"

اس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور مجھے تھام لیا۔ "کیا بات ہے؟ بچے کو تو کچھ نہیں ہو گیا؟"

میں نے اپنی سانسیں استوار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "نہیں' بچے کو کچھ نہیں ہوا۔ میں کیا بتاؤں؟ وہ دھوئیں کا مرغولہ اور وہ تمہاری تلاش میں نکلا ہے۔ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ میں جاگ پڑی۔ میں بالکل تنہا تھی۔ مجھے بہت ڈر لگا۔"

"تم تنہا؟ تمہاری خادمائیں کہاں ہیں؟"

"وہ وہاں ہیں۔ میرا مطلب تھا......" میں نے خود کو اس کی باہوں میں گرا دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ وہ مجھے تسلیاں دینے لگا۔ اس نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا کہ مجھے سنبھالے۔ خادمہ نے آگے بڑھ کر مجھے دونوں شانوں سے تھام لیا تو یوشی فیوجی نے کہا: "گھبراؤ مت! میں مہمانوں کو رخصت کر کے ابھی آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے نڈھال ہو کر کہا۔ "جلدی آنا۔"

---

میں اپنے کمرے میں یوشی فیوجی کا انتظار کرتی رہی۔ میں اندھیرے میں بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ میں وہی سفید گیند تھی جو میرے دادا نے مجھے دی تھی۔ میں بے خیالی میں گیند ہوا میں اچھالتی اور پکڑ لیتی۔ مجھے رہ رہ کر دھوئیں کے اس مرغولے کا خیال ستا رہا تھا جو یقیناً میرے شوہر کی تلاش میں نکلا تھا۔ میرا بیٹا دوسرے کمرے میں سو رہا تھا لیکن ایک خادمہ اسے میرے پاس لے آئی۔ اسے دیکھ کر میری ڈھارس بندھی' میں نے اپنے آپ سے کہا: "میرا شوہر مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یہ بیٹا اس محبت کی شہادت ہے۔ کوئی بھکشو نہ اسے چھین سکتا ہے اور نہ میری محبت کو۔" میں انتظار کرتی رہی' لیکن یوشی فیوجی نہ آیا۔ اس کے بجائے گیارہ سروں والا دیوتا آگیا۔

وہ ایک بوڑھا بھکشو تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اس کا سر اگرچہ ایک ہی تھا' لیکن مجھے یقین تھا کہ یہی گیارہ سروں والا دیوتا ہے کیونکہ ہمارے محل کی ہر چیز جادو سے بنی ہوئی تھی سوائے اس بوڑھے کے۔ اس کے جسم سے لوبان کی بو آ رہی تھی۔ دیوتا کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ وہ محل کے چمن میں لگے درختوں کے درمیان سے محتاط انداز میں قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ جہاں جہاں سے وہ آگے بڑھ رہا تھا' اس کے عقب میں وہ چیزیں غائب ہو رہی تھیں جو ہم نے جادو سے بنا رکھی تھیں۔ درخت' پھول' آرائشی پودے' خوبصورت



روشیں سب غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاں جہاں اس کا قدم پڑتا' جادو کا اثر زائل ہوتا جاتا۔ وہ سیدھا ہمارے محل کے دروازے کی جانب آ رہا تھا۔

"نہیں!" میں چیخ اٹھی اور برآمدے کی جانب بھاگی۔ "رک جاؤ۔" میں پوری قوت سے چلائی۔ اس نے جیسے میری چیخ سنی ہی نہیں۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں اس کمرے کی جانب بھاگی جہاں میرا شوہر مہمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ "یوشی! بھاگو! جلدی کرو۔" میں حلق پھاڑ کر چیخی۔

"بیوی؟" یوشی فیوجی کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے عقب میں بنا برآمدہ کانپا اور فضا میں تحلیل ہو گیا۔ میں گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ بوڑھا بھکشو میرے قریب سے گزرا تو میں نے سختی کے ساتھ اس کے چغے کو پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی تلوار کی پیٹی میں پھنسا لیا' لیکن وہ رکا نہیں اور آگے بڑھتا گیا۔ میں اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" میرے شوہر نے گرج کر کہا۔ بوڑھا [illegible] اس کی طرف بڑھا تو یوشی فیوجی نے چند قدم پیچھے [illegible] کر اپنی تلوار نکال لی۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ میں نے دیکھا کہ یوشی فیوجی کی تلوار فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں اب چند تنکے تھے۔ میرے شوہر نے پریشانی سے اپنے ہاتھ کے تنکوں کو دیکھا اور جھنجلا کر زمین پر پھینک دیا۔ بوڑھے بھکشو نے اپنی چھڑی یوشی فیوجی کے پیٹ میں چبھوئی تو وہ الٹے قدموں اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

"چھوڑ دو اسے! خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں......" میری چیخیں نکل گئیں۔

میں منتیں اور التجائیں کرتی رہی' لیکن میری آہ و بکا اور فریادوں کا بوڑھے بھکشو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس کی پیٹی میں پھنسا ہوا تھا۔ چمڑے کی سخت پیٹی میرے نرم و نازک ہاتھ میں کھب گئی تھی۔ میرا ہاتھ لہولہان ہو رہا تھا۔ اگر میرے اردگرد کچھ بھی حقیقی نہ تھا' تو میرے ہاتھ سے بہتا ہوا گرم گرم خون ضرور حقیقی تھا۔ یوشی فیوجی میری حالت پر سخت مضطرب تھا اور میری مدد کے لیے آگے بڑھنے کی اس نے کوشش بھی کی' لیکن بھکشو اپنی چھڑی اس کے پیٹ میں چبھوئے اسے مسلسل پیچھے گھر کی جانب دھکیل رہا تھا۔

چمڑے کی پیٹی میرے خون سے لتھڑ گئی اور میرا ہاتھ پھسل گیا۔ میں پیچھے گر پڑی۔ بھکشو آگے بڑھ گیا۔ اس نے میرے شوہر کے پیٹ میں زور سے چھڑی چبھو کر اسے دھکیلا تو وہ میرے جادوئی محل سے باہر نکل گیا۔ اب وہ اپنے گھر کے کچن گارڈن میں کھڑا تھا۔ میں گھسٹتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی' لیکن مجھے علم تھا کہ اب بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ میں زمین پر پڑی تھی۔ میرے ہاتھ خون آلود تھے جبکہ لمبے سیاہ ریشمیں بال خاک آلود۔

یوشی فیوجی کے سامنے اس کا حقیقی گھر تھا اور حقیقی ماحول' شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ تیرہویں شام یوشی فیوجی پھر سے اپنے گھر میں کھڑا تھا جبکہ میرے ساتھ وہ تیرہ برس گزار کے گیا تھا۔ گھر کے سبھی ملازم اور دیگر لوگ باغ میں کھڑے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے یوشی فیوجی کے دو عکس لہرا رہے تھے جیسے پانی میں کوئی چیز جھلملائے اور غائب ہو جائے۔ ایک عکس میں وہ اپنے خوبصورت لباس میں تھا جو ذرا گرد آلود ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خالی نیام تھی۔ دوسرے عکس میں وہ میلے اور گندے کپڑوں میں تھا۔ اس کی گرد آلود شکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیچڑ سے لتھڑی ایک چھڑی سی تھی۔ یہ ایک ایسے آدمی کا عکس تھا جو لومڑیوں کے ساتھ مٹی میں رہا تھا۔

سب سے پہلے' لڑکے نے میرے شوہر کو دیکھا اور چیختا ہوا دوڑا: "ابو؟ کیا یہ آپ ہیں؟"

"بیٹا؟" میرے شوہر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی یادداشت واپس آ رہی ہے لیکن جادو کا اثر ابھی پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ "یہ تم ابھی تک اتنے ہی ہو! میرے بعد بڑے کیوں نہیں ہوئے؟"

لڑکے نے اپنے بازو یوشی فیوجی کی کمر کے گرد لپیٹ لیے: "اوہ ابو! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ آپ تو بوڑھے نظر آ رہے ہیں۔"

یوشی فیوجی نے لڑکے کو پیچھے دھکیل دیا: "میں صرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

تمہاری ماں کو اس کے میکے واپس بھیجنے آیا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ لوٹ آئی ہے۔ تمہاری ماں نے میکے جا کر مجھے کتنا مایوس کیا تھا' لیکن مجھے کوئی اور مل گیا ہے۔ کتنی شاندار خاتون ہے وہ! میں نے اس سے شادی کر لی اور میرا اس سے ایک بیٹا بھی ہے۔ وہ تم سے زیادہ خوبصورت اور صحت مند ہے۔ وہی میری جائیداد کا وارث ہے۔ میں اس کی ماں سے بھی بے حد محبت کرتا ہوں۔"

لڑکے نے پریشان ہو کر برآمدے کی جانب دیکھا۔ میری نظریں بھی ادھر اٹھ گئیں۔ وہاں شکیبو کھڑی تھی۔

"کہاں ہے تمہارا وہ بیٹا؟" لڑکے نے پوچھا۔

"کیوں؟ وہ وہاں ہے۔" میرے شوہر نے اسٹور روم کی جانب اشارہ کیا۔

سبھی اسٹور روم کی طرف دیکھنے لگے تو انہیں میں نظر آئی۔

"لومڑی!" ایک آدمی چیخا اور پھر سبھی چلانے لگے: "لومڑی' لومڑی!" کچھ لوگ ڈنڈے اٹھا کر میری طرف بھاگے۔

"یوشی فوجی! انہیں روکو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ یوشی فوجی جھجکا۔ وہ متذبذب تھا۔ "یوکی؟" اس نے متزلزل انداز سے کہا۔

"لومڑی!" لوگ چلائے۔

"خدا کے لیے میرے پاس آؤ۔" میں نے یوشی فوجی کے لیے اپنی باہیں پھیلائیں۔ وہ میری طرف بڑھا تو لڑکے نے خود کو اس کے بازوؤں میں گرا دیا۔ اس کا توازن بگڑ گیا۔

میں نے ایک بار پھر برآمدے کی جانب دیکھا تو وہاں مجھے شکیبو کھڑی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں جان گئی کہ یوشی فوجی کے علاوہ صرف اسے میں عورت کے روپ میں نظر آئی تھی۔

---

انہوں نے ہمارا سرگرم تعاقب کیا۔ نوکر چاکر سب ڈنڈے اٹھا کر بھاگے۔ اسٹور روم کے فرش تلے انہوں نے ڈنڈے گھسیڑے۔ ہمارا خاندان مختلف سمتوں میں



مچھلی کا شکاری پچھلے کئی گھنٹوں سے صبر و استقامت کے ساتھ دریا کے کنارے بیٹھا ہوا کسی مچھلی کے پھنسنے کا منتظر تھا کہ ایک دیہاتی لڑکا ادھر آ نکلا۔

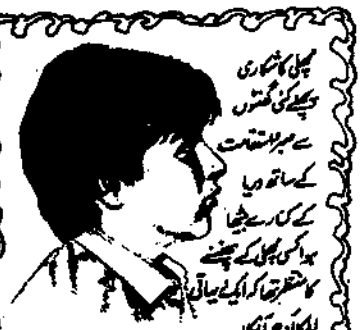

"سلام صاب۔" لڑکے نے کہا۔

"بش۔" شکاری نے منہ پر انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

"کوئی مچھلی پکڑی صاب؟" لڑکے نے پوچھا۔

"بھاگ جاؤ۔" شکاری نے آنکھیں نکالیں۔

"ناراض مت ہوں صاب۔" لڑکے نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ "میں تو صرف یہ بتلانے آیا ہوں کہ سڑک کے کنارے میرے ابا نے مچھلی کی دکان کھولی ہے۔ گھر جائیں تو بیگم صاب کے لیے مچھلیاں وہیں سے خریدیں۔ بازار سے کم داموں پر مل جائیں گی۔"

بھاگ اٹھا۔ میری ماں' میرا بھائی' دادا اور میرا بیٹا جو ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا۔ میں بھی روباہ کے روپ میں بھاگی۔ میں زخمی بھی تھی۔ جانے کب اور کہاں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ کتنے دن گزرے جب میں نے دوبارہ عورت کا روپ دھارا اور اپنے گھر لوٹ آئی...... وہی طلسمی گھر! یہ گھر اب خالی تھا۔ خادمائیں بھی نہ تھیں جو میرے لیے اچھے اچھے کھانے اور نفیس کپڑے لاتی تھیں۔ میں انتظار کرتی رہی' لیکن میرے گھر والے لوٹ کر نہ آئے۔ میرا دادا بوڑھا تھا' شاید وہ اس تعاقب کی تاب نہ لا سکا ہو۔ میری ماں' میرا بھائی اور میرا بیٹا' ان میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہ آیا۔ میں دعائیں کرتی کہ وہ اکٹھے ہوں' لیکن مجھے عجیب سے خدشات گھیرے رہتے۔

یوشی فوجی کئی روز تک روتا رہا۔ جب میں رات کو چھپ کر ان کے گھر کی سن گن لیتی تو مجھے اس کی سسکیاں سنائی دیتیں۔ میں اس کا نام لے کر آوازیں دیتی' اپنے بیٹے کا نام لیتی۔ گھر والوں نے کئی بار بھکشو بلائے جو آ کر منتر پڑھتے اور ان سے کہتے کہ جادو کی تاثیر بہت قوی ہے' آہستہ آہستہ زائل ہوگی۔

ماں' بھائی' دادا اور بیٹے کے بغیر مجھے اس گھر سے وحشت ہونے لگی۔ خادمائیں تو پہلے ہی تحلیل ہو گئے تھے۔ کمرے بھی ایک ایک کر کے تحلیل ہو رہے تھے۔ کبھی میں سوچتی کہ انسانی روپ ترک کر کے اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں' لیکن یہ اتنا بھی آسان نہ تھا۔ میں اب صرف ایک لومڑی نہیں تھی اور نہ ہی میں صرف ایک عورت تھی۔

موسم گرما اسی طرح گزر گیا۔ سردی کا زمانہ آ گیا۔ میں اب بھی یوشی فوجی اور اپنے گھر والوں کی منتظر تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ برف باری میں چاندنی رات کو یوشی فوجی چمن میں ضرور ٹہلا کرتا تھا۔ وہ چاندنی اور برف پر نظمیں لکھتا تھا۔ میں نے منصوبہ بنایا کہ اب کے چاندنی رات کی برف باری میں جب وہ چمن میں نکلے گا تو میں اپنی سفید گیند اس کے آگے لڑھکا دوں گی۔ اگر وہ اب بھی مجھے یاد کرتا ہوا تو وہ گیند کو دیکھ لے گا اور مجھے تلاش کر لے گا' پھر ہم اپنی مرضی سے انسان یا روباہ' کسی ایک روپ میں زندگی گزاریں گے۔ نہ کوئی جادو ہوگا اور نہ جھوٹی زندگی۔ اگر وہ شکیبو اور اپنے بیٹے کے ساتھ خوش ہوا تو وہ گیند کو بھی برف کا ایک ٹکڑا ہی سمجھے گا۔

آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور چاندنی رات آ گئی۔ برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی۔ ایسا دل فریب منظر تھا کہ میں مبہوت ہو گئی۔ میں بید مجنوں کے درخت تلے سفید گیند لیے کھڑی تھی۔ یوشی فوجی حسب عادت گھر سے نکلا اور چمن میں آ گیا۔ وہ ایک ٹک چاند کو دیکھ رہا تھا' پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے اپنی سانسیں روک لیں اور گیند اس کے آگے لڑھکا دی۔

پھر جانتے ہیں کیا ہوا؟

کچھ بھی نہ ہوا سوائے اس کے کہ میری آہ و زاری نے عرش بھی ہلا دیا' لیکن یوشی فوجی بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی دنیا میں واپس چلا گیا تھا۔ میرا جادو اسے روک سکا نہ میری محبت!

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : w... lkalmati.blogspot.com

وہ کوئی جانور تھا یا پھر جہنم کی مخلوق، وہ بند دروازے سے اندر کیسے آگیا؟ ایک خوفناک کہانی۔

# برفانی بھیڑیا

ڈیوڈ لیس

وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ رالف جب ہوٹل سے باہر نکلا تو اس نے اپنا تھیلا آرام دہ انداز میں کندھے سے لٹکایا۔ ابھرتے سورج کو دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کفایت شعاری کے خیال سے وہ ڈارٹ مور کے سفر پر پیدل ہی روانہ ہوا۔ وہ لیک کے علاقے اور شمالی ویلز کا سفر کر چکا تھا اور یہ اس کا تیسرا سفر تھا۔ رالف کو انگریزی طرزِ معاشرت پسند تھی اس لیے وہ سفر کے ایسے مراحل پسند کرتا تھا جہاں اسے گرم کھانا، آرام دہ بستر، عام خوراک اور آگ کے قریب بیٹھ کر بے تکلفانہ گفتگو کے مواقع میسر آسکیں۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ڈارٹ مور کا سفر بہت مشکل پڑتا ہے۔

اس نے مضبوط جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کے دستے میں الیکٹرک ٹارچ لگی تھی۔ اس کے پاس فوجی سروے کا ایک نقشہ بھی تھا۔ منزل اور راستہ نقشے پر بالکل واضح تھا۔ وہ سڑک سے مڑ کر ہیدر میں ہو لیا اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ نیچے دلدلی زمین میں بائیں جانب ایک تنگ ندی بل کھاتی جا رہی تھی اور ایک بلند ٹیلا جس پر چٹانیں ابھری ہوئی تھیں دائیں طرف فصیل کی صورت میں ایستادہ تھا۔

چلتے چلتے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا تو اسے ایک ہموار نشیبی چٹان سی نظر آئی۔ وہ سستانے کے لیے اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے چھڑی کی نوک سے جوتوں پر سے کیچڑ کھرچی۔ تھرمس کا ڈھکنا کھول کر پیالی میں تھوڑا سا قہوہ انڈیلا۔ وہ پینے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے ندی کے قریب سرکنڈوں کے اندر کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دی۔ اس نے پیالی نیچے رکھ دی اور شوقِ تجسس میں چٹان کے اوپر چڑھ گیا لیکن بلندی پر سے بھی وہ چیز صاف طور پر نظر نہ آسکی، تاہم اس پر ایک انسانی ہیولے کا گمان ہوتا تھا۔

وہ پھر نیچے اترا اور جلد جلد قہوہ حلق میں انڈیلا — پھر تھرمس تھیلے میں ڈالا اور آگے نگاہ دوڑائی اور کچھ سوچتے ہوئے احتیاط کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔

اس کے پاؤں نرم زمین میں دھنس رہے تھے۔ اب گھاس کی جگہ سرکنڈوں نے لے لی تھی۔ آخر اسے ایک کھوج نظر آیا۔

پاؤں کے نشان دور تک چلے گئے تھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ان کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھا اور پھر سرکنڈوں میں اسے چیتھڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دی۔ قریب ہی ایک انسانی پاؤں باہر نکلا ہوا تھا۔ رالف نے اسے غور سے دیکھا۔ اس میں جراب تو تھی، مگر جوتا نہ تھا۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد چھڑی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھا۔ جلد ہی وہ ایک جسم کے پاس پہنچ گیا جس کا ایک بازو باہر کی طرف پھیلا ہوا تھا اور دوسرا کپڑوں میں چھپا ہوا۔ چیتھڑوں پر خون کے دھبے تھے اور کوٹ کندھوں کی طرف اٹھا ہوا جس کی وجہ سے چہرہ چھپ گیا تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" رالف نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

کوئی جواب نہ آیا اور پُراسرار خاموشی دوبارہ مسلط ہو گئی۔

رالف نے گہرا سانس لیا۔ وہ کسی غیر متعلق معاملے میں الجھنا پسند نہ کرتا تھا —— لیکن اب اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے کوٹ پیچھے کھینچ کر درست کیا اور پھر یہ پُرسکون علاقہ اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ اس آدمی کا سر غائب تھا۔ رالف کو اس سے پہلے کبھی ایسی صورت پیش نہ آئی تھی۔

(۲)

جان ویدبائی کا معمول تھا کہ وہ ہفتے میں چند بار اپنے کلب "ویٹیرنز" میں کھانا کھاتا — وہ سالہا سال سے اس کا رکن چلا آ رہا تھا۔ ویٹیرنز میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت تغیر ہو چکا تھا۔ اب اس کی رکنیت میں کسی کارنامے کے بجائے سماجی حیثیت پر زیادہ زور دیا جاتا۔

ویدبائی نے کھانے کے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ ایک بھی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ اس کے پرانے دوستوں میں صرف بارٹن ہی ایک ایسا شخص تھا جس کے اندر مہم جوئی کے اثرات موجود تھے، مگر اب وہ لندن نہ آتا تھا۔

ویدبائی اس کا مداح تھا —————— اس سے آخری ملاقات کیے دس برس ہو گئے تھے۔

کسی مانوس چہرے کو نہ پا کر ویدبائی بار کی طرف چل دیا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ادھیڑ عمر نے شاید اس کی نگاہوں کو دھندلا دیا تھا اور اس کے اعصاب میں وہ پہلی سی لچک نہ رہنے دی تھی، لیکن لندن کی پُرآسائش زندگی نے اسے بہت زیادہ نقصان نہ پہنچایا تھا۔ وہ دبلا مگر سخت اور قد آور شخص تھا۔ اس کا وزن آج بھی اتنا ہی ہوگا جتنا اس وقت تھا جب اس نے آخری بار بارٹن کے ساتھ کینیڈا میں شکار کھیلا تھا۔ وہ بارٹن کے متعلق ہی دیر تک سوچتا رہا۔

معمر سا سپرنٹنڈنٹ جیسن ہوبل بار میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔

"آہا، جان!" ہوبل نے کہا۔

"کیسے مزاج ہیں جیسن؟"

"تھکا ماندہ ہوں۔"

"خاصی مدت سے نظر نہیں آئے۔"

"فرصت ہی نہیں ملتی۔ مجھے آپ کی پُرسکون زندگی پر رشک آتا ہے۔"

"آپ کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔" ویدبائی نے کہا۔

"درحقیقت آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔ میرا خیال تھا آپ یہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوں گے۔"

"بہت خوب! پارکنگ ٹکٹ کے لیے تو نہیں؟"

ایک خفیف سی قانونی لپک کے حوالے پر دونوں ہنس پڑے۔

ایک لمحے کے بعد بیل نے کہا "جان! مجھے آپ کا مشورہ درکار ہے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"ایک قتل کے بارے میں۔"

"یقیناً میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ یہ تو پُراسراری بات معلوم ہوتی ہے۔" دیدبانی نے کہا اور پائپ بھرنے لگا۔

"ہاں معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ نے اخبارات میں اس کے متعلق پڑھا ہوگا۔ ڈارٹ مور میں سر بریدہ لاش' اخبارات نے کچھ ایسی ہی سرخی جمائی تھی۔"

"ہاں میں نے کچھ پڑھا تو ہے مگر یہ تو آپ کے حلقے سے باہر ہے۔"

"ہاں لیکن واقعہ کچھ ایسا عجیب ہے کہ اس نے وہاں کے چیف کانسٹیبل کو پریشان کر دیا ہے اور اس نے ہم سے مدد طلب کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی حیران ہوں۔ کمشنر نے تفتیش میرے اور مقرلو کے سپرد کر دی ہے۔ میں ابھی ابھی وہاں سے آرہا ہوں۔ آپ سے ملنے کے لیے۔"

دیدبانی نے پائپ بھر لیا تھا اور اب کش لے رہا تھا۔ عمدہ تمباکو کی طرح اس کی بُو تو خوشگوار، مگر ذائقہ خوشگوار تھا۔

"تو پھر؟" دیدبانی نے پوچھا۔

"ایک واضح امکان یہ بھی ہے کہ قتل کسی جانور نے کیا ہے۔ میرے خیال میں آپ ہمیں بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔" دیدبانی نے براونڈی کی چُسکی لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کے خیال میں یہ کس قسم کا جانور ہو سکتا ہے؟"

"میں جانوروں کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور مقرلو مجھ سے بھی کم واقفیت رکھتا ہے۔ میری بیوی نے ایک بلی پال رکھی جو بھاگ گئی یا میرے باغ میں ایک چھچھوندر ہے۔ بس یہی کچھ میرا مبلغ علم ہے۔"

دیدبانی مسکرا دیا۔

"میرا خیال تھا آپ لاش اور زمین پر نشانات دیکھ کر کچھ بتا سکیں گے۔"

"کیا کھوج واضح ہے؟"

"بہت زیادہ نہیں۔"

"میرا خیال ہے وہ کوئی گوشت خور جانور ہوگا۔"

"مجھے معلوم نہیں۔ جسم کا گوشت کھایا نہیں گیا۔ بلکہ پھاڑا گیا ہے۔ یہ کوئی وحشی جانور ہوگا۔ پولیس سرجن کا اصرار تھا کہ کہتا ہے کہ یہ کام کوئی وحشی جانور ہی کر سکتا ہے۔ ہم اس کی بات پر یقین کر لیتے اگر ایک اور عجیب بات نہ ہوتی جس پر اخبار والوں نے بھی زور دیا ہے۔ یعنی سربریدگی کی واردات۔ اور ہمیں سر کہیں سے نہ ملا۔" اس نے مزید کہا۔

دیدبانی چند لمحے غور کرتا رہا۔

"اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ جانور، اگر واقعی جانور ہی ہے اتنا طاقتور ہوگا جو سر کو جسم سے الگ کر سکے۔" بیل نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"انگلینڈ میں؟ اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ممکن ہے یہ جنگلی کتوں کا غول ہو، مگر ایسا ہونا نہیں چاہیے۔"

"سر کھینچ کر جدا نہیں کیا گیا۔ بڑی صفائی سے کاٹا گیا ہے۔"

دیدبانی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"پھر تو کوئی ایسا طاقتور جانور ہونا چاہیے جو گھوڑے کو نیچے دبا کر ایک ہی جھٹکے میں تن سے الگ کر سکے اور ساتھ ہی جسم کو بھی تھامے رکھے۔"

"سر ایسی صفائی سے کاٹا گیا ہے کہ جیسے کسی چاقو یا چھری سے کاٹا گیا ہو۔" بیل نے کہا اور لاش کا خیال آتے ہی اس کے چہرے پر سیاہی سی پھیل گئی۔

"کونسا جانور ایسا کر سکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ شاید کھوج دیکھ کر کچھ معلوم ہو سکے۔ مثال کے طور پر ایک بھینسا ہے جو سینگوں کی ایک ہی ضرب سے کسی آدمی کا سر الگ کر سکتا ہے لیکن جسم پر پنجوں کے نشان ہیں۔ شاید کوئی جنونی آدمی ہو جس کے پاس کوئی ایسا ہتھیار ہے جو پنجوں کے مشابہ زخم لگا سکتا ہے۔"

"نہیں، پنجوں کے نشان واضح ہیں اور دانتوں کے نشان بھی۔ کوئی آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔"

"بہر حال مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔" دیدبانی نے کہا۔

"کیا آپ میرے ساتھ ڈارٹ مور تک چل سکتے ہیں؟ زمین نرم ہونے کی وجہ سے کھوج محفوظ ہے۔ آپ کے اخراجات ادا کر دیے جائیں گے۔"

بیل نے ایک نقشہ کھول کر میز پر پھیلا دیا اور ایک دائرے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہاں اس ندی کے قریب لاش ملی ہے۔"

دیدبانی نے سر ہلایا اور ذہن میں چٹانوں کا نقشہ جمانے لگا۔ اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ حیران سا نظر آرہا تھا۔ اس نے پائپ منہ سے نکالا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"کیا آپ بارٹن سے واقف ہیں؟"



"جی ہاں۔"

"آپ اس سے مشورہ کر سکتے تھے۔ کیا وہ اس علاقے میں موجود نہیں؟"

"میں بارٹن کے پاس گیا تھا، مگر اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ ہمیشہ عجیب رہا ہے۔ اس واقعے سے خوب محظوظ ہوا اور کچھ ایسی باتیں کیں جن کا مطلب تھا کہ لوگوں کو قتل کر کے آبادی میں توازن پیدا کیا جا سکتا ہے اور دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔ لیکن اُسے اس واقعے میں دلچسپی لینا چاہیے تھی۔"

"اس نے چیر پھاڑ میں کچھ دلچسپی ظاہر کی۔ ان پر ایک نظر بھی ڈالی اور میرا خیال ہے اسے کچھ اندازہ بھی ہو گیا تھا لیکن اس نے کوئی رائے نہ ظاہر کی، البتہ آپ سے ملنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا آپ اس معاملے میں ضرور دلچسپی لیں گے کیونکہ یہ ایک انسانی معاملہ ہے۔"

دیدبانی نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا آپ نے چڑیا گھروں سے تحقیق کر لی ہے؟"

پھر وہ ہنسنے لگے اور دیدبانی نے مزید شراب منگوالی۔

"یقیناً بارٹن جیسا آدمی یہ موقع نظر انداز نہیں کر سکتا۔" دیدبانی نے کہا۔ "اگرچہ اس کو زندگی اور انسان کی کوئی پروا نہیں، بلکہ وہ موت میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے، تاہم میں جانتا ہوں اگر کوئی خطرناک جانور ہوتا، تو وہ لازماً بندوق لے کر باہر نکل آتا۔ جانور جتنا خطرناک ہوگا اتنی ہی جلد وہ اس کے مقابلے میں آئے گا۔ دو ہی باتیں ہیں! یا تو اس کے خیال میں یہ کوئی جانور نہیں یا پھر وہ حکومت کی مدد کرنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔"

"جان! آپ میرے ساتھ چلیں گے؟"

"آپ مجھے یہاں لا سکتے تھے۔"

"ہاں میں نے اس پر غور کیا تھا۔ لیکن آپ کو ساتھ لے جانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

دیدبانی نے سوچا اس طرح بارٹن سے بھی ملاقات ہو جائے گی جس نے اور بارٹن نے کئی بار خطروں کا اکٹھے مقابلہ کیا تھا۔

بیل نے نقشہ تہہ کر کے جیب میں ٹھونس لیا اور اس کا شوٹ ایک جانب اکٹھا ہو گیا۔ دیدبانی مسکرانے لگا۔ وہ کونے کی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے آخری دور ختم کیا اور پھر وہ صبح سویرے ڈارٹ مور جانے کے منصوبے بنانے لگے۔ بیل نے اس قتل کی تمام تفصیلات بیان کر ڈالیں جن کا خلاصہ یہ تھا: "جس آدمی [illegible] کی یقیناً اس کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لاش پہچان لی گئی تھی۔ یہ ایک بُڈھا آوارہ گرد رینڈل تھا جو اس علاقے میں راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اسے کئی بار ناجائز طور پر شکار کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اسی مقصد کے لیے نکلا تھا کہ موت کے پنجے میں آ گیا۔ کھوج سے ظاہر ہوتا ہے کہ رینڈل اوپر پہاڑی پر پھر رہا تھا۔ اس نے اپنے قاتل کو دیکھا، تو ندی کی طرف بھاگا۔ وہ پانی کے قریب پہنچ چکا تھا کہ قاتل نے آلیا۔ وہ اسی جگہ مرا جہاں سے اس کی لاش ملی ہے۔ ایسا کوئی نشان نہیں ملتا کہ وہ دوڑتے وقت زخمی ہوا تھا۔ اگر کوئی چیز اُسے پریشان کرتا، تو ایسا ضرور ہوتا۔ اس کے قاتل نے اُسے پکڑتے ہی مار ڈالا۔ کشمکش کے کچھ نشان موجود ہیں۔ رینڈل نے چند لڑھکنیاں کھائیں۔ اس کی انگلیوں کے ناخن ٹوٹ گئے۔ کپڑے تار تار ہو گئے۔ اس کی جیب سے چار شلنگ اور نصف اونس تمباکو برآمد ہوا ہے۔ رینڈل ایک نہایت دلچسپ مقامی کردار تھا۔" بیل سر جھٹک کر خاموش ہو گیا۔

(۳)

"لعنت ہے مجھ پر، میں بھی احمق ہی ہوں۔" براؤن ہیمنڈ نے اپنے آپ سے کہا اور آگے جھک گیا۔ اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ ویل تھامے ہوئے تھے۔ بارش سے دھندلائے ہوئے شیشے میں سے اس نے باہر جھانکا۔ سڑک مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔ روشنی کی زرد کرنیں درختوں کو چھو رہی تھیں۔ ڈیش لائٹ کی سبز روشنی میں ہیمنڈ کا تاریک چہرہ چمک اٹھا۔ وہ ناراض بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ تھا تو سیلزمین، لیکن ایک بحری سوداگر نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ مہم جو لوگوں کا سا تھا۔ وہ جم کر نشست پر بیٹھا تھا اور دانتوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ جب وہ گاؤں کے پُرپیچ اور تاریک کوچے میں سے گزرا، تو حیران ہوا کہ اس موڑ سے کیسے سلامت گزر گیا۔ ان سڑکوں پر راستے کے نشان بھی نہ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا میں ٹیکس ادا کرتا ہوں، مگر میری راہنمائی کے لیے راستے پر نشان تک نہیں لگائے گئے۔ اچانک اس کی نگاہیں ایندھن کے پیمانے کی طرف اٹھ گئیں۔ سوئی اختتام کے نشان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اس ویران علاقے پر لعنت۔"

اس نے سوچا مقامی لوگ محو خواب ہیں۔ ایسا کوئی نہیں جس سے راستہ معلوم کیا جا سکے۔ کوئی مکان بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک میل سے زیادہ اس پٹرول میں نہیں جایا جا سکتا۔ یہ واہیات کار پٹرول بہت زیادہ خرچ کرتی ہے۔ مجھے کوئی چھوٹی کار لینی چاہیے، لیکن چھوٹی کار میں سامان رکھنے کی جگہ نہ ہوگی۔ میں ایک ہی چیز تمام دن کیسے فروخت کر سکتا ہوں، وہ ملک تک بھوں چڑھاتا ہے۔ لعنت بھیجو اس پر بھی۔ وہ مجھ سے کیسے توقع کرتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہے کہ اس واہیات علاقے میں الیکٹرانک آلات فروخت کروں؟ یہاں بھیڑوں کے سوا اور ہے کیا؟ ان گنواروں نے بجلی کے متعلق کبھی سُنا بھی نہ ہوگا۔"

وہ ایک موڑ اور مُڑا۔ اس کے سامنے ایک ویران اور تاریک گلی تھی۔ "وہ حرامی ایڈ ڈیوس ابھی لندن میں کام کر رہا ہے۔ اس کی آج بڑی بِکری ہوئی ہوگی اور اب وہ ویسٹ اینڈ میں عیش کر رہا ہوگا۔ خوش قسمت حرامی، غالباً شیمپئن پی رہا ہوگا، مگر لعنت بھیجو اس پر۔ اُسے اپنی مرضی کا علاقہ کیسے مل گیا؟ شاید اس وجہ سے کہ اس کا کمپنی سے دیرینہ تعلق ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں۔" کار سڑک کے اُبھرے ہوئے کناروں سے ٹکرائی اور ہیمنڈ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اگر دُنیا میں انصاف ہوتا، تو وہ اس وقت اپنے گھر میں آگ کے قریب بیٹھا ٹیلی ویژن دیکھ رہا ہوتا۔ اس کی بیوی عمدہ چائے بنا کر دیتی۔"

ہیمنڈ نے اپنا سر جھٹکا اور سیاہ رات میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ وائپر بیکار حرکت کر رہے تھے، کار جھوم رہی تھی اور ٹائر چرچرا رہے تھے۔ سگار کا دُھواں بوجھل ہوا میں اٹکا ہُوا تھا۔ اب اُسے کار آہستہ چلانی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ طویل مدت سے کار چلا رہا ہے۔ پھر موٹر نے ایک ہچکی لی، پٹرول کا آخری گھونٹ بھی ہڑپ کیا اور خاموشی سے رُک گئی۔

ہیمنڈ اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھا بڑبڑا رہا تھا ــــ اُسے یہی اندازہ نہ تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس تاریکی میں پیدل چلنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ بارش تیز تھی۔ ہیمنڈ نے آہ بھری اور کار میں رات گزارنے پر تیار ہو گیا۔ بیٹری پُرانی تھی اس لیے اُس نے روشنی گُل کر دی، مگر تنگ و تاریک سڑک پر روشنی کے بغیر رہنا خطرناک تھا کیونکہ کوئی اور کار بھی آ سکتی تھی۔ اس نے گلوو بکس میں سے فلاشر نکالا، اپنا کالر اُونچا اُٹھا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ بارش نے اُسے دبا لیا، تاہم وہ چند قدم پیچھے گیا اور سڑک پر فلاشر رکھ کر بٹن دبا دیا۔ سُرخ روشنی جھلملانے لگی۔ ماحول بڑا غیر حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا رہا اور درختوں کو سُرخ و سیاہ ہوتے دیکھنے لگا۔ اس کا سگار بُجھ گیا تھا۔ وہ درختوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُسے کوئی شے آتی دکھائی دی۔ وہ حیرت سے تکتا رہا اور پھر اُس کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سگار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اُس نے چیخنے کے لیے مُنہ کھولا، مگر آواز حلق میں گھُٹ گئی۔ ہیمنڈ ایک دم پلٹ کر بھاگا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا وہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ اپنی کار کے پاس سے گزر گیا۔ خوف کے مارے وہ گُنگ اور بہرہ ہو گیا تھا۔ پچاس گز دوڑا ہو گا کہ وہ گرفت میں آ گیا۔

(۴)

ویدربائی آگ کے پاس بیٹھا نیل کے بیان پر غور و خوض کر رہا تھا۔ یہ بڑا ہی آرام دہ کمرہ تھا۔ اس میں دادا جان کا کلاک باقاعدگی سے ٹِک ٹِک کر رہا تھا اور اس کا لنگر قوس بناتا ہُوا روشنی منعکس کر رہا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ خوبصورت جلد کی کتابیں رکھی تھیں۔ قالین بہت نرم اور دبیز تھا۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے تھے۔ ویدربائی اپنے خیالات میں گم، کمرے کے ماحول سے لاتعلق، بارٹن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس نے متعدد بار بارٹن کے ساتھ شکار کھیلا تھا۔ ہندوستان، افریقہ اور آخری بار کینیڈا کے جنگلوں میں۔ کینیڈا کی مُہم اُسے پُوری طرح یاد تھی۔ بارٹن اکیلے ایک ریچھ مارنا چاہتا تھا۔ اُس کے پاس شاندار بندوقیں تھیں، مگر اُس نے ۳۰۳ کی بندوق گائیڈ سے مستعار لی۔ یہ ایک اچھی بندوق تھی لیکن اس کام کے لیے بہت ہلکی اور اُس نے اس بندوق سے کبھی فائر بھی نہ کیا تھا۔ ویدربائی نے احتجاج کیا، مگر بارٹن ان لوگوں میں سے نہیں جو عقل کی بات پر دھیان دیتے ہیں۔ دُور ایک پہاڑی پر ویدربائی انتظار کر رہا تھا۔ سبز جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ خزاں کا موسم، مگر جنگل میں رنگ و بُو کا طوفان آیا ہُوا۔ درخت سُرخ پھُولوں کی کثرت سے آتش بداماں نظر آتے۔ زمین گزشتہ رات کی برفباری کے باعث بھُربھُری ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بارٹن لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس سمت جا رہا ہے جہاں ریچھ کی موجودگی کا قوی امکان تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہوتا جاتا تھا۔ بارٹن کی شکل دھُندلی سی نظر آنے لگی، اُس کا سُرخ کوٹ سبز پتّوں میں سے جھلک رہا تھا۔ وہ معقول فاصلے سے آگے نکل گیا تھا اور یہاں سے ویدربائی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ بارٹن کا انحصار اب مطلقاً اپنے آپ پر تھا۔ بارٹن گھنے جنگل میں پہنچا، تو ریچھ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے فاصلے سے ریچھ کا قد و قامت دیکھ کر ویدربائی بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے بارٹن کو بندوق اُٹھاتے دیکھا۔ چودہ سو پاؤنڈ کے غضبناک وحشی کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا آدمی چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ جب ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہُوا، تو اُس کا سر بارٹن کے سر سے تین فٹ بلند نظر آیا اور پھر ریچھ کا توازن بگڑ گیا اور وہ بل کھانے لگا۔ خاصی دیر بعد ویدربائی کے کانوں میں بندوق چلنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ بارٹن نے پلٹ کر بندوق اُٹھائی اور ویدربائی کو آگے آنے کا اشارہ کیا اور ویدربائی آگے چل پڑا۔

بارٹن ریچھ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے صرف ایک فائر کیا تھا۔ ریچھ نے گرجنے کے لیے منہ کھولا، تو گولی اس کے تالو میں سے ہو کر دماغ میں پہنچ گئی۔ شکار پر اور کہیں گولی کا نشان نہ تھا۔



"عمدہ نشانہ!" ویدربائی نے کہا۔

"اتنے فاصلے سے میرا نشانہ غلط نہ ہو سکتا تھا؛

۳۰۳ کی بندوق بھی ریچھ کو ہلاک کر سکتی ہے بشرطیکہ گولی صحیح مقام پر لگے۔"

بارٹن بہت جوش میں تھا: "بھاری ہتھیار کیوں استعمال کروں جبکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں؟ ایسا کرنے سے آدمی سُست ہو جاتا ہے۔"

"تم پاگل ہو!" ویدربائی نے کہا۔ بارٹن نے مجنونانہ مسرت سے ایک قہقہہ لگایا۔

بعد میں کیمپ کی آگ کے قریب بیٹھے ہوئے بارٹن کا انداز کسی قدر فلسفیانہ ہو گیا۔ اس کی وقتی مسرت ختم ہو چکی تھی۔ وہ تنہا تھے۔ گائیڈ شکار کے مقام پر ریچھ کی کھال اُتار رہا تھا۔ ویدربائی ابھی تک بارٹن کے اس خطرناک اقدام پر پریشان تھا۔ ایک ایسا اقدام جو پاگل پن کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

"جان! کیا تم رُک نہیں سکتے؟" اس نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔ میں اس جذبے کو بھی دیکھتا ہوں اور اس کمال کو بھی، تاہم یہ خودکشی کے مترادف ہے۔ بارٹن! کسی دن۔۔۔؟"

بارٹن نے اشارے سے اُسے خاموش کر دیا۔ آگ کی روشنی میں اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"جان! ہم صرف خطرات ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں، خطرات قبول کر کے ہی ہماری زندگیاں اپنی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتی ہیں۔ تہذیب کی پروردہ شہری زندگی کے مقابلے میں ہماری زندگی کتنی بھرپور ہے؛ وہاں زندگی نہیں، کوئی خطرہ نہیں، اور کوئی مسرت نہیں۔ وہاں خطرے کی کوئی بات ہی نہیں۔ جان! ہم جس طرح جان لیتے ہیں، اسی طرح زندگی دیتے بھی ہیں۔ وہ ریچھ کبھی اتنا زندہ نہیں تھا جتنا زندہ وہ اس وقت تھا جب گولی اس کے دماغ میں داخل ہوئی۔ اگر ہم شکاری لوگ زیادہ زندہ اور بھرپور ہوں، تو اس کا اثر ہمارے شکار پر بھی ہوگا۔ جان! میں جنہیں ہلاک کرتا ہوں، ان سے محبت کرتا ہوں۔ وہی شکار مجھے ہلاک کر دیتے اگر میں سُست ہوتا یا میرا مشاہدہ ناقص ہوتا یا میرا نشانہ غلط ہو جاتا۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ تم جانتے ہی ہو جنگلی مخلوقات کے ساتھ میرا رُوحانی تعلق ہے۔ میں ان کے خیالات و احساسات کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ ایسا کوئی جانور نہیں جس پر قابو نہ پا سکوں۔ ایسی کوئی حیوانی سطح نہیں جس پر ان سے نہ مل سکوں۔

"میں انہیں مارنا پسند کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں اسی طرح مارا جانا بھی پسند کرتا ہوں۔ اسی خاص انداز میں۔۔۔"

یہ آخری موقع تھا جب انہوں نے اکٹھے شکار کیا۔

ویدربائی ان الفاظ کو یاد کرتے ہوئے بے نام سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ بارٹن اس کو اکثر ایسے ہی مبہم انداز میں بے چین کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح کی بے چینی اُسے اس وقت محسوس ہوتی جب کسی جانور کا اندازہ لگانا ہوتا اور یہ فیصلہ نہ کر پاتا کہ اس پر وار کرے یا بھاگ جائے۔

بارٹن میں بہت سی حیوانی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ ویدربائی اُس سے دوبارہ ملاقات کی توقع کر رہا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا رات ڈھل گئی ہے اور اُسے صبح جلد اُٹھنا ہے۔

وہ الارم کے خلاف تھا۔ وہ اپنے ذہن کو مقررہ وقت پر اُٹھنے کا حکم دے دیتا تھا، مگر اس صلاحیت سے کام لیے اُسے خاصی مدت گزر چکی تھی اس لیے یقین نہ تھا کہ اب بھی اس میں یہ صلاحیت پُوری طرح موجود ہے۔ سونے کا فیصلہ کر کے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ گھنٹے پر نظر ڈالتے ہی اس کی تیوری چڑھ گئی۔ یہ ملنے کا کون سا وقت ہے؛ غیر متوقع ملاقات تو اُسے کسی وقت بھی پسند نہ تھی۔ اس نے ناگواری سے کندھے اُچکائے اور ہال میں سے ہوتا ہُوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دہلیز پر نیل حیران پریشان کھڑا تھا۔

"بے وقت تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہُوں۔"

"کوئی بات نہیں، تشریف لائیے!"

نیل اپنے دونوں ہاتھوں میں ہیٹ تھامے اندر داخل ہُوا ـــ وہ بے یقینی کا شکار تھا اور اپنے خیالات میں گم۔

"کیا آپ کوئی بات بتانی بھول گئے تھے؟"

نیل نے سر ہلایا۔

"مطالعہ گاہ میں چلیے۔ وہاں آگ روشن ہے۔ کیا آپ کچھ پئیں گے؟"

"میرے پاس وقت نہیں، جان! مجھے فوراً ڈارٹ مور جانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی ساتھ چلیں۔"

"آج رات؟" ویدربائی نے حیران ہو کر پوچھا۔ اس کو یہ تجویز پسند نہ آئی تھی۔

"کیا صبح تک انتظار نہیں کیا جا سکتا؟"

"میں چاہتا ہوں آپ تازہ کھوج پر ایک نظر ڈال لیں۔ ایک قتل اور ہو گیا ہے۔"



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



پولیس کا ڈرائیور بڑا ہی ماہر تھا۔ کار تیزی سے چل رہی تھی۔ سڑک بالکل سنسان۔ ویدبانی اور بیل پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ ویدبانی اپنی شکاری بندوق ساتھ لایا تھا اور پُرانی شکاری جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ بیل تھکا ماندہ نظر آ رہا تھا اور متواتر سگریٹ پھونکے چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک سیاہ رات تھی۔ لندن کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سالسبری کے میدانوں میں اس طوفان کی طرف رواں دواں تھے جو مغربی علاقے کی طرف سر اُٹھا رہا تھا۔ سڑک کی پھسلن ڈرائیور کے لیے دشواری کی بات نہ تھی۔ ابھی سپیدۂ سحر نمودار ہی ہُوا تھا کہ وہ بیچ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں جا کھڑے ہوئے۔

ڈرائیور نے ایک نقشہ دیکھا اور کار کو پارکنگ لاٹ سے نکال کر شمال کو جانے والی ایک چھوٹی سی سڑک پر موڑ دیا۔ اب اُسے آہستہ چلنا پڑا۔ اب وہ جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ ایک گوشے سے خیرہ کُن تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ تمام علاقہ پولیس سے بھرا ہُوا تھا۔ پولیس کی چند گاڑیاں سڑک کے ایک کنارے کھڑی نظر آئیں۔ سراغرساں مترلو نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ ہاتھ میں ٹارچ۔ اس کے جُوتے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔

"میں نے لاش وہیں پڑی رہنے دی۔" اُس نے کہا۔

"شناخت؟" بیل نے پوچھا۔

وہ کار سے نیچے اُتر آیا۔ ویدبانی دوسرے دروازے سے نکلا۔

"ہاں، ڈرائیونگ لائسنس اور کریڈٹ کارڈ کھوکھ سے ملے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے مقتول کا نام ہیمنڈ ہے۔ وہ لندن کا ایک سیلز مین تھا۔ قاتل ان درختوں میں سے آیا اور ہیمنڈ کم و بیش پچاس گز بھاگا، مگر پکڑا گیا۔" مترلو نے کہا۔ بیل نے دُور تک سڑک پر نظر ڈالی۔

"وہ ڈبل کار کے پاس سے گزرا؟" مترلو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تمہارے خیال میں اس نے کار میں داخل ہونے اور دروازہ مقفل کرنے کی کوشش کی؟" بیل نے پوچھا۔ لیکن یُوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی اور سے نہیں، اپنے آپ سے سوال کر رہا ہے۔

مترلو نے کہا: "تمام دروازوں میں تالے لگے ہیں، مگر میرا خیال ہے اس کے پاس دروازہ کھولنے کا وقت نہ تھا۔ اُسے خوف کی وجہ سے خیال کیا ہی نہیں۔"

ویدبانی گھوم کر پولیس کار کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ بندوق سنبھالے ہوئے تھا۔ مترلو نے نگاہ اُٹھائی اور بیل نے ان کا تعارف کرایا۔ انہوں نے ہاتھ ملائے۔ مترلو کی ہتھیلی بھیگی ہوئی تھی۔

"اور کوئی بات؟" بیل نے پوچھا۔

"وہی بات۔ نشانوں کی کثرت۔ اسی طرح کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل وہی سانحہ جو رینڈل کو پیش آیا تھا۔"

"لاش کس نے دریافت کی؟"

"ایک ادھیڑ شخص نے جو اپنی لڑکی کے ہاں سے سائیکل پر گھر جا رہا تھا۔ اس وقوعہ کے چند ہی منٹ بعد وہاں سے گزرا ہوگا، کیونکہ میں جب یہاں پہنچا تو مقتول کا جسم ابھی گرم تھا۔"

"آئیے ہم لاش پر ایک نظر ڈالیں۔"

وہ ہیمنڈ کی کار کے پاس سے گزرے۔ ویدبانی ابھی تک رائفل تھامے ہوئے تھا۔ لاش ربڑ کی چادر سے ڈھانپ دی گئی تھی۔ چادر کے کناروں سے خون رِس رِس کر سڑک پر گر رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل جس کا چہرہ بہت سفید تھا پاس چوکنا کھڑا تھا۔

"چادر اُتار دو۔" بیل نے کہا۔

کانسٹیبل نے چادر کھینچ لی۔ ویدبانی جھجک کر پیچھے ہٹا۔ لاش کا بُری طرح مُثلہ کیا گیا تھا۔ پیٹ پھٹا ہُوا اور آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ویدبانی نے اس طرح کی لاش پہلے بھی دیکھی تھی۔ اس کا پہلا اندازہ یہی تھا کہ یہ چیتے کی کارستانی ہے۔ نوجوان کانسٹیبل تیزی سے اُٹھا اور سڑک کے کنارے کی طرف چل پڑا۔

"کیا تمہیں نمبر ملا؟" بیل نے پوچھا۔

"نہیں نمبر غائب ہے۔" مترلو نے کہا۔

ویدبانی نے سوچا چیتا ایسا نہیں کر سکتا۔

"ہاں، تو جان! کیا خیال ہے؟" بیل نے پوچھا۔

ویدبانی گھٹنوں کے بل گیلی زمین پر جھکا ہُوا غور سے کھوج دیکھ رہا تھا۔ دُور درختوں میں ایک سراغرساں نقشہ بنانے میں مصروف تھا۔ دوسرا تصویر اُتار رہا تھا۔ ان کے پیچھے ایک جماعت کار کے اندر اور باہر انگلیوں کے نشان محفوظ کر رہی تھی اور مختلف فاصلوں کی پیمائش ہو رہی تھی۔ . .

ویدبانی نے اُوپر نظر اُٹھائی، تو اُس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ اچانک فوٹوگرافر کے کیمرے میں بیل کا چہرہ منعکس ہوا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کچھ خیال نہیں کہ میں نے ایسے نشان پہلے بھی دیکھے ہوں۔ اس جگہ نشان ایک بہت بڑے تسمے کے سے ہیں۔ دیکھیے پنجوں کے نشان کتنے گہرے ہیں، لیکن پیچھے نشان مختلف ہیں۔"

"مختلف؟" بیل نے تیزی سے پوچھا۔



ویدبانی نے سر ہلایا۔

"آپ کا خیال ہے جانور دو تھے۔ دو مختلف جانور؟"

"شاید! یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ جانور دوڑتا ہے تو اس کے نشان تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آپ چال دیکھ سکتے ہیں۔"

بیل نے سر ہلایا۔ ویدبانی گھٹنے سہلاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"وہ اس مقام تک چلتا ہُوا آیا۔" ویدبانی نے کہا۔ اس نے پیچھے سڑک پر نظر ڈالی۔

"وہ یہاں تک چل کر آیا —— پھر وہ اپنے شکار کے تعاقب میں دوڑنے لگا اور یہیں سے نشان تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن جب وہ چلتا ہے، تو دو پاؤں پر چلتا ہے۔"

کچھ وقت کے لیے وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

"کیا آپ کھوج لگا سکتے ہیں؟" بیل نے پوچھا۔

"شاید۔ شاید مجھے دن کی روشنی کی ضرورت ہے۔"

"ہم واپس بیچ ہوٹل جا کر صبح ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں۔"

"اگر ہمیں صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ ہم جس کی تلاش کر رہے ہیں وہ آدمی ہے یا جانور . . ."

"کوئی ایسی چیز جو دو ٹانگوں سے چلتی ہے، مگر چار ٹانگوں سے دوڑتی ہے۔" بیل نے کہا۔

"یا دونوں کا مجموعہ ہے۔" مترلو نے لقمہ دیا۔

بیل نے اس پر ایک نظر ڈالی اور مترلو نے مسکینی سے کندھے اُچکائے۔

"کیا تمہیں ایسے وجود کا یقین ہے؟" بیل نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں!"

لیکن وہ بہت عجیب سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر آنے والے خطرات اور خوف کے اثرات نمایاں تھے۔

(۹)

جان ویدبانی اور بیل صبح کے قریب تھکے ماندے بیچ ہوٹل واپس آئے۔ بارش تھم چکی تھی، مگر دُھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ لاؤنج میں ایک کھڑکی کے قریب بیٹھ گئے۔ یہ ناکامیوں سے بھرپور ایک طویل رات تھی۔ ویدبانی نے صبح کی روشنی میں کھوج تلاش کرنے کی پھر کوشش کی۔ بیل چپ چاپ اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ کھوج سڑک کے آگے چند سو گز تک چلے گئے تھے۔ وہ کسی وحشی جانور [illegible]

واپس آئے، تو گلی میں ایک پولیس کار ان کی منتظر تھی۔ ڈرائیور ایک طرف جھکا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ہیمنڈ کی لاش وہاں سے ہٹا لی گئی تھی۔ مگر خون کا سیاہ دھبہ مقامِ واردات پر ابھی تک نمایاں تھا۔ وہ کار میں سوار ہوئے اور ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

"اب کیا خیال ہے؟" جان نے پوچھا۔

"میں کُتّے منگوا رہا ہوں، مگر مجھے ان پر اعتماد نہیں۔ آپ بھی تو کوئی رائے دیں۔" بیل نے کہا۔

"عجیب معمّا ہے یہ۔" ویدبانی نے کہا: "بس خراشیں سی ہیں اور جو زخم ہیں وہ بھی ہلکے سے، جیسے بلی نے نوچ لیا ہو۔ ہاں آنتیں نکلی ہوئی ہیں۔ کوئی طاقتور جانور ہوتا، تو ہڈیاں توڑ دیتا۔ مگر یہاں تو پیٹ پھٹا ہوا ہے۔ بظاہر کسی چیتے کی کارستانی معلوم ہوتی ہے . . . لیکن کٹی ہوئی گردن اس ساری قیاس آرائی پر پانی پھیر دیتی ہے۔ چیتے ایسا ہلکا پُھلکا جانور یوں صفائی سے گردن نہیں کاٹ سکتا۔ کوئی بے حد طاقتور جانور ہی گردن الگ کر سکتا ہے۔"

بیل نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے سر ہلایا: "اور کھوج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"کھوج بجائے خود بہت عجیب ہے۔"

"ایسے جانور بھی تو ہو سکتے ہیں، جو پچھلی ٹانگوں پر چلتے ہیں، مگر دوڑتے چاروں ٹانگوں پر ہیں۔" بیل نے کہا۔

"ہاں، بندر بھی ہو سکتا ہے اور ریچھ بھی، لیکن وہ بھی تھوڑی دُور تک . . . مزید پریشان کُن بات یہ ہے کہ یہ جانور دوڑتا ہے تو نشان بدل جاتے ہیں۔ میں نے نشانوں کی پیمائش کی ہے۔ کم و بیش ڈھائی من کا جانور ہوگا۔ چیتے کا وزن اتنا ہی ہوتا ہے، لیکن دوڑتے وقت اس جانور کے نقوش بالترتیب ہلکے ہو جاتے ہیں۔ یُوں معلوم ہوتا ہے وہ زمین کو چھو کر گزرتا ہے۔ گویا اس کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اس کے پاؤں زمین کو چھوتے ہوئے اُٹھتے ہیں؟"

"ہاں لیکن پھر ایک اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"مقتول ہیمنڈ کم و بیش چالیس گز تک دوڑا۔"

"ترپن گز اور کچھ انچ۔" بیل نے کہا۔

"ہاں، لیکن ایسا تیز رفتار جانور اپنے شکار کو اتنی دور تک دوڑنے کی مہلت کیسے دے سکتا ہے؟"

"شاید وہ بلی کی طرح اپنے شکار سے کھیلتا رہا ہو۔"

"ممکن ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



خاصی دیر تک خاموشی چھائی رہی اور پھر بیل بڑبڑایا۔
"ایک جانور... ایک مخلوق ۔۔۔ ایک ہستی جو اپنی مرضی کے مطابق اپنی ہیئت تبدیل کر سکتی ہے۔" ویدربائی جانتا تھا اس کا مطلب کیا ہے۔ بیل کے ذہن میں حترلو کی باتیں گونج رہی تھیں۔
"اس کی کچھ نہ کچھ توجیہہ کی جا سکتی ہے۔" ویدربائی نے کہا۔ "بعض حقائق ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں یا شاید انہیں معمولی سمجھ کر ہم نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔"
"بے شک!" بیل نے کہا۔
خادم نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔
بیل نے اُسے اشارے سے اندر بلایا۔ وہ ایک دہشت زدہ کوتاہ قامت شخص تھا۔
"جناب؟"
"کافی!" بیل نے کہا۔
"بہتر جناب!"
"اور ہاں، کاغذ بھی لاؤ۔"
"کاغذ جناب؟"
"ہاں کاغذ! کچھ لکھنے کے لیے۔"
"بہتر جناب!"
خادم نے شانے ہلائے اور واپس چلا گیا۔
"یہ ایسا شخص ہے جس نے کبھی قانون شکنی نہیں کی۔" بیل نے اپنی پیشہ ورانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ایک شخص جو انصاف حاصل کرنے کے لیے قانون کو موڑنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔"
"ہم کچھ نہیں جانتے۔" ویدربائی نے کہا۔ "اس قسم کے قتل کا کھوج لگانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کوئی نظریہ یا خاص انداز ثابت نہ ہو جائے لیکن یہ کوئی اطمینان بخش طریقہ نہیں۔ اس انتظار میں کتنی ہی اور اموات ہو سکتی ہیں۔" وہ پھر اپنے موضوع کی طرف مڑ گیا۔
"کیا جانوروں کا بھی کوئی خاص انداز ہوتا ہے، جان؟"
"یقیناً! انسانوں سے بھی بڑھ کر۔"
"کیا یہ قاتل بھی اس انداز پر پورا اترے گا؟"
"ہاں، اس کا انحصار اس کی ہلاکت خیز زیادتی پر ہے۔ لیکن وہ اپنے شکار کو نہیں کھاتا اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بھوک مٹانے کے لیے شکار کرتا ہے۔ بہر حال اس کا خاص انداز دریافت ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا۔"
خادم ایک کشتی میں کافی اور کاغذوں کی گڈی لیے داخل ہوا۔ احتیاط کے ساتھ تمام اشیا میز پر رکھیں اور چلا گیا۔ بیل نے ایک کاغذ اپنے سامنے پھیلا لیا۔
"دونوں قتل کم و بیش ایک میل کے اندر ہوئے ہیں۔" اس نے کہا۔ پھر بال پوائنٹ قلم سے نشان لگائے اور بولا۔
"اگر یہ کوئی جانور ہے تو لازماً اس علاقے میں اس کا کوئی ٹھکانا ہو گا۔ کوئی غار، بھٹ یا درخت۔"
ویدربائی نے اثبات میں سر ہلایا لیکن بیل کاغذ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ جلد ہی اس نے ایک نقشہ تیار کر لیا جس میں تمام اہم مقامات شامل تھے اور سارے علاقے کی حد بندی کر دی گئی تھی۔
"ملاحظہ فرمائیے، ان دونوں مقاماتِ واردات کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔" بیل نے کہا۔
"کتنا ہے؟"
"تقریباً دو میل۔"
"بائرن کا مکان کہاں ہے؟"
"بائرن کا مکان؟"
"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"
بیل نے کاغذ پر ایک لکیر اور ایک مربع کا اضافہ کر دیا۔ یہ لکیر ایک تنگ گلی کو ظاہر کرتی تھی جو بڑی گلی میں سے مغرب کی طرف نکلتی تھی اور اس کے سرے پر بائرن کا مکان تھا۔ جہاں سے چھوٹی گلی نکلتی تھی وہاں بالکل قریب ہیمنڈ ہلاک ہوا تھا۔
ویدربائی فاصلے کا اندازہ کرنے لگا۔ بیل پھر کاغذ پر نشان لگا رہا تھا۔ اب اس نے پہاڑی سلسلے کا نقشے میں اضافہ کیا، جو ندی اور گلی کے درمیان متوازی گزرتا تھا۔
ویدربائی کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور نگاہیں اوپر اٹھائیں۔
بیل نے پوچھا۔ "کوئی نیا خیال؟"
"ہم خود شیر پکڑنے کا طریقہ کیوں نہ اختیار کریں؟"
"یعنی دام بچھائیں ۔۔۔؟"
ویدربائی نے اثبات میں سر ہلایا۔



"لیکن یہ انسانی شکار کو پسند کرتا ہے اور ہم کسی انسان کو داؤں پر نہیں لگا سکتے۔"
"فرض کرو ہیں پڑا رہنے دیں تو...؟"
"جان! یہ انگلستان ہے۔ ہم قانوناً ایسا نہیں کر سکتے۔"
"ٹھیک ہے لیکن اگر میں خود اس کا انتظار کروں۔ کسی خاص مقام پر نہیں، بلکہ رات کے وقت جنگل میں اور سڑک پر اِدھر اُدھر گھومتا رہوں۔"
"تو آپ خود کو شکار بنائیں گے؟" بیل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "میں آپ کو یہاں اس لیے نہیں لایا تھا۔"
"ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے، بڑی مدت ہوئی..."
بیل نے سر جھٹکا اور بولا۔ "میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گا۔"
"جیمسن! یہ اکیلے شکاری کا کام ہے، کسی گروہ کا نہیں۔ زیادہ لوگ ہوئے، تو وہ چوکنا ہو جائے گا۔ آپ کی اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے رات کے وقت جنگلوں میں گھومنے کا پورا حق ہے۔"
"ہاں، میں آپ کو روک نہیں سکتا۔"
"ممکن ہے یہ چال کامیاب ہو جائے۔ اسے آزمانا چاہیے جیمسن!" ابھی تک بیل کی پیشانی شکن آلود تھی۔ اس نے کافی کی چسکی لی۔
"آخر نقصان کیا ہے؟" ویدربائی نے پوچھا۔
"نقصان؟ آپ کی عمر کا!"
"شاید میں بائرن کو اپنے ساتھ ملاؤں۔" ویدربائی نے کہا۔ پھر اس نے نقشے پر نظر ڈالی۔ "ہم اکٹھے مرحوم... دن کا شکار کرتے رہے ہیں۔ میں آج سہ پہر اس کے ہاں جاؤں گا، اور رات اس تدبیر کو آزماؤں گا خواہ بائرن کے ساتھ یا اکیلا۔"
"میں آپ کو سرکاری طور پر روک نہیں سکتا۔ کیا آپ کے پاس بندوق کا لائسنس ہے؟"
"ہاں!"
"کس قسم کی مدد چاہیے؟"
"ضرورت ہوئی تو کہہ دوں گا۔" ویدربائی نے کہا۔
"بہت کارآمد ہونا چاہیے۔"
اس نے خادم کی آنکھیں ایک گوشے سے جھانکتی ہوئی دیکھ لیں جو فوراً ہی غائب ہو گئیں، اور کھسر پھسر کی آوازیں آئیں۔
اچانک ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ کوتاہ قامت اور گٹھا۔ آنکھوں میں شائستگی، بالوں کی چکت بہت دکھتی تھی۔ نوٹ بک اور قلم جیب میں تھا۔ کوئی نامہ نگار معلوم ہوتا تھا۔
"اُف خدایا! اخبار والے!" بیل تقریباً چیخ اٹھا۔
نووارد نے اپنا ہاتھ ویدربائی کی طرف بڑھایا۔ "سراغرساں سپرنٹنڈنٹ بیل؟"
"کیا میں سراغرساں نظر آتا ہوں؟" ویدربائی نے خوف بھرے لہجے میں کہا۔
"آئرن روز!" نامہ نگار نے کہا اور اپنے اخبار کا نام بھی بتایا۔ پھر وہ بیل کی طرف بڑھا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ بیل نے ترش روئی سے دیکھا۔
"سراغرساں سپرنٹنڈنٹ بیل؟" روز نے پوچھا۔
"کیا میں سراغرساں دکھائی دیتا ہوں؟" بیل بڑبڑایا۔
ویدربائی مسکراتا ہوا اور وہ لمحے کی طرف بڑھا۔ روز کمرا اپنی کھوپڑی کھجاتا رہا۔

(۷)

ڈرائیور کو بائرن کا مکان معلوم تھا۔ وہ ہوٹل سے روانہ ہو کر شاہراہ کو عبور کرتے ہوئے مڑ گئے۔ اسی راستے سے وہ جائے واردات پر گئے تھے۔ دھند ابھی تک چھائی ہوئی تھی۔ ویدربائی سوچنے لگا رات کو یہ علاقہ کتنا خوفناک لگتا ہو گا۔ "بائرن کے ہاں تمہیں میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ چلتے رہے اور کوئی ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بائرن کے مکان پر پہنچ گئے۔ ویدربائی اتر گیا اور ڈرائیور واپس ہو گیا۔
ویدربائی منہ میں پائپ دبائے ایک لمحے تک کھڑا پرانے زمانے کے جاگیردار کا محل دیکھتا رہا۔ گزرنے والی صدیوں نے اپنے گہرے نقوش اس پر چھوڑے تھے۔ عمارت بڑی اداس اداس نظر آتی تھی۔ عقب سے لکڑی کاٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ ویدربائی آگے بڑھا تو آواز تھم گئی اور بائرن کندھے پر کلہاڑا رکھے عمارت کے ایک پہلو سے آتا نظر آیا۔ ویدربائی کو دیکھ کر مسکرایا اور گرمجوشی سے آگے بڑھا۔
"میں آپ کی آمد کا منتظر تھا۔" اس کے ہاتھ کی گرفت ہمیشہ کی طرح مضبوط تھی۔
اپنے مکان کی طرح وہ بھی استدادِ زمانہ کے اثرات سے محفوظ تھا۔ وہ بھرے بدن کا کشیدہ قامت شخص تھا۔ چہرے پر تازگی اور آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔ بال ترشے ہوئے، لباس قدیم وضع کا تھا۔ اس نے کلہاڑا زمین پر ٹکایا اور اس کے دستے پر جھک گیا۔
"بیل نے آپ کو اس ساحرانہ شکار میں شامل کر ہی لیا؟"
ویدربائی مسکرایا اور کندھے اچکائے۔
"میرا خیال تھا آپ تیار ہو جائیں گے۔" بائرن کی آنکھیں اوپر سے نیچے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



حرکت کر رہی تھیں۔ ویدبانی کچھ بے چین سا ہو گیا۔ اس کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ اس نے پائپ کا کش لگایا اور دریچے کی طرف دیکھا۔ بارٹن نے قہقہہ لگا کر ویدبانی کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا اور وہ مکان کی طرف چل پڑے۔

"حیرت ہے آپ نے پیش کش مسترد کر دی۔" ویدبانی نے کہا۔

"ہاں، میرے اور بھی مشاغل ہیں۔ میں نے ابھی زندہ رہنا ترک نہیں کیا، جان! میں آئندہ سال جنوبی امریکہ کی سیاحت کے متعلق سوچ رہا ہوں۔

کیا آپ کو اس سے دلچسپی ہے؟"

"نہیں، اب میں گوشہ نشین ہو چکا ہوں۔"

اب وہ مکان کے اندر ایک بڑے کمرے میں پہنچ گئے تھے جہاں شکار لٹکے ہوئے تھے۔ آگ دہک رہی تھی اور چمڑے کی آرام کرسیاں اس کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ وہ آگ کے قریب بیٹھ گئے۔ ویدبانی نے اس چیتے پر نظر ڈالی جو بارٹن نے اس کے سامنے بے حد بڑی بندوق کی ایک ہی گولی سے ڈھیر کر دیا تھا۔ وہ ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ اس کا اوپر کا سر فرش سے ڈیڑھ فٹ اونچا تھا۔

"کیا پئیں گے؟" بارٹن نے پوچھا۔

"کافی ہو جائے۔"

"گرانٹ!" بارٹن چلایا۔

قدیم وضع قطع کا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ بڑے بڑے اور گٹھے ہوئے تھے، جیسے پرانی لکڑی کی گرہیں۔ ایک ٹانگ بھی لنگڑی تھی۔

"کافی لاؤ!" بارٹن نے کہا۔

آدمی نے ناگواری سے سر ہلایا اور چلا گیا۔

"بڑا نیک بچہ ہے۔" بارٹن نے کہا۔

"مگر آپ نوکروں کو پسند نہیں کرتے۔"

"نہیں! مجھے غلامانہ ذہن کے نوکر ناپسند ہیں مگر گرانٹ بہت ہٹ دھرم آدمی ہے لیکن غلامانہ ذہنیت نہیں رکھتا۔ وہ ٹین کی کانوں میں کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اسے اس لیے نوکر رکھا ہے کہ اس نے کشتی میں قریب قریب مجھے شکست دے دی تھی۔" بارٹن نے کہا اور پھر بات کا رخ موڑ دیا۔ "اس مردم خور کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بس ایک چیتا ہے۔ آپ نے سنا ہو گا گزشتہ رات اس نے پھر ایک آدمی ہلاک کر دیا۔"

"ہاں، سن چکا ہوں۔ کیا آپ نے کسی طرح تلاش کی ہے؟"

"ہاں، مگر۔۔۔"

بارٹن اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ "گویا آپ شناخت نہیں کر سکے؟"

"میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا۔"

"جان! آپ کے لیے مشکل بات تو نہ تھی۔ دس سال پہلے آپ یقیناً پہچان لیتے۔"

ویدبانی کے چہرے پر ناخوشگوار پرچھائیں نمودار ہوئیں۔ "میں کہہ رہا تھا آپ پہلے شناخت نہیں کر سکے۔" اُس نے کہا۔

بارٹن مسکرایا۔ کچھ کہنے کو تھا، مگر حقارت سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"اچھا! تو آپ نے شناخت کر لیے تھے؟"

"مجھے پہلے ہی نہیں کھوج ملی۔"

"آپ کو کوئی پریشانی نہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

ویدبانی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ گرانٹ چاندی کی کشتی میں چائے لے کر آ گیا اور کشتی ایک جھٹکے کے ساتھ میز پر رکھ دی۔

"جان! میرا خیال ہے کہ آپ اس جانور کا کھوج لگا لیں گے۔" بارٹن نے کہا۔

"آج تو میں کامیاب نہیں ہوا۔"

"ایک بار پھر کوشش کیجیے۔"

ویدبانی نے اسے گھورا۔

"ہوں، ایک جانور دو بار ہلاک کرتا ہے تو شرط لگائی جا سکتی ہے کہ وہ پھر حملہ کرے گا۔"

"آپ کے خیال میں یہ کوئی جانور ہے؟"

"بلا شبہ!"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن وہ کون سا جانور ہے جو یوں سر کاٹ سکتا ہے؟"

"اس کا انکشاف بے حد دلچسپ ہو گا۔" بارٹن نے بڑے اطمینان سے کافی کی چسکی لی۔ پھر بولا۔ "آپ کس قسم کی بندوق استعمال کر رہے ہیں؟"

"ونچسٹر۔"

"بہت بڑی بندوق ہے۔" بارٹن نے کہا۔ "آپ نے نشان دیکھے ہیں، وہ کوئی بڑا جانور نہیں مگر آپ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ اسلحہ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے [illegible]

"اچھا آپ اسے کس طرح تلاش کرنا چاہتے ہیں؟"

"عام طریقے سے۔ میں خود اس کا انتظار کروں گا اور اسے موقع دوں گا کہ وہ مجھے تلاش کرے۔"

"اس ناہموار علاقے میں رات کے وقت؟" بارٹن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ "یہ تو جان! پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ بنگال کا مردم خور تو نہیں بھولے ہوں گے؟" بارٹن نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

ویدبانی نے مڑ کر دیکھا۔ شیر کی آنکھیں ابھی شرارت سے گھورتی معلوم ہوتی تھیں۔ اُسے پورا قصہ یاد آ گیا۔ تاریک رات اور خوفناک جنگل۔ وہ دونوں ایک ہندو دیہاتی کی آدھ کھائی لاش کے پاس شیر کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کی بیوہ لاش کے اس غلط استعمال پر بہت چیخی چلائی، لیکن گاؤں کے مکھیا نے جذبات کے بجائے عقل سے کام لیا۔

"جان! آپ درخت پر بیٹھے منتظر تھے۔"

"اور آپ زمین پر لاش کے پاس۔"

"اور پھر شیر نمودار ہوا۔ آپ نے جھک کر فائر کیا، شیر درخت کی طرف اچھلا اور پھر گر کر مر گیا۔۔۔ مجھے گولی چلانے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ دو سو انسانی جانیں لے چکا تھا۔"

"وہ بھی کیسے دن تھے جان! میں نے آپ کو شاید بتایا تھا، میں ان دنوں کی یادیں لکھ رہا ہوں۔" بارٹن کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ دھند اور بادل نمودار ہو رہے تھے۔ مکان کے پیچھے زمین گہری معلوم ہوتی تھی۔

"کیا آپ میرا ساتھ نہیں دیں گے؟" ویدبانی نے کہا جو اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔

"یہ بات میرے مذاق کے خلاف ہے۔ آپ خود کو چارہ بنا کر پیش کرنے کا ذکر کریں گر میرا اور آپ کا جوڑ نہیں رہا۔ آپ اب نازک ہو گئے ہیں۔"

"میں اور نازک؟" ویدبانی نے کہا۔

"خوب، شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن انسان اور جانور کے متعلق میرا اندازہ شاذ ہی غلط ہوتا ہے۔"

"اچھا، میں چلتا ہوں۔" ویدبانی نے کہا۔

"جان! آپ ناراض ہو گئے۔" بارٹن نے کہا۔

"غالباً میں غلطی پر ہوں۔ آؤ پنجہ آزمائی کر لیں۔ صرف ایک منٹ۔ آپ نے میرا مقابلہ کر لیا تو آپ کے ساتھ شکار میں شامل ہو جاؤں گا۔"

ویدبانی غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا بارٹن کے سامنے بیٹھ گیا اور پنجہ آزمائی شروع ہو گئی۔

ویدبانی نے ایک دم دباؤ ڈالا اور پہل کا فائدہ اٹھانے کے لیے پورا زور لگا دیا، مگر بارٹن لوہے کی طرح سخت تھا۔ اُس کا ہاتھ بالکل نہیں ہلا۔

"دس سیکنڈ!" بارٹن نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں منتظر ہوں جان!"

ویدبانی نے پوری قوت سے دباؤ ڈالا۔ اس کا بازو پھڑکنے لگا، سینہ پھول گیا، چہرہ سرخ ہو گیا اور ہاتھ کانپنے لگا۔ بارٹن نے اب جوابی زور لگایا۔ ویدبانی کا ہاتھ کمان بن گیا اور کلائی پیچھے مڑ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہڈیاں مڑ گئی ہیں۔ پچاسویں سیکنڈ پر ویدبانی کا ہاتھ سن ہو گیا اور طاقت جواب دے گئی اور اس کے ساتھ غصہ بھی۔

"ہاں، میں بہت کم غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہوں۔" بارٹن نے ویدبانی کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"جان! اس مہم میں میں تمہاری خوش بختی کے لیے دعا گو ہوں۔"

ویدبانی تنگ گلی میں سے واپس چل پڑا۔ اس کا بازو دکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ناکامی کے احساس میں گم تھا۔ اُسے اپنی ذات پر شبہ ہونے لگا تھا۔ "شاید بارٹن ٹھیک ہی کہتا ہے۔" اُس نے سوچا۔

(۸)

تیز ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ ویدبانی نے کش لگایا تو اس کا پائپ چٹخا۔ پائپ رات کی سردی میں ایک گرم ساتھی تھا۔ ویدبانی نے گرم لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے پاس برانڈی کی ایک بوتل اور ٹارچ بھی تھی۔ ٹارچ بجھی ہوئی تھی، مگر بندوق بھری ہوئی۔ بندوق کا سیفٹی کیچ اس کے انگوٹھے کے نیچے تھا۔ وہ ندی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ ابھری ہوئی چٹانوں کے سیاہ ہیولے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اندھیرا چھانے سے پہلے ہی وہ چل پڑا تھا۔ اس کی منزل وہ جگہ تھی جہاں راستہ ٹیلے کی طرف مڑتا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ چٹانوں سے اوپر سے ہوتا ہوا کھلے میدان میں جا نکلے گا اور پھر وہاں سے بارٹن کے مکان کو جانے والی گلی عبور کرے گا اور پچھلی ہلاکت کے قریب ہی کہیں جا بیٹھے گا۔ یہاں سے وہ شاہراہ پر چلتے ہوئے ہوٹل پہنچ جائے گا۔ منصوبہ جرأت مندانہ اور مکمل تھا اور بڑی حد تک کامیابی کی امید تھی۔ چونکہ وہ خود شکاری تھا اور شکار بھی، اس لیے زیادہ ہوشیاری کی ضرورت تھی اور اپنے آپ کو چھپانے کی [illegible] سے تو مقصد ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرت ہو جاتا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ بڑی چٹانوں اور درختوں سے ہٹ کر لمبے بناتا ہوا چلتا رہا۔ کبھی اُوپر چٹان کی طرف بڑھتا اور کبھی نیچے ندی کی طرف آجاتا۔

اور پھر وہ رُک گیا۔ یہیں قریب ہی رینڈل کی لاش ملی تھی۔ یہ ایک پُرسکون مقام تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ندی بہہ رہی تھی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ قدرے دَم لے کر وہ چٹان کی طرف مُڑا تو ذہن میں سڑک پر ملنے والی مسخ شدہ لاش اُبھر آئی۔ اُوپر چڑھا تو اور چٹانیں دکھائی دیں۔ وہ بڑی چٹانوں کے گرد دائرہ بنا کر چلنے لگا۔ وہ جانتا تھا اس کا شکار اس پر حملہ کرنے کے لیے خود اس کے پاس پہنچے گا؛ تاہم اندیشے کی کوئی بات نہ تھی۔ بس چند گز کا فاصلہ چاہیے تھا تاکہ وہ اپنی بندوق چھپا سکے۔ چٹانوں کے کنارے پہنچ کر دیدہ بانی رُک گیا۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دُور شاہراہ پر دوڑتی ہُوئی کار کی روشنیاں نظر آئیں۔ سارا علاقہ ایک سیاہ کمبل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ شاید وہ چیز کہیں اس کی منتظر ہو۔ اس اُمید پر دیدہ بانی چلتا رہا، مگر وہ کہیں بھی نہ ملی۔

"شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں۔"

شراب خانے "کنگز فورسٹ" کا مالک بحریہ کا ایک ریٹائرڈ افسر بروس نیوٹن تھا۔ بروس چاق چوبند شخص تھا۔ اُسے گاہکوں کی کچھ ایسی پروا نہ تھی، اسی لیے اُس نے کاروبار مختصر سا رکھا اور شراب خانہ ایسے راستے پر بنایا جس پر بہت کم آمد و رفت رہتی۔ یہ بائرن کے مکان اور چھوٹے قصبے کے درمیان واقع تھا۔ اس شراب خانے میں جو لوگ باقاعدگی سے آتے اُن میں ایک نوجوان رونالڈ لیک بھی تھا۔ وہ اپنی نئی دُلہن کے ساتھ اسی ناہموار علاقے کی ایک کٹیا میں رہتا تھا جو شراب خانے سے دس منٹ کی مسافت پر تھی۔ لیک ہمیشہ پیدل جاتا۔ وہ لندن کی گھما گھمی اور آسائشوں تک کے یہاں آ بسا تھا۔ بیوی بھی سادہ طرزِ زندگی کی شوقین تھی۔ میاں بیوی دونوں بڑے ہی کم گو خوش باش تھے۔ تھوڑی سی آمدنی کافی ہو رہتی۔ باقی وقت فراغت میں کاٹتے۔ لیک شوقیہ مصوری کرتا تھا، گو اچھا مصور نہ تھا۔ بیوی اپنا وقت شارلٹ برونٹے کی کتابیں پڑھنے میں گزارتی۔ لیک عموماً ہفتے میں چار پانچ بار رات کے وقت ٹہلتا ہوا شراب خانے میں جا نکلتا۔ بروس سے اس کی گاڑھی چھنتی۔ پہلے دَور میں لیک شراب پلاتا۔ دوسرے دَور کی قیمت بروس ادا کرتا۔ تیسرا دَور چلتا تو قرعہ اندازی کر لیتے۔

لیک نے برش رکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خاموش زندگی کی تصویر بنا رہا تھا۔ ایک پھول اور ایک بینگن کی تصویر۔ اس کے کپڑے سُرخ، نیلے اور قرمزی رنگوں سے آلودہ تھے۔ پیشانی پر پڑی ہوئی بالوں کی لٹ اس نے پیچھے ہٹا کر ماتھے پر بھی رنگ لگ گیا۔ بیوی آرام کرسی پر بیٹھی آگ کے قریب مطالعہ میں مصروف تھی۔

"میرا خیال ہے میں آدھ گھنٹے کے لیے بروس کے ہاں ہو آؤں۔" لیک نے کہا۔

"ہوں۔"

"کیا تم ساتھ چلو گی؟"

"نہیں! میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی۔" وہ مسکرائی اور اس کی نگاہیں پھر کتاب پر دوڑنے لگیں۔

لیک نے جیکٹ پہنی، اُونی گلوبند گلے سے لپیٹا اور باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ ایسی سادہ زندگی میں تالے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یوں بھی کوئی ان کا دشمن نہ تھا اور نہ ان کے پاس کوئی قیمتی چیز تھی کہ چوری ڈاکے کا اندیشہ ہوتا۔

لیک تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ سامنے شراب خانے کی روشنیاں تھیں اور بائیں جانب کسی قدر دُور بائرن کے مکان کی بتیاں۔ بائرن سے اس کی کبھی صاحب سلامت نہ ہوئی تھی۔ لیک شراب خانے میں داخل ہوا تو وہاں کوئی گاہک نہ تھا۔ بروس جھنگے پر مچھلی کا ملال کر رہا تھا۔ آتش دان میں خوشگوار آگ جل رہی تھی۔

"آج تمہارے آنے کی توقع نہ تھی۔" بروس نے کہا۔

"اچھا؟"

"میرا خیال تھا اس قاتل کی موجودگی میں تم رات کے وقت باہر نہیں نکلو گے۔" بروس نے کہا۔

"قاتل؟" لیک نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اخبار نہیں دیکھا؟"

"میں اخبار نہیں پڑھتا۔ میں نے پرہنگامہ زندگی ترک کر دی ہے۔ دُنیا کے حالات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

"ہوں، اتنی بے نیازی اچھی نہیں۔ گزشتہ چند روز میں دو آدمی ہلاک ہو چکے ہیں۔ بُوڑھے رینڈل سے تو واقف ہو گے؟"

"رینڈل؟ وہ بوڑھا آدمی؟ میں نے اُسے یہیں کہیں دیکھا تھا۔"

"ہاں، وہ پہلا شکار تھا۔"

"اُف خدایا!"

"کل رات ایک سیلز مین اسی سڑک پر مار ڈالا گیا۔



"کوئی جنونی ہے؟"

"کہتے ہیں کوئی جانور ہے۔ شاید چڑیا گھر سے چھوٹا ہُوا جانور۔ وہ لندن سے کسی شکاری کو لائے ہیں۔"

لیک نے کھڑکی کی طرف نظر ڈالی۔

"اسی لیے میں اندھیرا ہونے کے بعد باہر نہیں نکلتا۔" بروس نے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"

دونوں نے ایک ایک جام پیا۔

"کون سا جانور ہے؟"

"جو پولیس یہاں آیا تھا، اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کہنا تھا وہ کچھ نہیں جانتا، لیکن میرا اندازہ ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں مگر پولیس والے بتایا نہیں کرتے۔"

لیک پریشان سا ہو گیا۔ موت کے خوف سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ اُس کی پُرسکون زندگی درہم برہم ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے اپنا جام خالی کیا۔

"ایک جام میرے ساتھ بھی ہو جائے۔" بروس نے کہا۔

"مجھے اب چلنا چاہیے۔ کہیں ہیزل پریشان نہ ہو۔"

"بہتر ہے۔ احتیاط سے کام لو۔ وہ کہتے ہیں اُس نے بوڑھے رینڈل کے ٹکڑے کر دیے تھے اور سیلز مین کے بھی۔" بروس نے کہا۔

لیک بے چین نظر آتا تھا۔

"شکریہ تم نے مجھے خبردار کر دیا۔" وہ تذبذب بھرے انداز میں دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل گیا۔ تیزی سے قدم اُٹھاتا کٹیا کی طرف بڑھا۔ سڑک چمک اُٹھی تھی۔ جاگیردار کے محل کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ اُس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اُسے گھر سے نکلے پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ اُس کا دم پھُول گیا تھا۔ آخر اُس کو اپنی کٹیا کی روشنی نظر آنے لگی۔ قریب پہنچا تو دروازہ قدرے کھلا نظر آیا۔ کسی انجانے خیال سے وہ کانپ اُٹھا اور پھر دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی وہ مسکرایا۔ اُسے اپنی تشویش مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی۔ رات کی تاریکی اس کے تخیل پر چھا گئی تھی۔ ہر چیز ایسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اپنی بیوی کا بازو اسے کُرسی پر نظر آ رہا تھا۔

"جانِ من! میں آ گیا ہوں نا!" اس نے کہا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

وہ ہیزل کی طرف بڑھا۔ سُرخ اور زرد رنگ اس کی نگاہوں میں سمائے ہوئے تھے لیکن [illegible] رنگ کچھ زیادہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ قالین پر سُرخ رنگ کے دھبے [illegible] دکھتے تھے اور کتابوں کے شیلف سے بھی سُرخ رنگ ٹپک رہا تھا۔ [illegible] ہیزل کی کرسی پر ایک سیاہ رنگ کا لبادہ دھرا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا لیکن بیوی کی گردن نظر نہ آئی۔ وہاں صرف ایک سُرخ دھبا تھا۔

"کیا تم جاگ رہی ہو؟" وہ پکارا، مگر صدا نے برنخاست۔ "بروس نے مجھے ایک دہشت ناک خبر سنائی ہے۔ . . ."

وہ اب بھی خاموش تھی۔ لیک لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف بڑھا اور اپنا ہاتھ بیوی کے بائیں شانے پر رکھ دیا، مگر پھر فوراً اُٹھا لیا جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ ہاتھ خون میں لتھڑ گیا تھا اور گردن غائب تھی۔ اسے دُنیا گھومتی ہُوئی محسوس ہُوئی۔

٭

دیدہ بانی نے جھک کر بندوق چھپائی۔ اس سے پہلے کہ آواز اس کے ہوشیار دماغ تک پہنچے اس کی اُنگلی ٹریگر کو سہلا رہی تھی۔ اس کے عضلات جوش سے مرتعش تھے اور پھر یہ سحر آلود کیفیت ختم ہو گئی۔

پکارنے والا ہیرلڈ تھا۔ اس کی ٹارچ قوس بناتی ہوئی روشنی پھینک رہی تھی۔ دیدہ بانی نے سیفٹی کیچ کھینچ لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دیکھا سراسیمگی کے اعصاب زدہ ہاتھوں میں شکاری بندوق ہے۔

"سب ٹھیک ہے۔" وہ پکارا۔

وہ ہیرلڈ کی طرف بڑھا۔

"آپ یہاں ہیں؟" ہیرلڈ نے پوچھا۔

"میں نے بیل سے کہا تھا مجھے کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں۔ . . ."

دیدہ بانی نے دانت کچکچائے۔

"جناب! مجھے بیل ہی نے آپ کی تلاش میں بھیجا ہے۔"

"میں آپ کو نشانہ بنا دیتا تو؟ آپ نے جانور کی تلاش کا موقع بھی ضائع کر دیا۔"

"آج رات گھات لگانے کا وقت گزر چکا ہے۔"

دیدہ بانی جواب دینے کو تھا مگر رُک گیا۔ اس نے ہیرلڈ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں صداقت جھلک رہی تھی۔

"اُس نے پھر ایک جان لے لی ہے۔" ہیرلڈ نے گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "گلی کی دوسری جانب۔"

"کیں!! ایک اور جان؟" دیدہ بانی ہکا بکا رہ گیا۔ اور پھر وہ دونوں چل پڑے۔

٭

قمقموں کی تیز روشنی سے چھوٹا کمرہ اور سفید ہو گیا تھا۔ ان سراغرسانوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کے زرد چہرے بھی سفید پڑ گئے تھے۔ جو انگلیوں کے نشان حاصل کر رہے تھے۔ خون کی دھاریاں سیاہ پڑ گئی تھیں۔ لیک کونے میں گم صم بیٹھا اپنے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ خوف اور صدمے سے اس کی آنکھیں کھل رہ گئی تھیں۔ بیل نے کچھ کہے بغیر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ویدربائی نے آتے ہی کرسی پر نظر ڈالی۔

"عورت!" اُس نے حیرت سے کہا۔ "وہ بے ڈھنگ لاش کی گرد میں پڑی تھی۔ ایک معمر آدھا بیٹھا ہوا تھا۔ بے جان ہاتھ کرسی کے بازو پر لٹکا ہوا تھا اور ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کرسی خون آلود پنجوں سے بھری ہوئی تھی۔

"کیا کوئی جانور تھا؟" ویدربائی کو اپنی قوتِ گویائی زائل ہوتی محسوس ہوئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"جانور یا پھر جہنم کی کوئی مخلوق۔"

"لیکن وہ اندر کیسے داخل ہوا؟" لیک نے کراہ کر پوچھا۔ "میں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔"

"اس کو باہر نکال دو۔" بیل نے حکم دیا۔

ہترلو لیک کی طرف بڑھا۔ لیک نے کوئی حرکت نہ کی۔ اُس کے اعضا اکڑ گئے تھے اور قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔

"دروازہ بند تھا۔" اُس نے پھر کہا۔

ویدربائی نے بیل کی طرف دیکھا۔ بیل نے منہ بنایا۔ ہترلو اور ایک سپاہی لیک کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔

"وہ جو چیز بھی تھی اس نے خود دروازہ کھولا۔" بیل نے کہا۔

"کیا تالا لگا ہوا تھا؟"

"نہیں! یہاں تالا نہیں۔ چٹخنی ہے جو باہر سے ہٹائی جا سکتی ہے۔"

وہ دروازے کی طرف گئے۔ ایک سراغرساں چٹخنی کی گرد جھاڑ رہا تھا۔ ویدربائی زمین اور چٹخنی کے درمیانی فاصلے کا اندازہ کرنے ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔

"وہ مخلوق جس کے پنجوں کے یہ نشان ہیں۔ کیا دروازہ کھول سکتی ہے؟" بیل نے پوچھا ― ہترلو لیک کو باہر لے جانے لگا۔ تو وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ لیک ابھی تک اپنے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ یہ جنگ ہے۔" اُس نے کہا۔

پھر وہ قہقہے لگانے لگا۔ مجنونانہ قہقہے جو آہستہ آہستہ آہوں میں بدل گئے۔ ہترلو نے اُسے پولیس گاڑی میں ایک سپاہی کے پاس بٹھا دیا اور واپس آ گیا۔

"یہاں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" اُس نے آتے ہی کہا۔

"واہیات!" بیل نے جھڑک دیا۔

"میرا مطلب تھا شاید وہ چیز انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ کوئی قدیم افسانوی مخلوق، جسے ہم وہم سمجھتے ہیں وہ اس علاقے میں آ گئی ہے۔"

"ہترلو! خاموش رہو۔"

ہترلو نے سر جھکا: "جناب، آپ مانیں نہ مانیں، میرا یہی احساس ہے۔"

"تم تھک گئے ہو اور عقل سے کام نہیں لے رہے۔"

ہترلو نے ناگواری سے کندھے اُچکائے اور چپ ہو گیا۔ کرسی پر ایک نظر ڈالی اور پھر دروازے کی چٹخنی دیکھنے لگا۔

(۹)

لاش اُٹھائی جا چکی تھی۔ پولیس نے پوری تفتیش کی۔ مگر کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی۔ ہاں ایک بات عجیب تھی۔ خون آلود پنجوں کے نشان کثرت سے تھے۔ مگر وہ بھی کرسی پر یا اس کے ارد گرد۔ خون کی کوئی لکیر دروازے تک نہیں گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا قاتل نے جانے سے پہلے اپنے پنجے قالین سے پونچھ لیے تھے۔

"لیکن ہیں کس جانور کے؟" بیل نے پوچھا۔

"ان کی شناخت زمین پر ملنے والے نشانوں سے زیادہ مشکل ہے۔ ایک بات واضح ہے۔ پنجے لمبے اور تیز ہیں لیکن حیرت ہے۔ خون کے نشان دروازے تک نہیں جاتے۔ گویا وہ جانور چھلانگ لگا کر یا اُڑ کر دروازے سے نکل گیا ہے۔ ایسا نہیں ہوا تو صاف ظاہر ہے اس نے کھوج مٹانے کی عمداً کوشش کی ہے۔"

"باہر بھی تو دیکھنا چاہیے نشان ہیں یا نہیں۔"

"ہاں ضرور دیکھا جائے۔ لیکن میرے خیال میں صبح کا وقت زیادہ مناسب ہے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ کوئی موٹر ان کی طرف آ رہی تھی۔ ناہموار راستے پر یہ روشنیاں کبھی اُوپر اٹھتیں، کبھی نیچے جاتیں۔ ویدربائی جھک کر ٹارچ کی روشنی میں دروازے کے قریب زمین کا معاینہ کرنے لگا۔ لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ گاڑی قریب آ گئی۔ روشنی کٹیا کی دیوار پر جھلملائی اور پھر گاڑی رُک گئی۔ روشنی گُل ہو گئی اور ٹارچ کی روشنی کٹیا کی طرف بڑھی۔ ساتھ ہی شور بھی۔

"جناب کُتّے آ گئے ہیں۔" ہترلو نے آ کر کہا۔

"یہاں کچھ نہیں۔" ویدربائی اُٹھ کھڑا ہوا۔

کُتّے بھونک رہے تھے اور محافظ کو ان کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ بیل



نے محافظ کو تیزی سے ہدایات دیں۔

"آپ ذرا ٹھہریں!" اس نے ویدربائی سے کہا: "ان وحشیوں نے بُو پائی، تو پھر آپ کی مدد درکار ہو گی۔ اچھا محافظ! اپنا کام شروع کرو۔"

محافظ کُتّوں کو کٹیا میں لے گیا۔ ویدربائی اور بیل باہر انتظار کرنے لگے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور اندر کُتّوں کی پُرجوش چیخوں کے پس منظر کی موسیقی کا کام دے رہی تھی۔ پھر کُتّے جھپٹتے ہوئے دروازے میں سے باہر نکلے اور پنجوں سے زمین کھودنے لگے۔

"اندر بُو مجھے بھی آ رہی ہے۔" محافظ نے کہا۔

ویدربائی نے سر ہلایا۔

"کیا تم نے بھی محسوس کیا؟" بیل نے پوچھا۔

"ہلکی سی۔ سگریٹ کا دھواں پھیلنے سے پہلے بُو کافی تیز ہو گی نشانوں کی طرح یہ بھی مجھے جانی پہچانی لگتی ہے۔ لیکن ہے کس کی؟ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا۔ کسی جانور کی ہے!"

"انسانی بُو یقیناً نہیں ہے۔"

"گویا قاتل کوئی جانور ہے؟" بیل نے کہا۔ "بہت ہی چالاک اور عیار جانور، دروازہ کھول سکتا ہے اور اپنا کھوج مٹا سکتا ہے۔ شاید جبلت ہی میں درندگی ہے یا خون منہ کو لگ گیا ہے یا پھر کھوج مٹانے کے لیے حملہ آور ہوتا ہے لیکن یہ شیطان تو اپنا شکار کھاتا بھی نہیں۔ ۔ ۔"

بیل خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

"نہیں نہیں صرف شکار کرتا ہے۔" ویدربائی نے کہا۔

"پھر تو کوئی عجیب سی جذباتی اور انسانی وجہ ہو سکتی ہے۔" یہ ایک خوفناک نظریہ تھا۔ بیل دل ہی دل میں لرز سا گیا۔ کُتّے ایک عزم کے ساتھ روانہ ہو گئے گویا انہیں خبر تھی کہ کس کام پر جا رہے ہیں ― دس منٹ کے بعد وہ بھی اپنے مالکوں کی طرح پریشان تھے۔ انہیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس کھوج کی پیروی کریں۔ انہوں نے مختلف اطراف میں منتشر ہونے کی کوشش کی۔ وہ مایوسی سے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ ویدربائی ان کی حرکتیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے بھی کُتّوں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کُتّوں کو شکست ہو چکی ہے۔ سڑک چھوڑتے ہی کھوج تبدیل ہو گیا تھا اور یہی بات انہیں اصل بُو سے بھٹکانے لگی۔ شاید کھوج کی طرح بُو بھی بدل گئی تھی۔ ایک ایسا جانور جو چار پاؤں سے دوڑتا اور دو پاؤں سے چلتا ہو، اس کی بُو بھی بدل سکتی تھی۔ کٹیا سے چند سو گز کے فاصلے پر اچانک بُو ختم ہو گئی۔ محافظ اور کُتّے واپس آئے کی صورت میں کٹیا کے اردگرد چکر کاٹ رہے تھے۔

لیکن بُو کس سمت چلی گئی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ویدربائی نے آسمان پر نظر ڈالی کہیں وہ مخلوق آسمان پر تو نہیں اُڑ گئی پھر اپنے لغو خیال پر جھنجھلایا وہاں صرف بادل منڈلا رہے تھے۔

"قاتل جو بھی ہے اُس نے اپنی بُو مٹا دی ہے۔" محافظ نے کہا۔ وہ پریشان نظر آتا تھا۔ "کُتّے اس مقام سے آگے بُو کی پیروی نہیں کر سکتے۔"

"اچھا۔ ان چیخنے والے شیطانوں کو یہاں سے لے جاؤ۔" بیل جھنجھلا اٹھا۔ وہ واقعی چیخ رہے تھے۔ جوش سے نہیں۔ چیخیں ان کی مایوسی کی غماز تھیں۔ اُن کی دُمیں جھک گئی تھیں اور آنکھوں میں ملال کی کیفیت تھی۔

"کیا ہم پھر کوشش کریں گے؟" بیل نے ویدربائی سے پوچھا۔

"ہاں، لیکن جیسن! مجھے کچھ زیادہ اُمید نہیں۔ اگر وہ تربیت یافتہ کُتّوں کے گروہ کو شکست دے سکتا ہے تو ۔ ۔ ۔"

"کُتّے!" وہ جھنجھلایا۔

"کُتّوں کو اتنا حقیر نہ سمجھیے۔" ویدربائی نے کہا: "میرا خیال تھا وہ اس کا پیچھا کریں گے۔ زیادہ دُور تک نہ سہی، کم از کم پانی یا درختوں تک تو ضرور۔ موڑ کر ختم کر دیتے ہیں۔"

"ایمان کی بات یہ ہے مجھے کچھ سُوجھ نہیں رہا۔" بیل نے کہا: "پاگل آدمی کا بھی کوئی نہ کوئی انداز ہوتا ہے۔ مگر عجیب و غریب عفریت ہے یہ جو لوگوں کو بلا مقصد ہلاک کرتا ہے۔ جیک دی ریپر یہاں ہوتا تو اس کو پکڑ سکتے تھے کہ وہ اپنا خاص انداز رکھتا تھا۔ اس کا شکار عموماً خوش رُو لڑکیاں ہوا کرتی تھیں لیکن یہ چیز ― میری تو عقل دنگ ہے۔"

ویدربائی خود ششدر تھا۔

(۱۰)

صبح وہ پھر جائے واردات پر پہنچے۔ گرمائی کے احساس سے بجھے ہوئے۔ ڈرائیور نے گاڑی کنکر والے موڑ سے کافی آگے گلی کے کنارے کھڑی کی۔ یہاں سے کٹیا نظر نہیں آتی تھی۔ درمیان میں اُونچی زمین حائل ہو گئی تھی۔ "تم یہیں ہمارا انتظار کرو۔" بیل نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ نیچے اُتر آئے۔ اچانک ایک شخص گلی میں داخل ہوا۔ چیک والا اوور کوٹ زیب تن تھا اور سر پر فلیٹ ہیٹ۔ وہ پھدکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بیل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ یہ نامہ نگار آرن روز تھا۔ ایک اور شخص کندھے پر کیمرا لٹکائے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"اخبار کے لیے کوئی بات؟" قریب آ کر اس نے پوچھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"کچھ نہیں۔"

"کب تک گرفتاری عمل میں آئے گی؟" اُس کے ایک ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔

"کب کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کس چیز کو گرفتار کرنا ہے۔"

"کیا میں اس بات کا ذکر کر سکتا ہوں؟"

"نہیں خدا کے لیے نہیں۔ اور نہ ہمارے ساتھ آ سکتے ہیں۔ آپ لوگ یہاں انتظار کریں۔ واپسی پر شاید کوئی کہنے کی بات ہمارے پاس ہو۔"

ویدہ بائی اور بیل دونوں کٹیا کی طرف بڑھے۔

اچانک ایک خیال روز کے ذہن میں بجلی کی طرح لہرایا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اس نے اپنی کہانی کو سحر کا رنگ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

"ایک زاویہ۔ مجھے ایک خیال سوجھا ہے۔" اُس نے آنکھ مارتے ہوئے فوٹوگرافر سے کہا اور وہ آہستہ آہستہ شراب خانے کی طرف چل پڑا۔ اُس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ "چاہے چند قارئین ہی یقین کریں یہ ایک چونکا دینے والی کہانی ہوگی۔" اُس نے سوچا اور پھر تصور کی نگاہوں سے دیکھا۔ اخبار کی شہ سرخی تھی "تین اشخاص کا قاتل بھیڑیا نما انسان یا انسان نما بھیڑیا؟" کتنی لرزا دینے والی سرخی تھی۔

حیران کن بات تھی۔ زمین سخت ہونے کے باوجود کھوج موجود تھا۔ واضح، گہرا اور صاف۔ لیکن کٹیا سے نہیں کچھ فاصلے پر سے شروع ہوتا تھا۔ سیدھا شمال کی جانب گیا اور پھر ایک دم ختم ہو گیا۔ وہ اسی سمت بڑھ لیے۔ ہر طرف کتے بُو کے پیچھے گئے تھے۔ شروع اور آخر کے نشان مٹا کر درمیان کے نشانات چھوڑ دینا بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ "کہیں اُس نے تعاقب کرنے والوں کو گمراہ کرنے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟" بیل سوچ رہا تھا۔

"کوئی چیز بھی اتنی لمبی جست نہیں لگا سکتی۔" ویدہ بائی نے کہا۔

"وہ مخلوق یہاں تک دوڑتی ہوئی آئی اور نشان صرف اُس وقت چھوڑے، جب اس نے دو پاؤں پر چلنا شروع کیا؟"

ویدہ بائی نے ناگواری سے کندھے اُچکائے۔ "میرے خیال میں یہ مخلوق ہر کام کر سکتی ہے۔"

"مگر کتے . . . ." بیل کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"کتوں نے بُو کی پیروی اس مقام تک کی جہاں سے کھوج ملا شروع ہوتا ہے۔ جہاں زمین پر نشان نمایاں تھے وہاں پیچھا نہیں کیا، حالانکہ بُو اس جگہ ضرور ہونی چاہیے تھی۔"

بیل کا خیال تھا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔

"لیکن ایک جانور ـــــ یا آدمی ـــــ اپنی بُو ختم نہیں کر سکتا۔"

"یقیناً نہیں۔" بیل نے کہا "اور پھر جہاں اس نے واضح نشان بھی چھوڑے ہوں۔"

"مگر ایک امکان اور بھی ہے۔" ویدہ بائی نے کہا۔ "جب یہ مخلوق دو ٹانگوں پر چلتی ہے، تو چار ٹانگوں پر دوڑنے والی مخلوق نہیں رہتی۔ اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" بیل نے سرگوشی میں کہا۔

مزید نشان تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ انہوں نے کٹیا کو مرکز بنا کر کوئی تین میل کا چکر لگایا۔ آہستہ آہستہ غور سے دیکھتے ہوئے ویدہ بائی وقتاً فوقتاً زمین کا معاینہ کرنے رُک جاتا۔ وہ گھاس کو پھیلاتا اور زمین کی سختی کا اندازہ کرنے کے لیے اپنی انگلیاں گاڑ دیتا۔ ان کے پاؤں کا کوئی نشان زمین پر نہیں پڑ رہا تھا اور نہ انہیں وہاں کوئی نشان ملا۔ اس دائرے میں بارن کا مکان بھی آ جاتا تھا۔ آخر وہ بے نیل مرام وہیں واپس آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ آسمان پر تاریکی چھا رہی تھی اور بارش کا امکان تھا۔ پھر وہ کچھ بولے بغیر گاؤں کی طرف واپس ہو گئے۔

راستے میں وہ مختلف امکانات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ ویدہ بائی نے یقین نہ کرتے ہوئے بھی مفروضے پر بات بڑھائی: "وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو چار ٹانگوں پر دوڑتی ہے اور اچانک جُون تبدیل کر کے دو ٹانگوں پر چلنے والی مخلوق بن جاتی ہے۔ یہ تبدیل شدہ مخلوق نیم شعوری کیفیت میں چلتی ہے اور شاید اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ اس جگہ کیسے پہنچی۔ وہ ناقابلِ یقین خوف اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ تھوڑا سا فاصلہ اسی نیم شعوری حالت میں طے کرتی ہے۔ پھر اُسے اپنی پہلی شکل میں کیے جانے والے افعال کے ممکنہ نتائج کا احساس ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے تحفظ کے لیے کھوج مٹانے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ محض ایک خیالی سا اندازہ ہے۔ ایسا ممکن نہیں۔"

اب وہ جھاڑیوں میں سے گزر کر پولیس کار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ڈرائیور محوِ خواب تھا اور آہستہ آہستہ خراٹے لے رہا تھا۔ وہ کچھ پینے کے لیے "کنگز ٹورسو" کی طرف ہو لیے۔

آرتن روز اور فوٹوگرافر شراب خانے میں بیٹھے تھے۔ روز کی نوٹ بک میز کے پاس کھلی پڑی تھی۔ دونوں پینے میں مصروف تھے۔

دروازہ کھلا۔ روز مُڑا۔ ویدہ بائی اور بیل شراب خانے میں داخل ہوئے، تو بروس ان کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا۔



"حضرات، آپ اُداس نظر آتے ہیں؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں، میں اُداس ہوں۔" بیل نے کہا۔

"کوئی کامیابی؟" بروس نے پُوچھا۔

"مجھے ایک پائنٹ شراب چاہیے۔" بیل نے کہا۔

"کوئی کامیابی نہیں۔ آہ! کیا اس جانور کا کھوج نہیں ملا؟ آپ کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ آپ اُسے اس طرح آزادانہ پھرنے اور لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت تو نہیں دے سکتے۔" روز نے اپنی نوٹ بک کاؤنٹر پر رکھ دی۔

"آخر سراغ مل ہی جائے گا۔" بیل نے کہا۔

"مل جائے گا! مستقبل کی بات کرتے ہیں آپ۔ وہ مستقبل جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ لوگ کو قتل کرنے کی چھٹی دے رہے ہیں۔"

"کیا آپ کو احساس نہیں کہ پولیس بہت کچھ کر رہی ہے؟" روز نے پُوچھا۔

بروس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"مجھے بیئر دیجیے۔" بیل نے کہا۔

بروس نے کندھے اُچکائے اور پیالہ بھرنے لگا۔

"میں آپ پر اعتراض نہیں کر رہا۔ مسز ریک بہت اچھی خاتون تھیں۔ ان کا شوہر یہاں باقاعدگی سے آیا کرتا۔ یہ ایک خوفناک سانحہ ہے۔"

اُس نے اپنا سر جھٹکا اور پیالہ بیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا آپ فوج نہیں بلا سکتے؟ وہ اسے کہیں نہ کہیں ڈھونڈ نکالے گی۔"

"میں آپ کی تجویز پر غور کروں گا۔" بیل نے کہا۔

"آپ کو کرنا ہی چاہیے۔"

"برانڈی!" ویدہ بائی نے کہا۔

"کیا میں فوج کے سلسلے میں آپ کا حوالہ دے سکتا ہوں؟" روز نے پُوچھا۔

"تم خاموش رہو۔"

"میرے قارئین کو جاننے کا حق ہے۔"

"قارئین! تمہارا خیال ہے لوگ اس چیتھڑے کو پڑھتے ہیں، تمہارا اخبار محض عورتوں کی ننگی تصویروں اور طلاق کے نچے مقدمات کی خاطر خریدتے ہیں۔"

روز جی ہی جی میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔" بروس نے کہا۔ "میں بھی اسی وجہ سے خریدتا ہوں۔"

بروس نے ویدہ بائی کو برانڈی پیش کی۔ ویدہ بائی نے لمبا گھونٹ بھرا۔ دوسرا گھونٹ لیا ہی تھا کہ بارن اندر داخل ہوا۔

"میں نے باہر کار دیکھی تھی۔" اُس نے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں بھاری چھڑی اور ٹویڈ کی ٹوپی تھی۔ وہ ویدہ بائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ بیل تھوڑا سا مُڑا۔

"کیا آپ یہاں تفتیش کر رہے ہیں؟" بارن نے پُوچھا۔

"آپ نے گزشتہ شب کا واقعہ سُن لیا ہوگا۔" بیل نے سوال کیا۔

"کوئی کھوج؟" بارن نے پُوچھا۔

"ہاں، کچھ سراغ ملا ہے۔ مگر اتنا نہیں کہ آگے بڑھا جا سکے۔" ویدہ بائی نے کہا۔

"نہیں! یہ شرم کی بات ہے۔ میرا خیال تھا اب تک آپ کی پُرانی مہارت عود کر آئی ہوگی۔"

"کوئی بھی کھوج کی پیروی نہیں کر سکتا۔" ویدہ بائی نے کہا۔

بارن مسکرایا۔ اُس نے بیئر طلب کی۔ بروس نے بیئر پیش کر دی۔

"آپ کو بھی جلانے جام ہے۔" بیل نے کہا۔

بارن نے انکار میں سر جھٹک دیا۔

"لیکن سُنا ہے آپ پیچیدہ سے پیچیدہ کھوج ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ کیا نہیں؟ یہ آپ کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ویدہ بائی کا کہنا ہے کوئی شخص اس کھوج کی پیروی نہیں کر سکتا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"بلاشک وہ درست کہتے ہیں۔" بارن نے کہا اور مسکرانے لگا۔

"مسٹر بارن، کیا آپ ایک بڑے شکاری نہیں رہے ہیں؟" بروس نے پُوچھا۔

"حضرت میں شکاری ہوں۔ آپ نے ماضی کا صیغہ غلط استعمال کیا ہے۔"

"کیا آپ قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟"

"میں نے کوشش نہیں کی۔"

بروس نے بیل کی طرف دیکھا۔

"حضرات! اگر پولیس ساری نیک نامی اور شہرت خود ہی سمیٹنا نہیں چاہتی تو . . . ." اُس نے کہا۔

"مسٹر بارن نے ہماری مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے اس

سے درخواست کی تھی۔" بیل نے جواب دیا۔ بروس نے پھر بارن پر نظر ڈالی۔

"میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" بارن نے کہا۔

"کوئی تعلق نہیں؟ لوگ مارے جا رہے ہیں اور آپ کو پروا نہیں۔ پاگل تو نہیں ہیں؟"

بارن نے چسکی لی۔

"ہیزل لیک کل رات ہلاک کر دی گئی۔" بروس نے کہا۔ "بڑی ہی اچھی عورت تھی وہ۔ کبھی کوئی برا کام نہ کیا۔"

"ہاں، اس نے کبھی کوئی کام نہ کیا تھا بس۔"

بروس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"مجھے آپ کے اطوار پسند نہیں۔" اس نے کہا۔ "شراب ختم کیجیے اور چلتے پھرتے نظر آئیے۔"

بارن لمحہ بھر نفرت اور غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا اور پھر ہنس پڑا۔

"افسوس! آپ ناراض ہو گئے۔" اس نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

"آئندہ اگر اس شراب خانے میں آئے۔ تو یہ پولیس والے ہی تمہیں مجھ سے چھڑائیں گے۔" بروس نے کہا۔ وہ بھڑک اٹھا تھا۔

بارن نے سنی ان سنی کر دی، دیدربائی کو گھورا اور کہا۔ "اگر آپ میں زندگی کی رمق ہے، تو قاتل کو ضرور تلاش کر لیں گے۔"

وہ مڑا اور اپنی چھڑی فرش پر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔ بروس کی غضب آلود نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

"سنگ دل حرامی!" وہ بڑبڑایا۔

سدز انگڑائی لے رہا تھا۔

"وہ کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔ بارن چلا گیا تھا اور اپنے پیچھے خاموشی کا ایک خلا چھوڑ گیا تھا۔

(۱۱)

علاقے پر خوف و ہراس طاری تھا۔

خوف کی یہ چادر اگرچہ غیر مرئی تھی مگر تھی بہت کرب انگیز۔ تمام علاقے پر اس طرح چھا گئی تھی جیسے بادل آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ یہ کیفیت کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ خوف کی شدت کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس چیز سے خائف ہیں۔ وہ کون سی شیطانی مخلوق ہے جو تین بار چوٹ کر چکی ہے۔ وہ تو اس کے ذکر تک سے ڈرتے تھے۔ ہر قتل خوف میں اضافہ کیے جاتا تھا۔ ہیزل لیک کی موت سے خوف کی یہ شدت انتہا کو پہنچ گئی۔ لوگ اپنے گھروں کو محفوظ قلعے سمجھتے چلے آ رہے تھے۔ ان کا یہ تحفظ تباہ ہو گیا تھا۔ اب کوئی جگہ بھی محفوظ نہ تھی۔ وہ شیطان کسی وقت کسی بھی جگہ پہنچ سکتا تھا۔ کوئی بھی اس کا شکار ہو سکتا تھا۔

قومی اخبار خوف کو مزید ابھار رہے تھے۔ ذہنوں کو جھٹکے دے رہے تھے۔ سنسنی خیزی کے باعث ان کی فروخت بہت بڑھ گئی تھی۔۔۔ لوگ کانپتے ہاتھوں سے اخباروں کو تھامنے کی کوشش کرتے اور خوف ناک شہ سرخیاں ان کی نگاہوں میں پھر جاتیں۔ اخباروں کی اکثریت اس مخلوق کو انسان یا حیوان قرار دیتی رہی تھی، لیکن آئرن رونے اسے بھیڑ مانس کی صورت دے دی تھی۔ ایڈیٹر روز کی کہانی سے بہت خوش تھا۔ اس نے بھیڑ مانس کی فرضی شالی اور بلقان کے غول بیابانی کا ذکر کر کے بیک وقت دہرا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا قاتل کوئی غیر ملکی ہے کیونکہ کم از کم انگریز بھیڑ مانس نہیں ہو سکتے۔ اداریے میں پولیس کی کارکردگی پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔

آئرن رونے بھیڑ مانس کا شوشہ تو چھوڑ دیا تھا، مگر وہ خود بھی اپنی کارگزاری پر مطمئن نہ تھا۔ اس نے لوگوں کے خوف میں اضافہ ہی کیا تھا، حالانکہ ان میں از سر نو احساس تحفظ پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ بازاروں، چائے خانوں، ہوٹلوں، شراب خانوں میں جہاں بھی جاتا، وہاں خوف اور گریز کی فضا چھائی ہوئی پاتا۔ لوگوں کے چہرے زرد اور اداس اداس تھے۔ باتیں کرتے تو کھسر پھسر کے انداز میں۔ قاتل شاید کوئی بھوت ہے یا شیطان۔ اگلا شکار کون ہوگا؟ پولیس کھوج لگا سکے گی یا نہیں؟

ادھر پولیس بے بس ہو چکی تھی۔ جسٹن ہیل تذبذب کی کرب ناک کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہ کر سکا تھا کہ اپنی تفتیش کا ہدف کسی انسان کو قرار دے یا جانور کو۔ گوناگوں توہمات نے ایک عجیب و غریب مخلوق کی صورت اس کے ذہن میں ابھار دی تھی۔ وہ جو انسان اور حیوان کا مرکب تھی۔ آدمی کی طرح چلتی ہے، جانوروں کی طرح دوڑتی ہے۔ اس کے پنجے ایسے ہیں جن سے انسان کا گوشت نوچ لیتی ہے۔ دروازہ کھول سکتی ہے۔ اتنی طاقتور ہے کہ انسان کا سر جسم سے الگ کر کے اپنے ٹھکانے پر لے جاتی ہے۔ اپنی ہیئت ہی نہیں، کھوج اور رنگ تبدیل کر سکتی ہے۔

ہاں دیدربائی ابھی تک پُراعتماد تھا۔ وہ روزانہ بلاناغہ رات کے وقت اس علاقے میں گشت کرتا اور خراب و خستہ واپس آتا۔ رفتہ رفتہ اس کا اعتماد ختم ہوتا چلا گیا۔ رات کے وقت اکیلے گھومتے ہوئے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر رینگنے لگتی۔ اس کے شانے سکڑ جاتے، اس پر ہر وقت یہ اذیت ناک احساس طاری رہتا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ مخلوق اس کا پیچھا کر رہی ہے،



اس کی منتظر ہے۔ کسی بھی لمحے شکار کر سکتی ہے۔ وہ چلتے چلتے مڑ کر بار بار پیچھے دیکھتا۔ کانوں میں دہشت ناک سی آوازیں گونجنے لگتیں۔۔۔ وہ ڈرپوک نہ تھا۔ اس نے کئی جھاڑیوں میں زخمی شیروں کا تعاقب کیا تھا اور حملہ آور بھینسوں کا مقابلہ جرأت سے کیا تھا۔ لیکن اب غیر یقینی کیفیت اس کی جرأت اور عزم ختم کیے دے رہی تھی۔ محض وقار کا خیال تھا کہ وہ جستجو جاری رکھے ہوئے تھا۔

رات کا گشت ختم ہوتا، تو وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آ کر پرسکون محسوس کرتا۔ بستر میں گھس کر سونے کی خواہش اس کی تکان سے زیادہ ہوتی، لیکن اچھی طرح نیند نہ آتی۔ آنکھ لگتی، تو پریشان کن خواب ستاتے۔ منتشر صورتیں اس کے ذہن میں گردش کرتیں۔ ماضی کے واقعات غیر یقینی مستقبل میں گڈمڈ ہو کر عجیب و غریب صورتیں پیش کرتے۔ تیز ہواؤں کی سیٹیاں سنائی دیتیں اور سرد تنہائی کا احساس طاری ہو جاتا۔ پھر دیکھتا اس کے ہاتھ میں رائفل ہے اور وہ مخلوق اس پر جھپٹنا چاہتی ہے۔ وہ رائفل چلانے کی کوشش کرتا، لیکن ہاتھ منجمد ہو کر رہ جاتے۔ پھر وہ اس بدہیئت مخلوق کی بدبودار سانس اپنے چہرے پر محسوس کرتا۔ اس کے ناخن اس کے گوشت میں اترتے ہوئے لگتے۔ اس کی چناتی ٹانگیں اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے سمٹنے لگتیں، اور پھر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ پسینے میں شرابور اپنے بستر پر سکڑا سمٹا پڑا ہوتا۔ انسان سے مشابہ چہرے کی دھندلی سی جھلک اس کے ذہن پر نقش ہوتی اور وہ حیرانی کے عالم میں سوچتا کیا اس بھیڑ مانس کے لیے چاندی کی گولی تیار ہو چکی ہے؟

* * *

دیدربائی ہوٹل کے لاؤنج میں آئرن رونے کے ساتھ بیٹھا تھا کہ بارن آ گیا۔

"صبح بخیر!" بارن نے کہا۔

وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ اس نے ٹوئیڈ کا بھدا سا لباس پہن رکھا تھا۔ عمدہ شکاری چشمہ شانے پر لٹک رہا تھا، جیسے ہنے کوٹ کے کالر پر دھات کا بیج آویزاں تھا۔

"میں گھڑ دوڑ دیکھنے نیوٹن ایبٹ جا رہا ہوں۔ سوچا شاید آپ بھی ساتھ چلنا۔"

لمحے بھر کو خیال آیا کیوں نہ اس ہلاکت آفریں ماحول سے دور نکل جائے، مگر پھر سوچا وہ جہاں کہیں ہوگا ذہن پر تو یہی ماحول ہی مسلط رہے گا۔

"نہیں، شکریہ! اب یہ باتیں مجھے زیادہ پسند نہیں۔"

"جان! آپ پریشان نظر آتے ہیں۔"

"درست ہے۔"

"ابھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا؟"

"نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ ہر رات باہر جاتا ہوں۔ مگر جھلک تک نظر نہیں آتی۔ نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ البتہ بعض اوقات محسوس کرتا ہوں وہ مجھ سے بالکل قریب ہے۔ مجھے دیکھ رہی ہے اور مجھ پر ٹوٹ پڑنے کی تاک میں ہے۔ بالکل ویسا ہی احساس جیسا کسی زخمی بھینسے کا تعاقب کرتے وقت طاری ہوتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔"

"ہاں، میں اس احساس سے آشنا ہوں۔" بارن نے کہا۔

"اگر مجھے یقین ہوتا۔۔۔۔"

"یقین؟ کس بات کا یقین؟"

"اگر مجھے یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ وہ مخلوق میری منتظر ہے، تو بہتر تھا۔ مجھے زیادہ سکون ملتا۔"

"افسوس ہے جان! اعصاب کی قوت تو سلب ہو سکتی ہے، مگر وجدان کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مخلوق موجود ہے اور آپ کی منتظر، تو وہ ضرور آئے گی اور گولی چلانے میں پہل آپ کو کرنا ہوگی۔ بے یقینی کا مطلب ہے آپ کو اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔"

اس نے دیدربائی کی آنکھوں میں جھانکا۔ دیدربائی کو اپنی پشت کے مہروں پر سرد انگلیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"جان! آپ نے سب کچھ ضائع کر دیا ہے۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "وہ مخلوق جب چاہے گی آپ کو آ لے گی۔ وہ انتظار کرے گی آپ سست پڑ جائیں گے اور وہ آ دبوچے گی۔"

دیدربائی اور بارن نے ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ روز منہ کھولے انہیں تک رہا تھا۔ دیدربائی نے نگاہیں جھکا لیں۔ ایک ناپسندیدہ خیال اس کے ذہن میں آیا۔

"شاید!" اس نے کہا۔

"مشکل یہ ہے جان آپ خواہ مخواہ الجھ گئے ہیں۔" بارن نے لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ "میں نے دیکھا ہے خوف کے باعث لوگ چوکنے ہو گئے ہیں۔ کچھ کسان اپنے کھلیانوں پر جاتے وقت بندوقیں ساتھ رکھتے ہیں۔ خانہ دار عورتیں پُرہجوم مقامات پر بھی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں۔ وہ چوکنے اور زندہ ہیں، کیونکہ موت کا امکان ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ یہ اموات انجام کار سودمند ثابت ہوں گی۔ بس جذبات سے عاری ہو کر نظر ڈالیے۔ چند بے کار جانیں ضائع ہو جائیں گی، مگر ہزاروں افراد میں جو کسی اور زندہ بچنے کی مسرت پیدا ہو گئی ہے۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"لیکن . . . ." ویدربائی نے کچھ کہنا چاہا، مگر بارٹن نے بات کاٹ دی۔

"یہ ایک نقطۂ نظر ہے آپ اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں . . . . لیکن سرِدست چھوڑیے یہ بتائیے میرے ساتھ چلیں گے یا نہیں؟"

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔" ویدربائی نے جواب دیا۔

مقابل دروازے میں بیل نمودار ہوا اور بارٹن کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ بارٹن کھڑا ہو گیا۔

"اچھا، میں چلتا ہوں۔" اُس نے کہا۔

"کیا یہ پاگل ہے؟" بارٹن چلا گیا تو روز نے پوچھا۔

"مجھے اس کی باتوں پر اکثر تعجب ہوتا ہے۔"

بیل بیٹھ گیا۔

"کوئی خبر؟" روز نے پوچھا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ فوج سے مدد لی جائے۔" بیل نے کہا۔

وہ ویدربائی سے مخاطب تھا، لیکن روز نے اپنی نوٹ بک نکال لی۔

"انہیں کس چیز کی تلاش کے لیے کہا جائے گا؟" ویدربائی نے پوچھا۔

"خدا ہی جانتا ہے۔"

روز نے پوری دیانت داری سے یہی بات قلم بند کر لی۔

(۱۲)

ویدربائی معمول کے مطابق رات کی گشت میں مصروف تھا۔ پہلے ندی کے ساتھ ساتھ چلتا پھر واپس مڑ کر چٹان کے اُوپر سے ہو کر گلی عبور کر کے ذیلی سڑک پر آ جاتا۔ اُسے اپنے دائرۂ کار کو وسعت دینے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ یہ دائرہ ان تینوں مقامات پر محیط تھا جہاں قاتل نے وار کیا تھا۔ اب اس نے گشت کا آغاز دوسری سمت سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ مخلوق واقعی اُس کا انتظار کر رہی ہے تو دوسری طرف سے اس کے پاس پہنچ کر وہ اُس کو حیران کر سکتا تھا۔

غروبِ آفتاب کے وقت وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ گرم اور بادلوں کے بغیر۔ تمام علاقہ اس کے سامنے چاند کی روشنی میں لپٹا پڑا تھا۔

وہ سڑک کے کنارے ایک موٹر کار کے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ آرن روز بھاگتا ہوا آن پہنچا۔ "کچھ دُور تک آپ کے ساتھ چلوں تو ناگوار تو نہ گزرے گا؟"

"ضرور چلیے۔"

انہوں نے شاہراہ عبور کی اور ذیلی سڑک کی طرف بڑھے۔

"یہ ہتھیار بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے۔" روز نے کہا۔

"ہاں، مگر استعمال کا موقع ملے تو۔"

"آپ کا حوصلہ کچھ ٹوٹا ہوا لگتا ہے۔"

ویدربائی کے چہرے پر ناگواری کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔

"آج رات میں آپ کے ساتھ رہوں، تو . . . . ."

"قطعاً نہیں۔" ویدربائی نے فوراً بات کاٹ دی۔

"میں خوف زدہ نہیں ہوں۔"

"یہ بات نہیں۔" ویدربائی نے کہا "میں اپنے سوا کسی اور کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں اور آپ ساتھ ہوئے تو یہ مخلوق چوکنی ہو جائے گی۔"

"ہاں، مجھے اس کا اندازہ ہے۔ میں آپ کا مداح ہوں کہ آپ اکیلے ان کے پیچھے لگے ہیں، یہ تلاش ختم ہو جائے گی تو میں آپ کی ہمت پر ضرور مضمون لکھوں گا۔"

ویدربائی نیچے دل سے مسکرایا۔ اب وہ گلی کے موڑ پر آ گئے تھے اور جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک بوڑھا سائیکل سوار پاس سے گزرا۔ وہ چپ چاپ چلتے ہوئے کنگز ٹورسو پہنچ گئے۔

"مہم پر روانگی سے پہلے کچھ پینا پسند کریں گے؟" روز نے پوچھا۔

ویدربائی نے آسمان پر نظر ڈالی۔ ابھی تک مشرق میں دھیمی سی روشنی باقی تھی۔ کچھ دیر اور انتظار کرنے کا یہ اچھا بہانہ تھا۔ "بہت اچھا۔" اس نے کہا۔

شراب خانے میں صرف ایک گاہک تھا۔ وہ تھا گرانٹ سابق کان کن۔ بیئر کا پیمانہ لیے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں آتے نہیں دیکھا۔ ویدربائی شراب پی کر نکلا، مشرق میں روشنی زائل ہو چکی تھی۔

"یہ ایک اچھا آدمی ہے۔" روز نے کہا۔

"ہاں، مجھے اندازہ ہے۔" بروس نے کہا۔

"میرے پاس بندوق ہوتی تو میں اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔"

"تمہیں بندوق کی کیا ضرورت ہے؟ اتوار کے اخبار میں اپنی کہانی کچھ لغویات کا پلندہ!"

روز بحث کے موڈ میں نہ تھا۔

"بہرحال! کم از کم انگلینڈ میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ شاید کوئی باہر سے آیا ہو بہرحال کچھ نہیں کہا جا سکتا یا یہ کوئی اور جانور ہے جو کسی عجائب خانے سے چھوٹ نکلا ہے۔"

گرانٹ نے نگاہ اُوپر اُٹھائی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔



"وہ جانور نہیں۔" اس نے کہا۔ اُس کی آواز کھوکھلی تھی۔

"تمہارے خیال میں کیا چیز ہے؟" بروس نے پوچھا۔

"وہ وہ . . . زمین کے اوپر تلاش کر کے تسلی کر رہے ہیں میں صرف یہی . . . . ہوں۔"

"کیا وہ غار میں رہتی ہے؟" روز کا سوال تھا۔

"غار میں نہیں، زمین میں۔ تم نہیں جانتے جو شخص زمین کے نیچے نہیں گیا اسے کچھ معلوم نہیں۔ وہاں عجیب و غریب چیزیں پائی جاتی ہیں۔"

"کس قسم کی؟" روز نے پوچھا۔

گرانٹ نے خالی پیالے کی طرف دیکھا اور روز کاؤنٹر پر جا کر پیالہ بھروا لایا۔

"ہاں عجیب چیزیں ہیں۔ تم انہیں سرنگوں اور خندقوں میں حرکت کرتے سن سکتے ہو۔ چٹانوں میں بھی۔ عجیب و غریب مخلوقات! بدبودار! سرنگ . . . ملتی ہیں تو کئی روز تک بدبو آتی رہتی ہے۔"

"کیا تم نے کوئی دیکھی ہے؟"

"میں نے تو نہیں دیکھی، مگر ایک اور شخص نے دیکھی تھی . . . . انہوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔" اس نے اچانک روز کی جیکٹ پکڑ لی اور اس کا چہرہ اپنے قریب کھینچ کر پھنکارتے ہوئے آخری الفاظ ادا کیے — روز اس کے مضبوط ہاتھوں میں کسمسا کر رہ گیا۔

"ایک بار انہوں نے ایک شخص کو اپنے کیچڑ سے بھرے ہوئے پنجوں میں . . . لیا اور کھینچ کر چٹانوں میں لے گئیں۔ پھر ہم جو کھینچا تو وہ ختم ہو گیا۔ انہیں ان . . . انوں سے نفرت ہے جو اُن کے گھروں میں جا پہنچتے ہیں۔ آدمی زمین کھود کر اور دھماکے کر کے انہیں پریشان کرتے ہیں۔"

"کان کنوں نے ان کا ذکر لوگوں سے کیوں نہیں کیا؟"

"ہم نے بتایا تھا لیکن بات دبا دی گئی۔ کانوں کے مالک اس بات کو شہرت دینا نہیں چاہتے۔ وہ سیاست دانوں سے ملے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ زیرِ زمین کیسی کیسی بلائیں ہیں تو کوئی بھی کان کنی پر آمادہ نہ ہو۔ یہ کانوں کے مالک بڑے ظالم اور عیار ہیں۔ وہ یہ تک نہیں بتاتے کتنے کان کن چٹانوں نے ہڑپ کر لیے ہیں۔"

گرانٹ نے روز پر گہری نظر ڈالی اور تڑپ کر اس کے ہاتھوں سے نکلا۔

"تو تمہارا خیال ہے یہ قاتل زمین کے نیچے سے آتی ہے؟"

"اور کہاں سے آ سکتی ہے؟ اس جگہ کو کھود دیں تو وہ یہاں سے بھی نکلنے لگیں گی۔ وہ ہزاروں، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔"

"کیا ایسی مثالیں بھی ہیں جنہیں اخبار میں چھاپا جا سکے؟"

گرانٹ مسکرایا۔ بیئر کے ایک گلاس کے عوض وہ بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر اپنی میز پر واپس چلا گیا۔

"اس کی بات کو اہمیت نہ دو۔" بروس نے کہا۔ "یہ اس پاگل بارٹن کا نوکر ہے اور اپنے آقا کی طرح خبطی۔"

روز سوچنے لگا اپنی کہانی میں کیوں نہ ان زیرِ زمین عناصر کو شامل کر لے۔

"اچھا، میں چلتا ہوں۔" اس نے اسٹول سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"پیدل جاؤ گے؟" بروس نے پوچھا۔ روز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"محتاط رہنا۔"

"ہاں، میں تیز رفتاری سے جاؤں گا۔"

"عجلت سے کوئی فائدہ نہ ہو گا، البتہ احتیاط رکھنا۔" گرانٹ نے کہا۔

روز نے گھبرا کر اس پر نظر ڈالی۔

"تم اسے نہیں دیکھ سکو گے۔ وہ زمین پر نہیں چلتی۔ اچانک تمہارے قدموں کے نیچے سے نکل آئے گی۔ وہ اپنے شکار کو اسی طرح قابو میں کرتی ہے۔"

روز شراب خانے سے نکلا تو بُری طرح کانپ رہا تھا۔ گرانٹ اپنا گلاس بھروانے جنگلے کی طرف بڑھا۔

"کیا زمین کے نیچے واقعی ایسی چیزیں ہیں؟" بروس نے اپنے تہ خانے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیوقوف نہ بنو۔ بیئر بیئر ہی ہے۔"

روز تیزی سے چل کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہیں سامنے تھیں۔ گاہے گاہے پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتا۔ رات کچھ زیادہ ہی تاریک معلوم ہوتی تھی، حالانکہ آسمان پر بادل نہ تھے اور چاند چمک رہا تھا۔ طرح طرح کے خیال اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ . . . ایک دیو قامت سایہ سامنے نمودار ہوا۔ خوف کے مارے اس . . . . . اور اس نے چھلانگ لگائی۔ سائے نے بھی یہی حرکت کی۔ وہ خوف . . . . . . پھر کسی قدر سکون کا سانس لیا۔ یہ اس کا اپنا ہی سایہ تھا جو سامنے سے آتی ہوئی کار . . . روشنی کے باعث اس کے آگے آ گیا تھا۔ وہ ایک طرف ہو گیا تاکہ کار گزر جائے۔ . . . . اس کا دل اُچھل رہا تھا۔

موٹر کار اس کے پاس سے گزر گئی۔ پولیس کار تھی۔ وہ پھر چلنے لگا۔ دماغ میں آنے والے خیالات سے توجہ ہٹانے کے لیے اس نے اپنی نگاہیں ٹیلیفون بکس پر گاڑ دیں جس کی سُرخ روشنی چند سو گز کے فاصلے پر . . . سڑکوں کے مقامِ اتصال پر نظر آ رہی تھی۔

جلد ہی اسے قریب نظر نے آ لیا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا . . . . . آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس نے تیز چلنا شروع کر دیا۔ پھر . . . . . جھاڑیوں کی دوسری طرف چل رہی ہے اور وہ . . . زیادہ تیز رفتار

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں جھاڑیاں ایک دوسری سے جدا ہوتی تھیں، تو موت کا بھیانک چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ قاتل اس کے برابر برابر چل رہا تھا۔ وہ تنگ گلی میں اندھا دھند دوڑنے لگا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر تحفظِ ذات کی جبلت غالب آگئی۔ اس نے اپنی دوڑ اور تیز کر دی۔ پھر وہ ٹیلیفون کیبن کی طرف بھپٹا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ بند ہوتے ہوتے دروازے سے کوئی چیز خطرناک انداز میں ٹکرائی۔ رونے ریسیور اٹھایا تاکہ اپنی نجات کے لیے کسی کو پکارے اتنے میں دروازہ ایک دم کھل گیا اور قاتل نے اسے باہر کھینچ لیا۔

• • •

ویدبائی چٹانی سلسلے کی چوٹی پر پہنچا اور نیچے نگاہ ڈالی۔ چاندنی میں ندی گھونگے کی طرح بل کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ درمیان میں کھلا میدان چاندنی میں نہا رہا تھا۔ یہ پہلی رات تھی کہ چاند اس کا ساتھی تھا لیکن نیچے ہر شے ساکن تھی۔ اس طرف آگے بڑھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس نے پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ذیلی سڑک پر واپس پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

اچانک ایک خیال سے اُسے جھرجھری سی آگئی۔ کتنی بڑی حماقت کی تھی اُس نے۔ پہاڑی سلسلے پر چڑھتے ہوئے اُس نے یہ نہ سوچا کہ قاتل یہیں کہیں چھپا ہُوا نہ ہو۔ وہ تو خیریت گزری ورنہ وہ اس وقت سر کٹی لاش کی صورت میں پڑا ہوتا۔ ایسی غلطی اس نے ماضی میں کبھی نہ کی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ بائرن ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ تناؤ کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں کام جاری رکھنا موت کو دعوت دینا تھا اور وہ ابھی مرنا نہ چاہتا تھا۔

ویدبائی چوٹی پر سے اُترا اور اُسی راستے پر ہو لیا جس سے آیا تھا۔ اُس کے شانے بوجھل ہو گئے تھے اور وہ تھک گیا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ کلگز ٹو سو پہنچا تو وہ بند تھا —— روشنی گل ہو چکی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ ناکامی اس کے چہرے سے عیاں تھی اور وہ اس وقت کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ بڑی احتیاط سے گلی کے بالکل وسط میں چلنے لگا۔ کبھی کبھار اِدھر اُدھر دیکھ لیتا۔ سامنے ٹیلیفون کیبن تھا لیکن اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ حتیٰ کہ وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ اتنا قریب کہ اس کے اندر ایک ڈھیر سا پڑا نظر آنے لگا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ دروازہ کسی قدر کھلا تھا اور ایک ٹانگ باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بے سر کی ایک لاش پڑی تھی۔ مقتول کے خون آلود کپڑوں سے لاش شناخت کرنے میں اسے ذرا دقت نہ ہوئی۔

اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ چونگا پکڑ کر پولیس کو اطلاع دے

معاً نفرت کا لاوا اس کے ذہن سے اُبلنے لگا۔ اپنے آپ سے نفرت۔ ناقابلِ برداشت نفرت! اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جو مدد حاصل کرنے کا آرزومند تھا اور خود کو کوستا ہُوا بُوتھ سے باہر نکل آیا۔ گلی سے دور جا کر کھوج تلاش کرنے لگا۔ وہاں نشان موجود تھے۔ اسی شیطانی مخلوق کے نشان جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔ وہ ان نشانوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور پھر وہ معمول کے مطابق ختم ہو گئے۔ آگے وہی منظر تھا جس کی عادی اس کی آنکھیں ہو چکی تھیں۔ گھاس کے ٹوٹے ہوئے ڈنٹھل، کائی کے بکھرے ہوئے اجزا اور ایک پاؤں کا صرف ایک نشان۔

(۱۳)

بائرن جیسے اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور عجیب انداز میں مسکرایا۔

"آپ بڑے چپ چاپ آگئے۔" اُس نے کہا اور اپنی کلہاڑی دیوار کے ساتھ لٹکا دی۔ "میرا خیال تھا آپ کبھی نہیں آئیں گے۔"

ویدبائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اپنی بندوق پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی جس کی نالی چاندنی میں چمک رہی تھی۔ بندوق کا رُخ زمین کی طرف تھا لیکن اس کا سیفٹی کیچ اُتار دیا گیا تھا۔

"گھڑ دوڑ بہت شاندار تھی۔ افسوس آپ شریک نہ ہوئے۔ دو گھوڑے مارے گئے۔ ایک جاکی کی گردن اور ایک گھوڑے کی کمر ٹوٹ گئی۔"

"بائرن! وہ کہاں ہے؟" ویدبائی کی آواز میں ہلکا سا تحکم تھا۔

"کیا چیز؟ جان!"

"وہ کیا چیز ہے، میں نہیں جانتا لیکن مجھے اس کی تلاش ہے۔ میری بات سنجیدگی سے سنو بائرن! ضروری ہوا تو میں آپ کو ہلاک بھی کر سکتا ہوں۔"

"یہ اچھی بات ہے جان! آپ کو بہت پہلے نشان شناخت کر لینے چاہئیں تھے۔"

"بڑی احتیاط کے ساتھ نشان ثبت کیے گئے تھے کیا آج رات آپ نے ان کی پیروی کی یا اندازہ لگایا؟"

"مجھے شروع سے اندازہ تھا، مگر آج رات ایک بات کا شدید احساس ہوا شاید آپ نے اشاروں کنایوں میں وہ بات بتائی بھی ہو جو مقناطیس کی طرح مجھے یہاں کھینچ لائی۔"

"جی نہیں، یہ آپ کے تجربے اور مہارت کا کرشمہ ہے۔ بات ذرا سی ہے یعنی شکاری کی جبلت۔" بائرن کے لہجے میں احترام اور محبت کا عنصر نمایاں تھا۔



"کچھ پتہ ہے میں نے ایسا کیوں کیا؟"

"خوب جانتا ہوں۔"

"کیا اب بھی مجھے خبطی سمجھتے ہیں؟ بہرحال یہ تو تسلیم کریں گے کہ میں ہوشیار بھی ہوں۔ میں نے زندگی سے عاری ان گنواروں کو زندہ رہنے کا گُر بتا دیا ہے۔" بائرن کے ہاتھ کلہاڑی کے دستے پر بے چینی سے متحرک تھے۔

"اگر وہ بہادر ہوتے، تو میں انہیں زندہ رہنے دیتا۔"

ویدبائی کی انگلی ٹریگر پر مچل رہی تھی۔ "وہ چیز تھی کیا؟" اس نے پوچھا۔

"بات سادہ سی تھی۔ میں نے مختلف جانوروں کے پنجے لے کر پرانے جوتوں کے نیچے باندھ لیے تھے۔ ہے نا سادہ مگر ہوشیاری کی بات! آپ آدھا پنجہ ریچھ کا اور آدھا شیر کا دیکھ کر اسی میں اُلجھ گئے اور دوسرے نشان نظر انداز کرتے رہے۔"

ویدبائی کو جیسے یاد آگیا۔ "برفانی بھیڑیا؟" اس نے سوال کیا۔

"خوب بہت خوب، جان! یاد ہے نا ہم نے اکٹھے اس کے کھوج کا مشاہدہ کیا تھا۔ دس سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ آپ نے کہا تھا برفانی بھیڑیے کو مانوس نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی یہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن آخرکار میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اُسے سدھایا نہیں، بلکہ خود اس کی سطح پر اُتر گیا۔ اب وہ جانتا ہے اس کی زندگی میرے ساتھ وابستہ ہے۔ ہم اکٹھے شکار کھیلتے ہیں، برابر کے ساتھی بن کر۔"

"اُف خدایا!" ویدبائی چیخ اُٹھا۔

"کتنی سادہ سی بات تھی یہ! لیکن جان! سوال یہ ہے اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ آپ کو مزید موقع نہیں ملے گا۔" ویدبائی نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا اور بندوق سیدھی کر لی۔

"میرا مطلب آپ نہیں سمجھے؟ میں ڈرپوک نہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ میرا خیال تھا میرا مقابلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب دیکھا کہ آپ ہل گئے ہیں، تو سخت مایوسی ہوئی۔ اچھا آپ مجھے خود ہلاک کریں گے یا پولیس کو بلائیں گے۔ آپ کا فیصلہ بتائے گا اس انسان میں کتنی جان باقی ہے؟" بائرن کا لہجہ تیکھا ہو گیا تھا

ویدبائی خاموش رہا۔

"آئیے، میں آپ کو اپنے خونخوار ننھے دوست سے ملاؤں۔" بائرن نے اچانک دیوار سے لٹکتے ہوئے کہا۔ کلہاڑی ہاتھ میں پکڑی، مڑ کر چلا۔ ویدبائی اس کے پیچھے ہو لیا۔ چمکتی ہوئی بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ مختلف کمروں سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں سے اُترے اور پھر وہ تہ خانے میں کھڑے تھے۔

برفانی بھیڑیا اپنے پنجرے میں غرّایا۔ بنگلے میں اس کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ بائرن پنجرے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ویدبائی نے محسوس کیا درندے کی آنکھوں میں بلا کا مقناطیسی اثر ہے۔ ویدبائی نے سامنے نظر دوڑائی، تو دہشت رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ شاہ بلوط کی تختی پر تین انسانی سر رکھے تھے۔ ان کے ہونٹ پیچھے کو مڑے ہوئے تھے۔ کھوپڑیوں میں آنکڑے ڈال کر انہیں چھت سے لٹکا دیا گیا تھا۔ ایک چہرے سے ویدبائی آشنا تھا۔ اکرن روز کا سر خاموش انقلاب کا نقیب تھا۔ ناقابلِ بیان خوف چہرے پر منجمد ہو گیا تھا۔ کٹی ہوئی گردن سے خون کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔

"یہ میرے تمغے ہیں۔" بائرن نے فخریہ لہجے میں کہا۔

برفانی بھیڑیے نے اپنے خم دار پنجے باہر نکالے۔ بائرن نے اُس کی گردن سہلائی، تو اس نے اپنے پنجے اندر کر لیے۔

"اچھا، تو کیا خیال ہے؟" بائرن نے پوچھا۔ "یہ بہت تیزی سے جھپٹتا ہے جان! ایک گولی چلانے کا وقت بھی شاید ہی ملے اور میں بھی تیزی سے آتا ہوں۔"

"یہاں نہیں!" ویدبائی نے کہا۔

بائرن کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

ویدبائی نے لیور دبایا۔ گولیاں گرنے لگیں اور میگزین خالی ہو گیا۔ اب اُس نے دو گولیاں چیمبر میں ڈالیں۔ "اپنے دوست کو لاؤ!" اُس نے کہا۔

"ٹھیک ہے جان! میں نے آپ کا غلط اندازہ لگایا۔"

برفانی بھیڑیے کی نگاہیں ویدبائی پر مرکوز تھیں۔ اُس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

"تو ہاں بائرن، چٹانوں کی طرف چلو۔ وہاں تم دونوں سے دو دو ہاتھ ہوں گے۔"

"خوب!"

ویدبائی زینے کی طرف بڑھا۔ بائرن نے سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔ اور پھر ویدبائی اندھیرے میں پہاڑی سلسلے کے دامن میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس کے اعصاب پُرسکون تھے۔ اس علاقے کی تمام جزئیات اور تفصیلات اس کے ذہن پر مرتسم تھیں۔ بادل کا ایک ٹکڑا چاند کی طرف بڑھ رہا تھا جونہی یہ چاند کو ڈھانپ لے گا رات تاریک ہو جائے گی۔ ویدبائی نے تاریکی کا خیر مقدم کیا، کیونکہ اُسے روشنی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ بائرن کو کچھ چکا تھا اور بائرن اُسے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ زندہ تھا اور اس کی بندوق میں صرف دو گولیاں تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی کا وسیع سمندر تھا جس سے
ہواؤں کی بھٹکی ہوئی چیخیں سنائی دے رہی تھیں

# لرزہ خیز طوفان

حسن عا



انیسویں صدی عیسوی کا پندرھواں سال اپنے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں زمانے کے ان گنت نشیب و فراز لیے رخت سفر باندھ رہا تھا کہ ہابرگ کے ایک دیہاتی گھرانے میں سیپی جاگتی، بھوری آنکھوں والی گڑیا، گریس ڈارلنگ نے جنم لیا۔ یہ مختصر سا گھرانا مدتوں سے براؤنسمین کے سرسبز و شاداب جزیرے کے کنارے آباد تھا۔ ولیم ڈارلنگ اپنی بچی کی پیدائش سے صرف چند ہفتے پہلے وہاں کے لائٹ ہاؤس کا نگران مقرر ہوا تھا۔ اسی اداس اور سنسان مقام پر گریس پروان چڑھی اور یہیں اس نے سمندر کے دلفریب



موت اور ہولناک تلاطم سے محبت کرنا سیکھا ——————

ارلنگ کا گھرانا اور اس کے ہمسائے پیشہ ور ماہی گیر تھے۔ سمندر سے ان کی آشنائی بہت پرانی تھی۔ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر وہ دور دور تک سمندر کھنگالتے پھرتے۔ کبھی کبھار اگر ان کی کشتی طوفانی لہروں کی نذر یا کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی، تو اسے خدا کی مرضی سمجھ کر خاموش ہو جاتے۔ وہ سبھی تقدیر کے قائل تھے۔ بسا اوقات بعض گھرانوں کو اپنے افراد کے غرق ہو جانے کا سخت قلق ہوتا، لیکن وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔

گریس بڑی نرم و نازک بچی تھی، اپنے تند مزاج بھائیوں سے قطعی مختلف، اپنی نزاکتِ طبع کی بدولت اکثر نزلے اور کھانسی میں مبتلا رہتی۔ جزیرے میں پرانی طرز کا ایک چھوٹا سا سکول تھا جس میں گریس اور دوسرے بچے پڑھنے جاتے تھے، لیکن وہ اکثر اپنی علالت کی وجہ سے غیر حاضر رہتی۔ اس کو تو اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کودنے کا بھی بہت کم موقع ملتا تھا۔ اسے بس ایک چیز سے دلچسپی تھی اور وہ تھا نیلگوں سمندر۔ عمر کی رفتار کے ساتھ ساتھ سمندر اس کے قلب و نظر میں سماتا چلا گیا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ پہروں کھڑکی سے لگی سمندر کی موجوں کا نظارہ کرتی رہتی۔ مچھلیاں پکڑنے والی کشتیوں کو سمندر میں جاتے اور ساحل کی طرف لوٹتے اور ان کے رنگا رنگ بادبانوں کو ہوا میں پھڑپھڑاتے دیکھتی، تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ کبھی کبھار وہ خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی، یوں محسوس ہوتا کہ مرغابیوں کے غول کے غول سپید جھاگ اڑاتی ہوئی لہروں پر دیوانہ وار جھپٹ رہے ہیں اور دور بہت دور افق پر کئی سفینے شاہانہ انداز میں خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

گریس کا جغرافیائی علم بس نام کو تھا، لیکن جب وہ بڑے بڑے بحری جہازوں کو آتے جاتے دیکھتی، تو اس کا ننھا سا دل بلیوں اچھلنے لگتا اور وہ یہ معلوم کرنے کے لیے بیتاب ہو جاتی کہ دور دراز کا سفر کرنے والے یہ سفینے کون کون سی بندرگاہوں کی سیر کو نکلے ہیں۔

جزیرے میں طوفانوں کا منظر بھی بڑا دیدنی تھا۔ آئے دن شوریدہ سر موجیں مستانہ وار بڑھتی، اچھلتی، چٹانوں سے ٹکرا کر سپید جھاگ کی سطحِ سمندر پر جا بجا سیمیں چادریں بچھاتی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھر ابھرتیں اور جھم جھم دھاڑ مچاتی دور دور تک نکل جاتیں۔ گریس کیف بے خودی میں غرق پھٹی پھٹی نظروں سے اس منظر کو دیکھتی تو اس کے دل میں ان متلاطم موجوں سے کھیلنے کی آرزو ابھرتی اور ایک ٹیس بن کر اس کے کانپتے ہوئے رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔ سمندر کا موسم لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا۔ ابھی آسمان سیاہی مائل ہے، آنکھ جھپکتے ہی سورج کی کرنیں بادلوں کو چیرتی ہوئی سمندر کے نیلگوں سینے پر پھیلنے لگتیں۔ مطلع ذرا ابر آلود ہوتا، تو موجیں گہری نیند سے بیدار ہو کر چیختی چلاتی شور و غل مچاتی چٹانوں سے ٹکرانے لگتیں۔ تیز و تند ہوائیں ایسی ڈراؤنی سیٹیاں بجاتیں کہ جزیرے کے باسی کانوں میں انگلیاں ڈالے کواڑ بند کر کے گھروں میں دبک جاتے۔ کبھی ہواؤں کے شدید تھپیڑوں سے در و دیوار کانپنے لگتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے بے رحم ہوائیں لائٹ ہاؤس کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گی۔ یہ طوفانی کیفیت آن کی آن میں سمندر کی پراسرار گہرائیوں میں ڈوب کر رہ جاتی اور موجوں پر سکوتِ مرگ طاری ہو جاتا۔ ہواؤں میں بھی نسیم بہار کی سی نرمی آ جاتی، افق پر قوس قزح نمودار ہوتی اور سمندر کی پرسکون دلکشی میں مقناطیسی جاذبیت پیدا ہو جاتی۔

ولیم ڈارلنگ کتابوں کا کیڑا تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ اپنی بچی کو مختلف کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتا۔ گریس بھی بڑی دلچسپی سے سنتی، مگر بسا اوقات ایسے سوالات کرتی کہ اس کے باپ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کا دماغ چکرا جاتا۔ موضوع چاہے جو بھی ہوتا، گھوم پھر کر سمندر کے مدوجزر، تند ہواؤں اور تیز دھاروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ آخر ایک دن ڈارلنگ تنگ آکر چلا اُٹھا:

"بھلا تمہیں اِن باتوں سے کیا واسطہ؟ جب دیکھو بس یہی تند ہواؤں، طوفانوں اور چٹانوں کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔"

"ابا جان، میں کیا بتاؤں۔" اتنا کہہ کر گریس خاموش ہو گئی۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی —— کاش وہ لڑکا ہوتی، تو آج اس کی اُمنگوں پر کوئی اُنگلی نہ اٹھاتا۔ اُسے باپ نے کشتی کھینا سکھا دیا تھا، لیکن ساتھ ہی تاکید کر دی تھی کہ اُس کا اوّلین فرض گھر بار کی دیکھ بھال اور گھر والوں کی خدمت کرنا ہے۔

اب وہ سترہ برس کی ہو چکی تھی اور اپنے باپ کے چھوٹے موٹے مگر ضروری سرکاری کاموں میں بخوبی ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس سلسلے میں اسے بار بار لائٹ ہاؤس کی بل کھاتی ہوئی سیڑھی پر چڑھنا اُترنا پڑتا۔ یہ سیڑھی اُس کمرے سے ملحق تھی جس میں رات کے وقت جہازوں کو راستہ دکھانے کے لیے ایک بہت بڑا لیمپ روشن رہتا تھا۔

گریس جب انجان تھی تو ان قیامت خیز طوفانوں سے اس کا جی خوب بہلتا تھا، لیکن اب ہوش سنبھالنے کے بعد وہ ان سے خوفزدہ سی رہنے لگی۔ رات کے وقت جب کبھی تیز و تند ہواؤں کے ہنگامے سے اس کی آنکھ کھل جاتی وہ بحری مسافروں کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگتی۔ سورج طلوع ہوتا تو کھڑکی سے جھانک کر سمندر کا نظارہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔ بس یہی خوف رہتا کہیں کسی تباہ شدہ جہاز کے ٹکڑوں پر نظر نہ پڑ جائے۔

صبح کا ناشتہ ہمیشہ گریس ہی تیار کرتی تھی۔ ۶ ستمبر ۱۸۳۸ء کو جب وہ ناشتے کے لیے اٹھی تو اس بات سے قطعاً بے خبر تھی کہ اس کی زندگی کا ناقابلِ فراموش دن آپہنچا ہے۔ اُس روز مطلع ابر آلود تھا اور سمندر کا مزاج ذرا برہم نظر آتا تھا۔ متلاطم موجیں لائٹ ہاؤس کی چٹان سے بار بار ٹکرا رہی تھیں اور سفید جھاگ سطحِ سمندر پر پھیلتا جا رہا تھا۔ چھوٹا ولیم کسی قریبی گاؤں میں چند روز کے لیے سیر سپاٹا کرنے گیا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ڈارلنگ لائٹ ہاؤس چلا گیا اور گریس اور اس کی ماں روزمرّہ کی طرح گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ سہ پہر کے وقت گریس کپڑے استری کر رہی تھی کہ اس کا باپ مُنہ لٹکائے زیرِ لب کچھ بڑبڑاتے اندر داخل ہوا اور گریس سے کہنے لگا:

"بیٹی، خدا خیر کرے، خوف ناک طوفان کے آثار نظر آ رہے ہیں۔"

گریس نے خوفزدہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھی موسم کے بارے میں اس کی رائے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یقیناً طوفان آنے والا ہو گا؛ تاہم اس نے یونہی اُلجھنے کی کوشش کی:

"ایسی کوئی بات تو نہیں ہے ابا جان،" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی چند منٹ پہلے تو مطلع بالکل صاف تھا۔"

گریس کے الفاظ فضا میں تحلیل بھی نہ ہوئے تھے کہ باہر کھڑکی سے بارش کی بوچھاڑ ٹکرانے کی آواز سُنائی دی اور معاً تیز ہوائیں شور مچانے لگیں۔ ڈارلنگ کی پیشین گوئی حرف بحرف درست نکلی۔ صرف پانچ منٹ کے اندر اندر چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا، چنانچہ انہیں اپنے تیل کے چراغ جلانا پڑے۔ ڈارلنگ بھاگم بھاگ لائٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ گریس کھڑکی سے لگی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی مگر گھُپ اندھیرے میں کیا نظر آتا؟ چاروں طرف گھری ہوئی سیاہ بدلیوں نے دن کی روشنی کو نگل لیا تھا۔ بارش کی بوچھاڑ تیز تر ہو گئی تھی۔ ہوائیں کسی زخمی پرندے



کی طرح اِدھر اُدھر پھڑپھڑاتی ہوئی شور مچا رہی تھیں۔ شام ہوتے ہوتے ہوائیں خوفناک طوفان کی شکل اختیار کر گئیں۔ یہاں تک کہ لائٹ ہاؤس کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ ڈارلنگ بے حد مضطرب تھا۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر لائٹ ہاؤس کو روشن رکھے جس کے صحیح اشاروں پر سینکڑوں انسانوں کی زندگیاں وابستہ تھیں۔ گریس کے دل میں جذبات کا طوفان اُمڈ رہا تھا اور اس کا دماغ سوچتے سوچتے عاجز آ چکا تھا۔ چراغ کی مدھم لَو میں اُسے اپنے سائے سے بھی خوف آنے لگا، لیکن وہ جی کڑا کر کے ایک بار پھر کھڑکی تک گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی کا وسیع سمندر تھا جس سے یخ بستہ ہواؤں کی ٹھٹھری ہوئی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی بلوریں آنکھوں میں آنسوؤں کے آخری قطرے بھی منجمد ہو چکے تھے۔

* * * * *

اسی اندھیارے میں ایک بحری جہاز فورفرشائر جزیرے کے قریب ہی لنگر انداز ہوا چاہتا تھا۔ جہاز کا ناخدا کیپٹن جان ہمبل تھا۔ اُسے اپنے اس سفینے پر بڑا ناز تھا۔ تین سو ہارس پاور کے دو انجنوں والے اس جہاز کو چار سال قبل سمندر میں اُتارا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ہل سے روانہ ہوتے وقت اس کے بائلر میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی بھاپ پر قابو پانے میں مشکل پیش آنے لگی۔ جونہی طوفان نے ذرا شدت اختیار کی، جہاز کے انجن والے کمرے میں پانی جمع ہونا شروع ہو گیا؛ چنانچہ جہاز کو متوازن رکھنے کے لیے بار بار بادبانوں سے کام لینا پڑا۔ طوفان کے مہیب سائے بڑھتے جا رہے تھے اور آدھی رات کے وقت تو یہ کیفیت تھی کہ کیپٹن ہمبل کو لائٹ ہاؤس کا وہ لیمپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جو اس ڈراؤنی رات اور طوفانی ماحول میں اس کا واحد سہارا تھا۔ فورفرشائر فیلِ بے زنجیر کی طرح ہر لحظہ بے قابو ہوا جاتا تھا اور بپھری ہوئی موجیں اُسے نگلنے کے لیے چاروں طرف سے اُمڈ رہی تھیں۔ بدقسمت جہاز میں مسافر بھی تھے اور خاصی مقدار میں سامان بھی۔ مسافروں کی کُل تعداد ترسٹھ تھی۔ ڈارلنگ بڑی خود اعتمادی سے لائٹ ہاؤس کے لرزتے اور ٹمٹماتے ہوئے لیمپ سے ضروری اشارے کرنے میں مصروف تھا، لیکن کہر آلود فضا میں اس کی پیہم کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور ۷ ستمبر کی بھیانک رات کے آخری لمحات میں فورفرشائر ایک بڑی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

آن کی آن میں زبردست ہنگامہ بپا ہو گیا۔ خوفناک دھماکے سے کئی مسافر تو فوراً ہی ڈھیر ہو گئے، کچھ انتہائی افراتفری کے عالم میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے اور سمندر میں جا گرے۔ اس وقت بلا کی تاریکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بہت سے دہشت زدہ مسافر اندھیرے سمندر میں جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ کچھ لوگ زخمی حالت میں چٹان کا سہارا ڈھونڈنے لگے، لیکن وہ اتنی پھسلواں تھی کہ کسی کے قدم جمنے نہ پائے اور وہ ایک ایک کر کے سمندر میں گرے اور چیختے چلاتے بے رحم برفانی موجوں کے نذر ہو گئے۔ جہاز کے پچھلے حصے میں پھنسے ہوئے لوگ تیز و تند یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں سے اکڑ کر رہ گئے۔ صرف اگلے حصے میں تیرہ مسافر زندہ بچے تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح رینگ رینگ کر شکستہ جہاز کے مستولوں تک پہنچ گئے۔

گریس کچھ دیر تک سمندر پر نگاہیں گاڑے کھڑی رہی، پھر ایک دم جیسے چونک سی گئی۔ جلدی جلدی لائٹ ہاؤس تک آئی اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔

"اُف میرے خدا، یہ رات کتنی لمبی ہو گئی ہے۔" اُس نے گہرا سانس لے کر کہا اور فی الواقع یوں محسوس ہوتا تھا جیسے

وقت رینگ رہا ہے۔ صبح کاذب کے وقت اُسے یقین ہو گیا کہ جھکڑ کے شور غل کے ساتھ ساتھ اُسے بے شمار انسانوں کے رونے اور کراہنے کی دردناک آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں

"اباجان۔۔۔ اباجان، مجھے محسوس ہوتا ہے۔۔۔ میرا دل کہتا ہے کچھ لوگ بڑی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں"

"احمق کہیں کی" اس کے باپ نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ پگلی! اس اندھیری رات کے خوفناک طوفان میں جہاز کی تباہی کے بعد بھلا کون زندہ رہ سکتا ہے"

"مگر اباجان میں نے اپنے کانوں سے ان کی چیخ پکار سنی ہے" گریس نے کہا۔

یہ آواز کیا تھی، ایک افسوں تھا جو اُس کے کانوں میں لمحہ بہ لمحہ پھونکا جا رہا تھا، لیکن ڈارلنگ بخوبی جانتا تھا اس ہنگامے میں تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اگر کچھ لوگ اس تباہی سے بچ بھی گئے ہیں تو ان کی آواز لائٹ ہاؤس تک نہیں پہنچ سکتی۔

—— اور جب اندھیرا چھٹا اور روشنی نمودار ہوئی تو باپ بیٹی نے دیکھا دور، فورفرشائر کا اگلا ڈھانچہ تیر رہا تھا۔ اس کے مستولوں کے ساتھ کئی انسانی جسم لہراتی ہوئی جھنڈیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

گریس کے دل میں جذبات کا سیلاب اُمڈ آیا۔

"اُف میرے اللہ" وہ چلائی "اباجان، ذرا دیکھیے تو ان بیچاروں کو، غضب کی سردی میں برفانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے مرے جاتے ہیں ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے"۔

"مدد ——؟ دیوانی کہیں کی، مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طوفان کی ابھی تک وہی کیفیت ہے اور ہمارے پاس ایک لائف بوٹ بھی موجود نہیں اور اگر اس کا بندوبست ہو بھی جائے تو اس شکستہ جہاز تک پہنچنا ناممکن ہے"

"مگر ہم انہیں اپنی کشتی میں تو لا سکتے ہیں"

"میری بچی، سنو" ڈارلنگ بولا "وہ لوگ یہاں سے تقریباً ایک ہزار گز کے فاصلے پر ہیں ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک میل کا چکر کاٹنا پڑے گا تاکہ متلاطم موجوں کے بے پناہ تھپیڑوں اور زیر آب چٹانوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ذرا سوچو تو اس طوفانی موسم میں ہماری چھوٹی سی کشتی بھلا وہاں تک کیسے پہنچے گی؟"

گریس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"نہیں نہیں، اباجان ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے۔۔۔۔ ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے۔۔۔؟"

وہ بار بار یہی الفاظ دہراتی رہی۔ اس کے دل میں ہلچل مچ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سمندر میں کود کر ان فلاکت زدہ اجنبی مسافروں تک پہنچ جائے جن کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور صرف زندگی کی ایک موہوم سی اُمید پر اپنے ٹھٹھرے ہوئے سینوں سے لگائے کسی آنے والے کا انتظار کر رہے تھے۔

بیٹی کو اس طرح مضطرب دیکھ کر ڈارلنگ بے حد متاثر ہوا —— "واقعی ان تباہ حال مسافروں کی فوری مدد کرنا اشد ضروری ہے" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

گریس کو ساتھ لیا، لائٹ ہاؤس سے اُترا اور مسز ڈارلنگ کی مدد سے کشتی کو سمندر میں اُتار دیا۔ یہ کام بڑے جان جوکھوں کا تھا۔ تند و تیز ہوا کی وجہ سے وہ تینوں سیدھی طرح کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ یہ چھوٹی سی چار چپوؤں والی کشتی تھی۔ ڈارلنگ نے تو بائیں سمت کے دو چپو سنبھال لیے، گریس دائیں طرف بیٹھ گئی اور چپو چلانے لگی۔

کشتی قدم قدم پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ پانی کا بہاؤ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ کشتی کئی بار اُلٹتے اُلٹتے بچی۔

ڈارلنگ تندرست و توانا اور بڑا جانباز کھویا تھا لیکن طوفانی ہواؤں کا دباؤ نہایت شدید تھا اُسے زبردست جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ادھر گریس کا عجیب عالم تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فولادی پنجوں سے کہیں زیادہ مضبوط نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ ایسی ہنرمندی اور تیزی سے چپو چلا رہی تھی جیسے کوئی زبردست رُوحانی قوت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔

اُس کی نگاہیں صرف ان مستولوں پر مرکوز تھیں جن پر وہ تھکے ہارے انسان ناتواں پرندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ اوپر سلیگوں آسمان تھا اور نیچے چاروں طرف طوفان ہی طوفان۔ یخ بستہ ہواؤں کے مسلسل تھپیڑوں سے اُن کے جسم اکڑنے لگے تھے۔ آخر انہوں نے مستول چھوڑ دیے، پانی میں کود گئے اور ڈوبتے اُبھرتے چٹان کے نکلے ہوئے حصے پر پہنچ گئے۔ ادھر ڈارلنگ اور گریس موجوں سے لڑتے، ٹکراتے اور سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے ان کے قریب جا پہنچے۔

اب انتہائی سنگین مرحلہ درپیش تھا۔ ان لوگوں کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ باپ بیٹی میں سے کوئی ایک لائٹ ہاؤس کی چٹان پر اُتر جائے۔ ڈارلنگ نے بڑی پھرتی سے اُچک کر چٹان کے نکلے ہوئے حصے کو پکڑ لیا اور رینگ کر اُوپر چڑھنے لگا۔ اس عرصے میں گریس نے بڑی ہمت اور دلیری سے کام لیا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کشتی کو سنبھالے رکھا، پھر بڑی تیزی سے چپو چلاتی ہوئی چٹان کے دوسری طرف پہنچ گئی جہاں بے رحم موجوں کا زور نسبتاً کم تھا۔ چپو چلاتے چلاتے اس کے نازک ہاتھ بالکل شل ہوئے جاتے تھے اور برفانی ہوا کے تھپیڑوں سے جسم نیلا پڑ گیا تھا۔

ڈارلنگ بار بار سینا اور [illegible] سہلاتا ہوا رینگ رینگ کر ان کے قریب پہنچا، تو یہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ بچے کھچے مسافروں میں سے چار تو دم توڑ چکے ہیں، باقی نو نیم مُردہ حالت میں پڑے تھے۔ پانچ کو جان پر کھیل کر نیچے کشتی میں اُتار لیا جسے گریس تن تنہا نہایت مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔ جونہی ان خستہ حال اور قریب المرگ انسانوں کا بوجھ پڑا، کشتی ڈولنے لگی۔ ابھی چار مسافر چٹان پر باقی تھے، انہیں دوسرے پھیرے ہی میں لے جایا جا سکتا تھا، چنانچہ انہیں وہیں چھوڑ کر ڈارلنگ کشتی میں سوار ہو گیا۔ باپ بیٹی نے پھر چپو سنبھال لیے۔ کشتی متلاطم موجوں سے ٹکراتی ہچکولے کھاتی بڑے اذیت ناک سفر کے بعد لائٹ ہاؤس تک پہنچی۔ مسافروں کو اُتار کر مسز ڈارلنگ کے حوالے کیا اور خود ایک منٹ ضائع کیے بغیر دونوں باپ بیٹی پھر چٹان کی طرف روانہ ہو گئے۔

اب پھر وہی طوفان تھا اور وہی باپ اور بیٹی۔ ان کے قویٰ بالکل جواب دے گئے تھے۔ متواتر چپو چلانے سے ڈارلنگ کی سانس پھول چکی تھی۔ گریس بے چاری کی تو جیسے ہڈیاں چٹخ گئی تھیں۔ اس کا ایک ایک بند درد کر رہا تھا اور جسم کا خون گویا منجمد ہوا جاتا تھا۔ وہ ٹھٹھرتی ہوئی بڑی ہمت سے چپو چلانے میں مصروف تھی۔ کبھی کبھی اُس کے دانت بے اختیار بجنے لگتے اور جسم کی کپکپاہٹ سے چپوؤں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی، لیکن باقی ماندہ چار مسافروں کو بچانے کا احساس اُس کے اندر فوراً ایک عزم اور ولولہ پیدا کر دیتا اور وہ نئی قوت کے ساتھ چپو چلانے لگتی۔

آخر تند و تیز ہواؤں اور شوریدہ سر موجوں سے ٹکراتے، گرتے پڑتے وہ ایک بار پھر اُس چٹان تک پہنچ گئے —— ڈارلنگ نے ایک ایک کر کے چاروں مسافروں کو بحفاظت تمام کشتی میں اُتارا اور پھر دونوں باپ بیٹی اپنی شکستہ جانوں کی بازی لگا کر ہانپتے کانپتے انہیں لائٹ ہاؤس تک لانے میں کامیاب ہو گئے۔

ان انتہائی خطرناک حالات میں ان سب کا صحیح سلامت واپس پہنچ جانا واقعتاً انسانی جرأت و ہمت کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ایک حیرت ناک واقعہ تھا۔ مسز ڈارلنگ اور گریس متواتر تین شب و روز دیکھ بھال کرتی رہیں، حالانکہ اس طوفانی مہم کے بعد گریس کی ... حالت بڑی خراب تھی اور اسے آرام کی اشد ضرورت تھی۔

چوتھے روز طوفان کا زور ٹوٹا، تو ڈارلنگ نے ان مسافروں کو شہر میں مناسب مقامات پر پہنچا دیا اور ساتھ ہی اس واقعہ کی سرکاری رپورٹ بھی حکام بالا کو بھیج دی جس میں گریس کے بارے میں ایک لفظ تک نہ لکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا گھرانا اپنے گھر میں پہلے کی طرح خاموشی سے دن گزارنے لگا۔ ان کے خیال میں معاملہ ختم ہو چکا تھا لیکن فورفشائر کے بچے کھچے مسافر جن کی دھندلائی ہوئی نظریں اس بے مثال احسان مندی سے جگمگا اٹھی تھیں، اس نازک اندام لڑکی کی جرأت اور جاں نثاری کو کیسے بھول سکتے تھے۔ آن کی آن میں اس واقعے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ گریس کی بہادری کے چرچے ہر زبان پر تھے۔ اس کے لیے ایک خاص فنڈ جاری کیا گیا جس میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنے صرفِ خاص سے پچاس پاؤنڈ کا عطیہ دیا۔ دونوں باپ بیٹی کو سونے کے کئی تحفے ملے اور چند روز کے اندر اندر ان کے ہاں ملاقاتیوں اور اخباری رپورٹروں کا تانتا بندھ گیا۔ اس واقعے کی اہمیت روز بروز بڑھتی گئی اور لوگ دور دراز ملکوں سے بارگ آنا شروع ہو گئے۔ گریس کو ہزارہا خطوط اور تحائف بھی ملے اور بعض مداحوں نے تو اس سے اپنی زلف کی ایک لٹ بھیجنے کی بھی فرمائش کی۔

آخر اس طوفانی رات کے جانکاہ واقعات نے گریس سے اپنا انتقام لے ہی لیا۔ برفانی ہواؤں اور سمندر کی متلاطم موجوں نے اس کے جسم و جاں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کی صحت روز بروز گرنے لگی۔ بالآخر وہ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی اور مسلسل کئی برس تک اس اذیت ناک مرض کی صعوبتیں برداشت کر کے چھبیس برس کی عمر میں مر گئی۔

وہی واقعہ جس نے اسے شہرتِ دوام بخشی، اس کی موت کا فرشتہ بن گیا۔ اس کی یاد میں لندن کے بیٹرسی پارک میں ایک پودا لگایا گیا جو آج بھی ایک خوبصورت درخت کی صورت میں موجود ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ایک گریس ڈارلنگ میوزیم بھی قائم کیا گیا، لیکن اس سلسلے کی سب سے دردناک کڑی "ٹائمز" لندن کے ذاتی کالم میں چھپنے والا ایک اشتہار تھا، اس میں کہا گیا تھا:

"گریس ڈارلنگ کے بالوں کی ایک لٹ سونے کی ڈبیا میں محفوظ برائے فروخت موجود ہے۔"

کس قدر خوفناک آوازیں ہیں، تیز اور تیز، وہم حقیقت میں بدل گیا تھا۔۔۔ میرے خدا یہ سب کیا ہے۔؟

# حویلی کی آگ

سنتھیا ایکویتھ

**لارا لیپارڈ** کا خوشی سے برا حال تھا۔ یوں بیٹھے بٹھائے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی وہ خوابوں کی سحر انگیز کیفیت میں سرشار تھی۔ وہ ہر بار ایک نئی حیرت اور خوشی سے آنکھیں مل کر اپنے نئے گھر کو دیکھتی اور خود کو چھوتی جاگتی دنیا میں پا کر اپنی خوش نصیبی پر رشک کرنے لگتی۔ نیا مکان تھا ہی اتنا شاندار۔۔۔ نیویارک کے پُرشور اور مشینی ماحول میں برسہا برس گزارنے کے بعد فطرت کے حسن سے مالا مال اس سرسبز و شاداب مضافاتی علاقے میں زمین کے وسیع و عریض ٹکڑے پر پھیلی محل نما حویلی "ٹکن ہال" میں پُرسکون زندگی گزارنا اس کے لیے یقیناً ایک مسرت انگیز اور خوشگوار تجربہ تھا۔۔۔ بے پایاں سکون اور تازہ فضا میں سانس لینے والا فطرت کا ازلی حسن۔۔۔ اس کے لیے تو جیسے طلسماتی کہانیوں کے سحر انگیز قاصدوں نے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔

لارا کے خاوند، کلاڈ لیپارڈ کو چھ مہینے پہلے یہ مضافاتی جائداد ورثے میں ملی تھی جو اس کا بڑا اور لاولد بھائی چھوڑ مرا تھا۔ کلاڈ نے ایک طویل عرصہ اپنے لندن کے آبائی قصبے سے دور نیویارک میں گزارا تھا۔

یک نئی زندگی بنانے کی جدوجہد کے دوران ہی اُس کی ملاقات لارا سے ہوئی اور دونوں نے زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو جانے کے فیصلے میں دیر نہ کی۔ شادی کے بعد کلاڈ اتنا مصروف رہا کہ اُسے امریکہ سے نکلنے کا موقع ہی نہ ملا اور یہی وجہ تھی کہ لارا اپنے جیٹھ سے کبھی نہ مل سکی جو باپ کی وفات کے بعد کنبے کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے خاندانی وقار کو گلے لگائے بیٹھا رہا، لیکن اپنے خاوند سے لارا نے جو کچھ سنا تھا اُس سے وہ بڑا ہی دُکھی انسان معلوم ہوتا تھا۔ پہلے تو اُسے ٹوٹ کر محبت کرنے والی جوان اور خوبصورت بیوی کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا، مگر ایک روایتی جاگیردار کی طرح وہ یہ صدمہ اپنی جان پر سہتا رہا، کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اور نتیجے میں گُھٹ گُھٹ کر ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو گیا۔ بستر پر پڑے پڑے ٹکر ٹکر دیکھنا ہی کچھ کم نہ تھا کہ اُس پر ایک اور پہلے سے زیادہ المناک قیامت ٹوٹ پڑی۔ اُس کی اکلوتی اور نازوں سے پلی فرشتوں جیسی معصوم اور خوبصورت بیٹی کو آگ کے شعلے نگل گئے۔ آگ حویلی کے عقبی حصے میں بھڑکی تھی جس میں اُس کی دس سالہ بچی دیکھتے ہی دیکھتے جل کر بھسم ہو گئی۔ اُس شخص کی بدنصیبی کو اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں جس نے اس حادثے کے بعد بارہ برس زندگی کا عذاب برداشت کیا اور اس عالم میں کہ نہ مونس نہ غم خوار، نہ دل کی بات کوئی سننے والا اور نہ کسی کو سنانے کا یارا۔

آتش زدہ حصے کی پوری طرح مرمت کر دی گئی، چنانچہ لارا نے یہاں آکر اس حویلی کے اندر دل میں اُتر جانے والا سکون محسوس کیا، تو اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اس مقام سے ایک معصوم بچی کی اندوہناک یاد بھی وابستہ ہے۔ اُسے عجب سا لگتا تھا کہ یہاں المناک واقعہ ہوا ہوگا اور صرف بارہ برس پہلے۔ لیکن یہی نئے ماحول کے حُسن و رعنائی نے اُسے اتنا گرویدہ کر لیا تھا کہ حویلی کا تلخ ماضی کریدنے سے اُسے دلچسپی نہ رہی تھی۔

• • •

یہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شام کی بات ہے ــــــ وہ حویلی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ آتش دان میں آگ دہک رہی تھی اور اُس کا عکس لارا کے سرخ گالوں پر سونا بن کر دمک رہا تھا۔ اس وقت وہ بوڑھے پادری کے لیے چائے بنا رہی تھی جس کی بجھتی آنکھوں میں لارا کے حسن، مہمان نوازی اور اخلاق نے ایک خاص چمک پیدا کر دی تھی۔ وہ لارا سے پہلی ملاقات ہی میں بہت متاثر ہو چکا تھا اور اب اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک باہر کی سردی سے

بچ کر اور اپنے مہذب اور شائستہ میزبان کی خاطر داری سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ اُس نے آرام دہ کرسی کے نیچے اپنی ٹوٹی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے نہایت سکون سے لب کھولے:

"محترم خاتون! اس حویلی کو آباد دیکھ کر مجھے ناقابلِ بیان خوشی ہو رہی ہے ــــــ بارہ برس یہ ویرانیوں اور اداسیوں کا مسکن رہی ہے۔"

"بے شک!" لارا نے بڑے گمبھیر لہجے میں اُس کی تائید کی۔ "میں تصور کر سکتی ہوں کہ میرے مرحوم جیٹھ کو اپنی اکلوتی بیٹی کی موت نے کتنا دُکھ پہنچایا ہوگا ــــــ اس المیے نے آخری سانس تک اُن کا پیچھا نہ چھوڑا ہوگا۔"

"ٹوٹا ہوا دل اور زندہ درگور ہونا جیسی اصطلاحیں ہم اکثر پڑھتے اور سُنتے آئے ہیں،" پادری نے بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے اپنی زندگی میں ایک ہی آدمی ایسا دیکھا ہے جس کا کرب بیان کرنے کے لیے اس قسم کی اصطلاحیں ناکافی ہو جاتی ہیں ــــــ مرحوم نے جس قدر عذاب سہا ہے، اُس کا تصور ہی دل کو لرزا دیتا ہے ــــــ وہ ایک پُررعب، باوقار اور ہمدرد شخصیت کا مالک تھا ــــــ ایک مثالی جاگیردار کی طرح اُس نے اپنی خاندانی ذمے داریوں کو انتہائی خوبی اور جانفشانی سے نبھایا، مگر بیوی کی موت نے اس تناور درخت کو ہلا کر رکھ دیا اور رہی سہی کسر بیٹی کی موت نے پوری کر دی ــــــ وہ شعلہ بجھ کر راکھ ہو گیا ــــــ آپ ہی بتایئے یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ کوئی مونس نہ غم خوار ــــــ اور پھر ایسا معذور کہ آتش دان میں آگ بجھ جائے، تو دوبارہ جلا بھی نہ سکے۔" پادری کی آنکھوں سے کرب جھانک رہا تھا اور وہ بولے جا رہا تھا۔

"مجھے اُس کی حالت دیکھ کر رونا آتا تھا۔ غضب خدا کا اس قدر تنہائی اور ویرانی ــــــ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں پچھلے بارہ برسوں میں یہاں بہت کم لوگ آئے ــــــ صرف چند پرانے دوست کبھی کبھار آجایا کرتے تھے ــــــ حیرت تو یہ ہے کہ تمہارا شوہر یہاں کیوں نہیں آیا! ــــــ دونوں بھائی برسوں ایک دوسرے کی شکل بھی نہ دیکھ سکے ــــــ کبھی ان دونوں کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں یا پھر اتنی دوری ہوئی کہ کلاڈ نے یہاں کسی وقت قدم رکھا جب یہ حویلی اُسے وراثت میں ملی۔"

"بات واقعی عجیب ہے،" لارا نے کہا۔ "کاروباری اُلجھنیں اپنی جگہ سہی، مگر وہ چاہتے تو تعطیلات میں یہاں آنے کا وقت ضرور نکال سکتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھے۔" پھر وہ جیسے سوچ میں گم ہو گئی۔ "میں نے جب بھی یہاں آنے کے لیے اصرار کیا، میرے شوہر نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ اگلے سال چلیں گے۔ مجھے پتہ نہیں ایسا کیوں تھا۔ سوچتی ہوں اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ وہ بہت حساس آدمی ہیں، کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے ــــــ جہاں تک میرا خیال ہے وہ اپنے معذور بھائی کو اس حالت میں دیکھنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔"

"ہو سکتا ہے۔" پادری نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سر ہلایا۔ "کاش! وہ ایک بار ہی آجاتا ــــــ کتنا اچھا ہوتا!" لارا نے پادری کی آواز میں دُکھ کے ساتھ طنز کی چبھن محسوس کی۔ "مرحوم کو شاید کچھ سکون مل جاتا اور موت آسان ہو جاتی۔"

"پتہ نہیں کیا بات تھی، مگر وجہ یہ ہرگز نہیں کہ کلاڈ کو اپنی آبائی حویلی پسند نہ تھی۔" لارا نے پُرجوش آواز میں کہا۔ وہ پادری کے طنز کو نظرانداز کرنے کی کوششوں میں جذباتی ہو چلی تھی۔ "میں بیان نہیں کر سکتی یہ حویلی اُنہیں کس قدر عزیز رہی ہے۔"

"خاتونِ محترم!" پادری نے کہا۔ "یہ مجھے پتہ ہے۔ میں ایک ایک بات جانتا ہوں ــــــ میں آپ کے شوہر کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ننھا سا بچہ تھا ــــــ بچپن میں بھی اُسے اس حویلی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا ــــــ اپنے اس جذبے کی وجہ سے وہ گھر والوں کے مذاق کا نشانہ بنتا تھا ــــــ مجھے یاد ہے اُس نے ایک بار اپنے ایک ہم جماعت کو محض اس لیے مار مار کر ادھ مُوا کر دیا کہ وہ اپنی حویلی کو اس سے بہتر کہہ بیٹھا تھا۔" پھر پادری ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "کتنے اچھے دن تھے وہ! ــــــ میں نے اس حویلی کو آباد دیکھا ہے ــــــ یہاں خوشی کا راج تھا، بچوں کے قہقہوں سے یہ جگہ آباد تھی ــــــ بھلا بچوں کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے! میں بیان نہیں کر سکتا جب آپ کی بچی کو ہنستے کھیلتے، سبزے پر دوڑتے، اُچھلتے کودتے دیکھتا ہوں، تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔" لارا نے کہا۔ "باقی سنتھیہ یہاں آکر بہت خوش ہے۔ اُس کا ایک ایک لمحہ مسرت سے بھرپور ہے۔"

"خدا اُس کی عمر دراز کرے! ــــــ آپ کی بچی بہت خوبصورت اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔" پادری خدا کی ذرا رُکا، پھر بولا: "وہ ہُو بہو اُس سے ملتی ہے۔"

"کس سے؟" لارا نے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ ہُو بہو اپنی مرحوم کزن کی تصویر ہے ــــــ بدنصیب ڈیانا کی ــــــ ان دونوں میں اتنی مماثلت ہے کہ بیان سے باہر ــــــ تمہارے شوہر نے یہ بات نہیں بتائی؟"

"نہیں۔" وہ گڑبڑا گئی۔ "کم از کم مجھے یہ بات نہیں بتائی ــــــ وہ شاید بتانا ناپسند کرتے ہوں۔ اپنی بھتیجی کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتے ــــــ اُنھوں نے تو مجھے ڈیانا کا نام بھی نہیں بتایا۔"

"مجھے پتہ ہے۔" پادری نے اس سے اتفاق کیا۔ "اُسے اپنی بھتیجی کی موت کا بہت زیادہ صدمہ تھا۔ کلاڈ اُس سے بہت پیار کرتا تھا ــــــ مجھے یاد ہے وہ اُس سے ہر وقت کھیلتا رہتا تھا ــــــ وہ اُس کو بہت ہی چاہتا تھا ــــــ اُسے کون نہیں چاہتا تھا؟ ــــــ ہم سب اُسے پیار کرتے تھے ــــــ وہ تھی ہی ایسی پیاری۔"

"کیا ــــــ وہ ــــــ ڈیانا ہماری بیٹی کی طرح تھی؟" لارا نے پوچھا۔

"میں بیان نہیں کر سکتا ان دونوں میں کس غضب کی مشابہت ہے ــــــ آپ کی بیٹی عین مین ویسی ہی ہے۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں ــــــ میں بارہ برس پیچھے چلا گیا ــــــ وہی معصوم چہرہ ــــــ وہی شریر آنکھیں۔" پادری نے کہا، پھر ایک دم اُسے کوئی بات یاد آئی۔ "تمہاری بچی دس برس کی ہے نا؟"

"ہاں ــــــ وہ دس برس کی ہونے والی ہے۔"

"بدنصیب بچی کی عمر بھی یہی تھی جب میں نے اُسے آخری بار دیکھا تھا ــــــ لگتا ہے یہ کل کی بات ہے۔ میں اسے اب بھی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہوں ــــــ سُرخ بال، سنہری رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، پُرجوش شریر اور دلکش بھولی ــــــ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں ــــــ حیرت انگیز مشابہت ــــــ آوازیں بھی یکساں ــــــ آپ کی بچی بھی کھیل کود کی اتنی ہی شوقین لگتی ہے ــــــ میں نے ڈیانا جیسی بچی نہیں دیکھی ــــــ وہ ہر وقت کھیل کود میں لگی رہتی تھی ــــــ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے پتہ ہو کہ اُس کے پاس وقت کم ہے، جتنا وقت کھیل کود میں گزر سکتا ہو گزار لے ...... اچھا ــــــ مجھے اب چلنا چاہیے محترم خاتون!" یہ کہتے ہوئے پادری اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ایسی خوبصورت شام کی رفاقت، نفیس گفتگو اور پُرخلوص چائے کے لیے دلی شکریہ۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ڈیانا ــــ اور ہائی سنتھ کو میرا پیار دیجیے۔"

"شب بخیر فادر! پھر آیئے گا۔" لارا نے مشینی انداز میں کہا اور پادری کے جانے کے بعد آگ کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے بے دھیانی مگر اضطراب میں لکڑی کے ٹکڑے کو ٹھوکر ماری اور آگ میں دھکیل کر اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ شعلوں میں پوری طرح راکھ نہ ہو گیا۔

لارا کو افسردگی اور ایک نامعلوم گھٹن نے غیر محسوس طور پر گھیر لیا اور پھر اچانک ہی سردی اُسے اپنی ہڈیوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ جانے کن خیالوں میں گھری ہوئی آگ کے شعلوں کو گھورے جا رہی تھی کہ پادری کی دوبارہ آمد نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اپنے دستانے بھول گیا تھا۔ اُس نے آتے ہی معذرت کی اور دستانوں کے بارے میں پوچھا تو لارا نے یونہی، کسی مقصد کے بغیر پوچھا "کس رنگ کے ہیں؟" اُسے کچھ خیال نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، اگرچہ گہرے رنگ کے دستانے وہیں صوفے پر پڑے ہوئے تھے۔

"اور یہ پڑے ہیں۔" پادری نے دستانے دیکھ لیے "مجھے افسوس ہے میں نے آپ کو زحمت دی۔ وہ جانے کے لیے مڑا۔

"شکریہ فادر! ــــ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ میرے خاوند سے آپ ملے ہیں؟ وہ آپ کو کیسا لگا؟"

"بہت اچھا ــــ وہ ہمیشہ ہی سے ایک پُرجوش اور شاندار شخصیت کا مالک رہا ہے ــــ بہت شاندار ــــ ہاں مگر آپ نے پوچھا تو مجھے خیال آیا ــــ میں نے اُس کے چہرے پر عجیب تاثرات دیکھے ہیں ــــ اُس کا چہرہ ــــ اُس کی آنکھیں ــــ گہرے رنج و غم میں غلطاں ہیں ــــ جیسے وہ کسی گہری، دکھ دینے والی سوچ میں گم ہو ــــ یا کوئی غمگین واقعہ بھولنے کی کوشش میں لگا ہو ــــ لگتا ہے وہ کسی غم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے یا کوئی یاد آسے ہراساں کر رہا ہے۔ لگتا ہے۔"

"کوئی یاد؟"

"ہاں ــــ ایسا ہی لگتا ہے ــــ مگر یہ کیفیت عارضی ہو سکتی ہے ہو سکتا ہے مدت سے بڑھی ہوئی کاروباری مصروفیات نے اُس کی یہ حالت بنا دی ہو۔ شہر کی زندگی ہی ایسی ہنگاموں سے پُر ہوتی ہے۔ اُس نے تو اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ انہی ہنگاموں سے دُور اسی گاؤں میں گزارا تھا ــــ اب وہ بڑا ہو گیا ہے تو بدل گیا ہو گا ــــ اب وہ ہنگاموں سے تنگ ہے ــــ وہ تو پیدا ہی گاؤں کی زندگی کے لیے ہوا تھا۔

شب بخیر خاتون! ــــ شب بخیر۔"

لارا سوچ میں گم تھی۔ پادری کی طرف دیکھے بغیر شعلوں کو گھورتے ہوئے وہ جیسے بڑبڑائی "شب بخیر ــــ وہ پیدا ہی گاؤں کی زندگی کے لیے ہوا تھا۔"

ہاں ــــ اُسے دیکھ کر ہمیشہ یہی خیال ذہن میں آتا تھا ــــ اس بے نام تاثر کو وہ آج تک کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ آج معلوم ہوا یہی بات تھی ــــ امریکہ میں کلاڈ ایسا لگتا تھا جیسے وہ جلاوطن ہو اور اپنی زمین کے لیے ترس رہا ہو ــــ مگر ــــ مگر اب جب وہ اپنی کھوئی ہوئی جنت میں آ گیا ہے ــــ وہ اپنی محبوب حویلی میں ہے، اُسے بنانے سنوارنے میں دن رات ایک کر رہا ہے ــــــــــــــــ

اُس نے حویلی کی آرائش و زیبائش بالکل ہی بدل کر اسے اور خوبصورت بنا دیا ہے ــــ اب وہ اس کیفیت سے دوچار کیوں ہے؟ اب اُسے کون سا غم ہے؟ ان نئی سوچوں نے لارا کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ پادری سے گفتگو کے بعد سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ جیسے دل پر واقعی ایک بوجھ سے دبا محسوس ہوتا ہے۔ وہ پھر سوچنے لگی کہ اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟... اب تو اس کا جواز نہیں، کیونکہ اس بوجھ سے کچھ کو اپنا تابندہ مستقبل صاف نظر آ رہا تھا۔ بلیارڈ خاندان کی جائداد اتنی تھی کہ وہ ساری زندگی کام کیے بغیر خوشحالی سے گزار سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے اُس کا ذہن کاروبار کی طرف گیا۔ بزنس کی فکر؟ مگر بزنس کی کلاڈ کو کیا فکر ہوتی؟ نیویارک میں اُن کا بزنس ٹھیک چل رہا تھا۔ لارا کو بزنس کے ایک ایک پہلو کا علم تھا۔ وہ اسے ایک ایک بات بتا دیتا تھا۔ لارا سوچ کے اس مرحلے پر بے اختیار مسکرا اٹھی۔ ایک دن پہلے ہی وہ ایک ناول پڑھ رہی تھی جس کی ہیروئن اپنے خاوند کے کرتوتوں سے قطعی ناواقف تھی اور اصرار کرتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ہر راز سے واقف ہے، وہ اُسے ہر بات بتا دیتا ہے۔ اور اب وہ خود بھی کسی طرح الجھ گئی تھی۔ اُس کے لاشعور میں یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ پادری کے ذہن میں کوئی شبہ موجود ہے ــــ اُس کے شوہر کا رویہ ہی ایسا تھا۔ اس قصباتی حویلی میں آنے کے بعد آج پہلی بار لارا نے اپنے اور شوہر کے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار بلند ہوتے محسوس کی ــــ پہلے تو وہ کبھی چپ چپ ہوتا، تو کئی بار پوچھنے پر اصل بات بتا دیا کرتا، مگر اب تو وہ تھوڑی یا معمولی سی بات کے بارے میں پوچھنے پر بھی چڑ جاتا۔ نجانے کیا ہو گیا



ہے! ــــ ہائی لنکر بھی اپنے پاس رکھنا چاہ رہی ہے۔ مجھے نصیحتیں کرتی رہتی ہے۔ بیٹھ جانا۔"

لارا انہی سوچوں میں گم تھی کہ اُس کا بلند قامت، وجیہہ و شکیل شوہر کمرے میں داخل ہوا، اس حال میں کہ چہیتی بیٹی اُس کے کاندھوں پر سوار تھی۔ اُس کے سُرخ بال ننھی منی گول چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور بڑی بڑی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ وہ خوشی سے بے حال باپ سے لاڈ کر رہی تھی۔

تینوں آگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ باپ نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور ایک دلچسپ باب پڑھ کر بیٹی کو سنانے لگا۔ ہائی سنتھ ہتھیلیوں کے پیالے میں بیضوی چہرہ تھامے دلچسپی سے سُنتی رہی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں شعلوں پر جمی ہوئی تھیں اور زیادہ دمک رہی تھیں۔ وہ کتاب سُنا چکا، تو ہائی سنتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "ابا اب میں جا سکتی ہوں؟"

باپ نے اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ "بیٹی تم یہاں تنہائی سے پریشان تو نہ ہوتی ہو گی؟"

"تنہائی؟ ــــ کبھی نہیں ــــ میں تو یہاں کبھی اکیلی نہیں رہی۔" کچھ یاد کر کے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اب مجھے جانا چاہیے۔" وہ باپ کی پیشانی چوم کر اُس کے بازوؤں سے پھسلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ فرش پر اس کے دوڑتے قدموں اور کھنکتی ہنسی کی آواز دور ہوتی چلی گئی، تو اُس نے لارا سے پوچھا "ہائی سنتھ نے یہ بات کیا کہہ دی ــــ میں تو یہاں کبھی اکیلی نہیں رہی؟"

"ہاں عجیب بات ہے۔" لارا جیسے اسی بات کا انتظار کر رہی تھی۔ "اب جب تم نے پوچھ ہی لیا ہے، تو بتاؤ تمہیں وہ بدل بدل نہیں لگتی؟ تمہیں یاد نہیں وہ کس قدر لیے دیے خاموش خاموش رہتی تھی؟ مجھ سے ذرا پرے الگ نہیں ہوتی تھی اور ہر وقت کوئی کہانی یا کتاب سُننے کی فرمائش کرتی تھی، مگر اب تو وہ بس سہیلیوں کی تلاش میں رہتی ہے اور اس قدر شوخ اور چنچل ہو گئی ہے کہ یہاں سے باہر ــــــ وقت بے وقت کھیل میں لگی رہتی ہے۔"

"اچھا واقعی؟"

"اور کیا ــــ اب تو اُسے ذرا سی دیر پاس بٹھانے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ہر وقت باہر رہنا چاہتی ہے۔ اُسے اپنے آپ پر اعتماد بھی بہت ہو گیا ہے اور ــــ اور ــــ ہر وقت اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔" لارا کی آواز میں فکر کی جگہ محبت کو اعتراف شامل ہو گیا تھا۔ اُس نے جیسے ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو کہتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ "ڈارلنگ ــــ یہ حویلی ــــ"

کلاڈ ڈاکتا ہٹ سے بولا۔

"او خدا کے واسطے! ــــــــــــ اب کوئی احمقانہ بات نہ کرنا۔"

لارا کے لیے اُس کا یہ موڈ نیا نہیں تھا۔ اُس کا غصہ نظرانداز کر کے وہ دکھاوے کے لیے ہنسی۔ "مجھے پتہ ہے تم کیا کہو گے؟ ہر انگلینڈ کے مضافات کی کسی قدیم حویلی سے جنوں بھوتوں کی داستانیں وابستہ کر دیتا ہے۔ بھوت آسیب، پُراسرار آوازیں، ناک سے بولنے والے بھتنے اور چڑیلیں ــــ مگر ایسی بات نہیں ــــ میں تو اس حویلی میں آ کر بہت خوش ہوں ــــ ایسی خوشی محسوس کر رہی ہوں جو زندگی میں کبھی نہیں ملی ــــ اس جگہ کا چپہ چپہ ایک نئی مسرت سے آشنا کرتا ہے، خاص طور پر وہ کمرہ تو لاجواب ہے جس پر ہائی سنتھ نے قبضہ کیا ہوا ہے۔"

لارا کی یہ بات سُن کر کلاڈ غصے سے پھٹ پڑا۔

"ہائی سنتھ ابھی تک اُسی کمرے میں ہے؟ ــــ میں نے منع کیا تھا کہ وہ وہاں نہ رہے۔"

"وہ مانتی ہی نہیں۔" لارا نے جواب دیتے ہوئے اپنے شوہر کو دیکھا، تو وہ غصہ ضبط کرنے کے لیے آگ کے شعلوں پر نظریں جما چکا تھا۔ لارا نے اُس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔ "اس کا غصہ بجا ہے۔" اُس نے سوچا "میرا شوہر بہت حساس ہے۔ یہ اُس کی مرحومہ بھتیجی کا کمرہ تھا۔ وہ یہیں آگ کے بے رحم شعلوں میں گھر کر ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔" لارا کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے ہائی سنتھ کو اس کمرے میں رہنے کی اجازت کیوں دی؟ کلاڈ کو اپنی بھتیجی سے بہت محبت تھی اس لیے لارا کو یہ نہ بھولنا چاہیے تھا کہ اُس کا شوہر نہ یہ المیہ بھولے گا اور نہ ہی یہ برداشت کرے گا کہ کوئی اور خواہ اس کی بیٹی ہی اس کمرے میں رہے ــــ ایسی سوچوں میں کھوئی ہوئی لارا کو ڈیانا کا خیال آیا، تو وہ لرز کر رہ گئی۔ "دس سالہ ڈیانا!" اُس کے کان میں جیسے پادری نے سرگوشی کی "وہ ہائی سنتھ کی ہم عمر تھی!" خوف کے اس احساس سے نجات پانے کے لیے اُس نے خواہ مخواہ پھر وہی بات شروع کرنے میں عافیت جانی۔

"کلاڈ ڈیئر! یقین مانو اُس کمرے میں ایسی کوئی ناخوشگوار بات نہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



...... تم مجھے بے وقوف سمجھو گے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اُس کمرے میں جا کر ایک خوش باش اور امنگ بھرے ماحول کا احساس ہوتا ہے۔ میں جب اُس کمرے میں جاتی ہوں اور ایسا میں عموماً کرتی ہوں، تو لگتا ہے جیسے میرا بچپن لوٹ آیا ہو۔ جی چاہتا ہے خوب خوب اچھلوں کودوں، شور مچاؤں، قہقہے لگاؤں۔ ایک دفعہ ـــــ ایک دفعہ تو میں بے اختیار خرقلین کے پیچھے چھپ گئی جیسے کسی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور کوئی مجھے پکڑنے آ رہا ہو۔" لالا خوش دلی سے ہنس رہی تھی، مگر کلاڈ کے چہرے پر وہی تناؤ تھا جس سے وہ ڈرنے لگی تھی۔

"ہونہہ!" کلاڈ نے صرف اتنا کہا اور اخبار کی چادر اپنے اور بیوی کے درمیان تان کر جیسے ان احمقانہ باتوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ شوہر کی ناراضگی کا احساس کر کے لالا بائی سنتھ کو باہر سے بلانے کے لیے وہاں سے اٹھی۔ بیٹی کو تلاش کرنے میں اُسے آدھا گھنٹہ لگ گیا اور وہ اُسے بڑی مشکل سے واپسی کے لیے راضی کر سکی۔ بائی سنتھ کو آیا کے حوالے کر کے وہ واپس آ گئی، تو کلاڈ نے اخبار ایک طرف رکھا اور یہ کہہ کر آتشدان کے سامنے سے اٹھ کھڑا ہوا کہ بیٹی کو شب بخیر کہہ آؤں۔

"تمہارا خیال ہے وہ چپ چاپ بستر پر ہو گی؟" لالا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں پتہ ہے میں کتنی مصیبتوں سے اسے اندر بلاتی ہوں؟... تقریباً ہر رات یہی ہوتا ہے۔ اُسے دیر تک منت زاری کر کے جب میں واپس لاتی ہوں، تو وہ شکایت کرتی ہے: 'مجھے کھیل کود کے لیے زیادہ وقت کیوں نہیں ملتا؟'"

"کیا کہتی ہے؟" کلاڈ نے حیرانی اور خوف سے پوچھا جیسے اُس نے جو بات سُنی اُس پر یقین نہ آیا ہو۔

"مجھے کھیل کود کے لیے زیادہ وقت کیوں نہیں ملتا؟" لالا نے دہرایا، تو وہ غصے سے چیخ اُٹھا:

"وہ ایسا نہیں کہہ سکتی ـــ بائی سنتھ کو ایسے نہیں کہنا چاہیے۔"

"کیوں؟" لالا اُس کے طرزِ عمل پر حیران رہ گئی۔ "اُسے ایسا کیوں نہیں کہنا چاہیے؟"

اس بات کا لالا کو جواب نہ ملا، کیونکہ کلاڈ باہر جا چکا تھا۔ اُس رات ڈنر پر جب دونوں اکٹھے ہوئے تو لالا نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ بائی سنتھ کے بے ضرر سے الفاظ پر اُس نے اس قدر غصہ کیوں ظاہر کیا، تو کلاڈ نے اس واقعے ہی سے انکار کر دیا اور اسے اُس کے واہمے کا ثمرہ قرار دیا۔

دُکھ کے ساتھ ساتھ اس بات نے لالا کو اور بھی اُلجھا دیا۔ اُس نے کلاڈ کا جائزہ لیا، تو وہ مطمئن ہوتے ہوئے بھی مضمحل نظر آیا۔ لاپروائی کے اظہار کے باوجود اعصابی دباؤ کے اثرات اُس کے چہرے پر بہت نمایاں تھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر اُسے پادری کی بات یاد آ گئی: "لگتا ہے وہ کسی غم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو یا کوئی یاد اُسے مارے ڈال رہی ہو۔"

• • •

اس بات کو زیادہ دن نہ گزرے تھے۔ ایک سہ پہر دونوں پائیں باغ میں گھوم رہے تھے۔ پچھلی رات شدید آندھی آئی تھی جس نے بھری شاخیں ننگی کر دی تھیں اور تناور درخت ہلا ڈالے تھے۔ اُن کے قدموں تلے درختوں سے گرے ہوئے پیلے سوکھے پتے آ رہے تھے۔ بائی سنتھ کے بالوں کی مانند سرخ پتے چاروں جانب پڑے تھے۔ باتوں باتوں میں حسبِ معمول ذرا ہی دیر بعد اُن کی گفتگو میں چہیتی بیٹی کا ذکر شامل ہو گیا۔ کلاڈ نے کہا:

"دوپہر کے کھانے پر میں نے محسوس کیا کہ بائی سنتھ کی رنگت زرد پڑ گئی ہے۔"

"ہاں،" لالا نے تائید کی۔ پھر اُسے کچھ یاد آیا: "تمہیں پتہ ہے کل رات وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی؟"

"کمرے سے باہر؟" کلاڈ کے لہجے میں حیرت اور خوف نمایاں تھا۔

"ہاں ـــ اُس کی آیا نے اُس کے جوتے اور موزے باہر پڑے دیکھے اور جب میں نے شریر لڑکی سے ڈانٹ کر پوچھا، تو اُس نے اعتراف کیا کہ وہ رات گئے باہر نکل گئی تھی اور دیر تک اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ ذرا سوچو کیسی عجیب بات ہے ـــــ میں نے بہت پوچھا، مگر اُس نے یہ نہ بتایا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے جب وعدہ لینا چاہا کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی، تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور باہر بھاگ گئی۔"

لالا نے جب تک یہ بات سنائی، کلاڈ اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تھا۔ زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے اُس نے کہا: "احمق لڑکی ـــ وہ نیند کو بھی وقت کا زیاں سمجھتی ہے ـــ مجھے یقین ہے وہ چند دنوں میں ...." بات ادھوری چھوڑ کر وہ بولا: "اوہ! ذرا اُدھر دیکھو، وہ کیا کر رہی ہے ـــ میں نے کسی بچے کو اتنی تیز بھاگ دوڑ کرتے نہیں دیکھا۔"

بائی سنتھ حویلی کے اُس سرے سے دوڑتی ہوئی آئی اور ماں باپ پر توجہ دیے بغیر تیزی سے آگے نکل گئی۔ یہ تیز رفتاری حیران کن تھی۔ اُس



کے چہرے پر تناؤ تھا اور پتلی پتلی ٹانگوں پر وہ یوں دوڑ رہی تھی جیسے کسی مقابلے میں حصہ لے رہی ہو اور ہر قیمت پر جیتنا چاہتی ہو۔ بالآخر وہ لان کے آخری سرے کے آخری درخت تک پہنچی اور اُسے چھوتے ہی فاتحانہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے سبزے پر لوٹیں لگانے لگی ـــ ماں باپ دونوں اُس کے پاس پہنچے۔

"واہ واہ شاباش! ـــ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔" کلاڈ نے اُسے تھپکی دی، تو اُس کی بڑی بڑی آنکھیں زیادہ تیزی سے دمکنے لگیں اور بے ترتیب سانسوں کے ساتھ بولی:

"ڈیڈی! میں تقریباً تقریباً مقابلہ جیت گئی ہوں نا؟"

"کیا؟" باپ نے ہنستے ہوئے کہا: "احمق لڑکی! تم مقابلہ کر رہی تھیں؟ اکیلے یہ کیسا مقابلہ تھا، ایک ٹانگ کا دوسری ٹانگ سے؟"

بائی سنتھ یہ بات سُن کر پریشان ہو گئی اور جواب کے لیے یا اس غیر متوقع سوال سے نروس ہو کر اُلجھنے لگی، تو اٹھی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"شریر کہیں کی!" لالا ہنسی، مگر یہ ہنسی پریشانی سے خالی نہ تھی۔ "ہر وقت دوڑتی بھاگتی رہتی ہے جیسے اسے کسی جگہ وقتِ مقررہ پر پہنچنا ہو ـــ کلاڈ! یوں لگتا ہے جیسے اسے اب کم سے کم میری ضرورت نہیں رہی۔ تمہیں یاد ہے وہ میرے ساتھ سونے کے لیے کتنی ضد کرتی تھی۔ اب میں کہتی ہوں، تو بھی نہیں مانتی۔ اپنے کمرے ہی میں سونا چاہتی ہے۔ کلاڈ! تمہیں یہ بات عجیب لگے گی، مگر میں جب بھی بائی سنتھ کے کمرے میں جاتی ہوں، تو یوں لگتا ہے جیسے میرا آنا اُسے ناپسند ہو، جیسے میں مداخلت بے جا کر رہی ہوں۔" لالا جس وقت یہ بتا رہی تھی، اُس کی رگوں میں خون کے ساتھ خوف کی لہر گردش کرنے لگی تھی۔ ہلکی سی کپکپاہٹ نے خود اپنی آواز کو بھی اُس کے لیے اجنبی بنا دیا تھا۔

"مداخلت بے جا؟" کلاڈ نے حیرانی سے پوچھا: "تمہیں یہ احساس کیوں ہوتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" اُس نے رُندھی آواز میں کہا اور مزید سوالوں سے بچنے کے لیے حویلی کی طرف پلٹ گئی اور کلاڈ ـــ اُس نے سیٹی بجا کر کتے کو بلایا اور سیر کے لیے نکل گیا۔

اُس شام لالا بیٹی کے کمرے میں گئی۔

"ہیلو لالا لنگ!" اُس نے بچی کو پیار کرتے ہوئے کہا: "آج رات تم ممی کے ساتھ سونا پسند کرو گی؟ ہم لوڈو کھیلیں گے اور مزیدار کہانیاں سُنیں گے۔"

ماں کی پیش کش پر بائی سنتھ کھل اٹھی، مگر ایک دم ہی اُس کے چہرے پر تناؤ آ گیا: "شکریہ ممی ڈارلنگ!" اُس نے جھجکتے ہوئے، مگر قطعی لہجے میں کہا: "میں صرف اپنے خوبصورت اور آرام دہ کمرے میں خوش رہتی ہوں ـــ میں یہاں سے چلی گئی، تو کمرہ اداس ہو جائے گا۔"

اس جواب پر جب ماں نے جانے سے پہلے اُسے شب بخیر کہا، تو خوشی سے اُس کا چہرہ کھل اُٹھا جیسے اُسے کسی مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔

• • •

اُس رات ڈنر کے بہت دیر بعد لالا بیڈ روم میں پہنچی، تو اُس کا شوہر وہاں موجود تھا۔ آتشدان کے پاس وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ زانوؤں پر ایک بند کتاب رکھی تھی جسے شاید کھولا ہی نہیں گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور درمیانی راتوں کے چاند کی کرنیں شیشے سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ آتشدان میں دہکتی ہوئی آگ کی سرخی اور چاندی ایسی چاندنی نے گلابی ستونوں پر جیسے ستارے سے ٹانک دیے تھے۔

"تم ابھی تک کہاں تھیں لالا؟" کلاڈ نے بیوی کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا کرتی رہیں؟"

"حماقت،" لالا نے جواب دیا۔ "تم اسے حماقت ہی کہتے ہو نا؟ ـــ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بائی سنتھ کے کمرے میں مجھے کیسے کیسے مضحکہ خیز احساسات گھیر لیتے ہیں ـــ آج بھی کافی پینے کے بعد میرے دل میں آپ ہی آپ اُس کے کمرے میں جانے کا خیال آیا ـــ غصہ مت کرو، میری بات دھیان اور سکون سے سُنو ـــ میں گئی، بلکہ یوں کہو مجھے کوئی کھینچ کر لے گیا جیسے میرا جانا ضروری ہو۔ جب میں راہداری میں تھی، تو سامان کے کمرے سے ایک دلدوز، اداس اور عجیب طرح کی آواز سنائی دی ـــ جیسے کوئی گنگنا رہا ہو۔ دروازہ کھولا، تو تمہیں پتہ ہے میں نے کیا دیکھا؟ میں نے دیکھا لکڑی کا گھوڑا آپ ہی آپ اوپر نیچے جھول رہا ہے اور اُس پر کوئی سوار نہیں۔"

"ہونہہ!" کلاڈ ہنسا۔ "بائی سنتھ نے تمہارے قدموں کی آواز سُنی ہو گی اور وہ گھوڑے کو جھلا دے کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی ہو گی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا" لارا نے کہا "میں بھاگ کر اُس کے کمرے میں پہنچی، تو وہ گہری نیند میں تھی۔"

"تب کسی ملازم نے یہ حرکت کی ہوگی۔"

"نہیں ـــ اُن میں سے کوئی اُوپر نہیں تھی۔ وہ سب کی سب نچلی منزل میں تھیں۔ جب میں دوبارہ سامان کے کمرے میں پہنچی، تو لکڑی کے گھوڑے کے ہلکورے بتدریج کم ہو رہے تھے۔ میں اُسے دیکھتی رہی اور وہ جلد ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔"

"ہونہہ" کلاڈ کھوکھلی ہنسی ہنسا "تم مجھے خوفزدہ کرنے کی بیکار کوشش کر رہی ہو۔"

مگر لارا نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا: "سب سے عجیب بات یہ تھی کہ جب لکڑی کا گھوڑا ہلکورے لے رہا تھا، تو اُس کی رکابیں کھنچی ہوئی تھیں ـــ اور وہ ایسے زاویے پہ تھیں جیسے کسی نے اُن میں پیر رکھے ہوں۔"

"بہت ہو چکی" کلاڈ نے انتہائی غصّے سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟ تم پڑھنے کے لیے کتابوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا کرو اور کھانے پینے میں بھی احتیاط کیا کرو ـــ ہونہہ لکڑی کا گھوڑا ہلکورے لے رہا تھا۔ باگیں کھنچی ہوئی تھیں، رکابیں ہوا میں تھیں۔ دنیا میں معجزے ہونے لگے۔" پھر کلاڈ کو جیسے کچھ یاد آیا "مگر ہائی سنتھ کو یہ گھوڑا کس نے دیا؟"

"کسی نے بھی نہیں ـــ ہمیں تو یہیں سے ملا ہے ـــ شاید تمہیں پتہ ہو۔ غالباً ڈیڈی نانا کا ہو گا۔ سرخ رنگ کی تھوتھنی اور سیاہ رنگ کی دُم والا گھوڑا ـــ کلاڈ تم جب سے یہاں آئے ہو کبھی سامان کا کمرہ نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"عجیب بات ہے۔"

"میں کیوں جاتا وہاں؟" وہ دہاڑا اور لارا خاموش ہو گئی۔ اس رویّے سے اُسے شدید صدمہ ہوا۔ اُسے لگا جیسے وہ اُس سے انتہائی نفرت کرتا ہے ـــ کیا یہ ممکن ہے؟ کلاڈ جیسا شریف، مہذب اور با اخلاق اپنی بیوی سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا شخص مستقل ایسا رویّہ اختیار کر سکتا ہے؟

"اوہ! میں شاید اپنا چشمہ وہیں بھول آئی" لارا نے پریشانی سے شبہات پانے کے لیے راہِ فرار کا انتخاب کیا۔ "میں ابھی اُٹھا کر لاتی ہوں ـــ بس دو منٹ میں۔" اس معذرت کے ساتھ ہی وہ اُوپر جانے کے لیے تیزی سے مُڑی۔ اُس کا خاوند غصیلی آنکھوں سے وہ عینک دیکھتا رہا جو بالکل سامنے میز پر اُسی جگہ پڑی تھی جہاں لارا نے آتے ہی رکھی تھی۔

پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی ـــ کلاڈ نے اُسے دیکھا، اُسے پتہ تھا کہ لارا سے اس وقت بات نہ کی گئی، تو وہ رات بھر پریشان رہے گی اور ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکے گی۔

"پھر کیا ہوا؟" اُس نے کھوکھلی ہنسی کے ساتھ لارا کو متوجہ کیا۔ "کوئی نئی کہانی؟"

لارا اُس کی جانب پُشت کر کے آتشدان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور فوراً جواب دیا جیسے وہ دل کی بات جلد سے جلد سُنا دینا چاہتی ہو۔ مگر اُس کی آواز اتنی مدھم تھی جیسے وہ خوف کے مارے اپنی بات خود بھی نہ سُننا چاہتی ہو۔ "کلاڈ! میں جیسے ہی سامان کے کمرے کے نزدیک پہنچی، میں نے سُنا کہ اندر گراموفون بج رہا ہے اور اندر سے تال دیتے اور ناچتے قدموں کی آوازیں آ رہی ہیں ـــ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا، تو اندر کوئی نہیں تھا ـــ تم یقین نہیں کرو گے کلاڈ! اندر کوئی نہیں تھا ـــ کوئی نہیں تھا ـــ مگر گراموفون پہ ریکارڈ بج رہا تھا:

آؤ بچّو دُھوم مچائیں۔
اچھلیں پُھدکیں لٹو گھمائیں۔
باہر آؤ کھیلیں کُودیں۔
لڑکیو لڑکو شور مچائیں۔

اس سے پہلے کہ میں بجلی کے سوئچ تک پہنچتی، ایک برفیلی ہوا نے ہوا کے جھونکے کی طرح مجھے مَس کیا اور جب تک میں کچھ سوچنے کے قابل ہوتی، وہ غائب ہو چکا تھا ـــ اپنا شبہ دُور کرنے کے لیے میں ایک دفعہ پھر ملازموں کے کوارٹروں کی طرف گئی۔ وہ سب وہیں موجود تھے، کوئی اُوپر نہیں گیا تھا ـــ میں ہائی سنتھ کے کمرے میں گئی۔ دبے پاؤں، بے آواز کہ اُس کی آنکھ نہ کھل جائے ـــ وہ گہری نیند میں تھی ـــ میں اُسے دیکھ ہی رہی تھی کہ میں نے کھڑکی پہ ایک ہلکی دستک سُنی ـــ ہو سکتا ہے یہ درخت کی شاخ ہو جو ہوا سے ہل رہی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا اس ہلکی آواز نے ہائی سنتھ کو جگا دیا ـــ وہ ایک لمحے میں پُوری طرح جاگ گئی جیسے اُس دستک کا انتظار کر رہی ہو۔ اُس کے چہرے پر ایسی شگفتہ مسکراہٹ تھی جیسے کسی عزیز ترین ہستی کا





خیر مقدم کر رہی ہو ـــ تب اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور تاثرات ایک دم بدل گئے ـــ وہ مجھے دیکھ کر ناراض ہو گئی ـــ ہاں اُس نے اپنی ماں کو انتہائی حقارت سے دیکھا اور کلاڈ میں بیان نہیں کر سکتی اُن آنکھوں میں کس قدر نفرت اور بیزاری تھی۔"

لارا کی کہانی کا آخری حصّہ ایک کراہ تھا۔ سسکتے سسکتے وہ بازو پھیلائے پلٹی، تو کلاڈ نے اُسے تھام لیا۔ "یہ ایک مستقل عذاب ہے۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے ماحول کی تبدیلی ضروری ہے۔ لارا ڈارلنگ! ہم تینوں کل ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ بہت دن رہ لیے ـــ ہم لندن چلے چلیں گے۔ ہائی سنتھ وہاں جا کر خوش ہوگی ـــ تمہیں یہ بات پسند ہے؟"

"ہاں" لارا نے شوہر کے بازوؤں میں سمٹتے ہوئے کہا۔ اُس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ایک بار پھر محبتوں کے آسمان پہ پرواز کر رہی تھی۔ اس محبت کے ہوتے ہوئے اُسے پروا نہیں تھی کہ اُن کی اگلی رہائش کہاں ہوگی۔ "کلاڈ کی محبت اُسے حاصل ہے" اُس نے سوچا "تو کسی مقام سے کوئی فرق نہیں پڑتا" لارا شاید بہت پہلے ہی اپنے لاشعور میں فیصلہ کر چکی تھی کہ یہ جگہ چھوڑ دے گی جسے وہ جنّت سے تعبیر کرتی رہی ہے۔

رات کو اُن دونوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اگلے ہی دن وہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ مگر افسوس صد افسوس صبح ہوئی، تو اُن کا منصوبہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ہائی سنتھ کے پیر میں اس بُری طرح موچ آئی کہ وہ زمین پہ پاؤں رکھنے سے بھی قاصر ہو گئی۔ لارا کو جب یہ خبر ملی، تو بدحواس ہو کر وہ اپنی بیٹی کے کمرے میں پہنچی۔ ہائی سنتھ اپنے بستر پہ نیم دراز تھی، شرمندہ اور پشیمان سی۔

"میری جان! یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"ممی میں شرمندہ ہوں" ہائی سنتھ بولی۔ "میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ آپ ناراض نہ ہوں ـــ میں کل رات بھی کمرے سے باہر گئی تھی۔"

"تم باہر گئی تھیں!" ماں نے غصّے سے پوچھا اور اثبات میں جواب ملا، پھر اُس نے کہا "ڈارلنگ! تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب رات کو کمرے سے نہیں نکلو گی۔"

"مجھے افسوس ہے ممی! ـــ مگر رات اتنی حسین اور چاندنی ایسی خوبصورت تھی کہ میں سب کچھ بھول گئی۔ میں انکار کر ہی نہ سکی۔"

"تم جتنی جلد [illegible] انکار کرنا سیکھ جاؤ بہتر ہے ـــ اب میں تم پہ ہرگز ہرگز بھروسہ نہیں کروں گی۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی، اس لیے میں فی الحال تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ خبردار! اب جو اس قسم کی حرکت کی۔ یہ تو بتاؤ ہوا کیا؟ کس حماقت کی وجہ سے زخمی ہوئیں؟"

"میں گر گئی تھی" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"دوڑتے ہوئے؟"

"نہیں!" ہائی سنتھ نے کہا۔ پھر جھجکتے جھجکتے اُس نے بات پُوری کی "میں ایک درخت پہ چڑھ رہی تھی۔"

"تم درخت پہ چڑھ رہی تھیں؟" وہ سُن ہو کر رہ گئی اور بیٹی کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر تو جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ "تم درخت پہ چڑھ رہی تھیں؟ توبہ ہے خدایا! ـــ تمہاری تو ٹانگ ٹوٹ سکتی تھی اور تم تمام رات وہیں کھلے آسمان کے نیچے پڑی رہتیں ـــ درخت کونسا تھا؟"

"تالاب کے آگے والا درخت ـــ وہی جس کی لکڑی سے ڈیڈی نے اپنے لیے ایک جھونپڑی بنائی تھی جب وہ بچّے تھے ـــ جس شاخ پہ میں کھڑی تھی وہ ٹوٹی اور میں...."

"چلو جانے دو ـــ جو ہوا ٹھیک ہوا تمہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی اس لیے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ڈاکٹر کے آنے تک چپ چاپ بستر پہ پڑی رہو۔"

ڈاکٹر کے رخصت ہونے کے بعد لارا وہ درخت دیکھنے گئی، تو ٹوٹی ہوئی شاخ کی بلندی دیکھ کر دہشت زدہ رہ گئی۔ اُس کے نزدیک یہ ایک معجزے سے کم نہ تھا کہ اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود وہ زندہ رہی ـــ حیرتوں میں گھری ہوئی وہ بیٹی کے پاس پہنچی۔

"تمہارا مطلب ہے تم اُس شاخ سے گری ہو جو سب سے اُونچی ہے؟"

"ہاں" اُس نے اعتراف کیا۔

"مگر میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اتنی اونچائی تک چڑھ سکتی ہو" لارا نے کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کسی کی مدد کے بغیر اُس شاخ تک پہنچ گئی تھیں۔"

"مدد تو میں نے لی تھی" ہائی سنتھ نے کہا "مگر وہ تو سب سے اُونچی شاخ تک آسانی سے پہنچ گئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں لمبی لمبی ہیں نا۔"

"وہ؟ ـــ وہ کون؟؟؟" لارا نے حیرت سے پوچھا، تو ہائی سنتھ پریشان ہو گئی کہ کیا بک گئی ہے جیسے کوئی راز کھل جائے یا چوری پکڑی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جاتے۔ اُس کا چہرہ شرم اور پریشانی سے سُرخ ہوگیا اور ماں کی خوشامد کے لیے وہ اُس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہُوئے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر بولی:

"ڈیڈی کو مت بتایئے ــــــ خدا کے لیے کبھی نہیں!"

بس یہی جذباتی لمحہ تھا جب اُس کے مُنہ سے کوئی بات نکل پڑی، اُس نے چُپ سادھ لی۔ پہلے تو لارا نے کریدنا چاہا، مگر بیٹی کو اس قدر پریشان دیکھ کر وہ چُپ ہو رہی۔ اُس نے مُنہ پھیر لیا، تو ہائی سنتھ کو ہلکا ہلکا بخار شروع ہوگیا تھا۔ ماں کو بیٹی کی عادتوں کا علم تھا کہ وہ بہت حساس ہے اور ذرا ذرا سی بات کا بہت اثر لیتی ہے، اس لیے اُس نے خاوند کو یہ بات نہیں بتائی، مگر وہ اپنے آپ سے بار بار یہی سوال کرتی رہی کہ وہ اس قدر اُونچی شاخ پر کیسے چڑھ گئی۔ شوہر کو اس لیے نہ بتا سکتی تھی کہ اُسے تو اب ذرا ذرا سی بات پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ پہلے جیسا رہا ہی نہ تھا۔

اگلے دن ہائی سنتھ کی طبیعت کچھ بہتر تھی اس لیے لارا نے اُس سے کچھ پُوچھ گچھ کرنا چاہی، مگر سوال کے پہلے ہی لفظ پر بچی کا پھُول سا چہرہ مرجھا گیا اور آنکھوں میں بیزاری کے ایسے جذبات اُبھرے کہ ماں کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔

اُس دن کے بعد ہائی سنتھ کے لیے لارا کے پیار میں کمی تو نہیں آئی، مگر اُس کا رویّہ سخت ہوگیا اور ہر وقت اُس کی نگرانی کرنے لگی۔ کلاڈ نے اگرچہ بات بے بات ناراض ہونے کی عادتیں تقریباً ترک کر دیں اور ایک بار پھر پہلے جیسا مہذب اور شائستہ ہوگیا، مگر وہ زیادہ مایوس اور انتہائی دل گرفتہ نظر آنے لگا تھا ــــــ لارا کو بھی یقین ہوگیا تھا کہ یہ حویلی اُنہیں راس نہیں آئی۔ اسی لیے وہ اُسے چھوڑنا چاہتی تھی مگر ہائی سنتھ نے یہ نیا گُل کھلا دیا اور صحت یاب ہونے میں اُسے عرصہ لگ گیا۔

ہائی سنتھ کا رویّہ بستر میں جکڑے ہُوئے بچوں جیسا ہرگز نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو ہر چیز سے بے نیاز رکھنے کی عادت تیزی سے اپنا رہی تھی۔ ماں جب اُس کے پاس بیٹھ کر کسی دلچسپ کتاب سے کچھ سُنانے لگتی، تو اُسے جلد ہی احساس ہو جاتا کہ بچی ایک لفظ بھی نہیں سُن رہی۔ چُپ چاپ کسی تاثر کے بغیر وہ خلاؤں میں گھورتی رہتی اور اُس کے چہرے پر خوشی اُسی وقت آتی جب ماں کتاب بند کر دیتی۔ وہ جانے لگتی تو ہائی سنتھ کی خوشی قابلِ دید ہوتی۔ وہ تکیے سے سر اُٹھاتی، ہاتھ اُٹھا کر ماں کا شکریہ ادا کرتی اور ایسا سکون بھرا سانس لے کر مُسکرا اُٹھتی جیسے مصیبت کی گھڑیاں ختم ہوگئی ہوں۔ لارا اگرچہ اُس کے رویّے کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی رہتی، مگر ماں آخر ماں ہے اور ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ایک دن وہ پھٹ ہی پڑی:

"سنتھ! یہ سب کیا ہے؟ ــــــ تم ہر وقت کیوں انتظار کرتی رہتی ہو کہ میں تمہارے پاس سے چلی جاؤں؟"

"میں؟" ہائی سنتھ کے حساس چہرے پر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی، وہ جیسے اس سوال کی متوقع ہو، مگر جواب سے بھی بچنا چاہتی ہو۔ "میں انتظار کرتی رہتی ہُوں کہ آپ چلی جائیں؟ ــــــ ممی! آپ کو یہ خیال کیونکر آیا؟؟"

اور پھر ماں کے خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے وہ اُس سے بے سر و پا اور بے معنی باتیں کرنے لگی۔ بلّی کے بچے، نیا مالی، وہ گھوڑی جس نے اُسے پیٹھ سے گرا دیا تھا، ایسی ہی بے ربط باتیں جو اُس کے دماغ میں آتی رہیں، وہ بھاری دل اور اپنی زیادتی کے احساس کے ساتھ کرتی رہی اور لارا بھی اُس کی ان باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرتی رہی۔

بیٹی کے ناقابلِ فہم رویّے کا ماں کو اب تک عادی ہو جانا چاہیے تھا، مگر اُسے ہر روز قدم قدم پر نت نئی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایسی ہی حیرانی اُسے اُس وقت ہُوئی جب ہائی سنتھ نے لکڑی کا گھوڑا اپنے کمرے میں رکھوانے کی فرمائش کی اور اپنی بات پہ اڑ گئی۔ لارا نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ ڈارلنگ وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے، وہ وہیں سامان کے کمرے میں ٹھیک ہے، وہاں دوسرے کھلونے بھی رکھے ہیں ــــــ وہ کمرے کی ساری جگہ گھیر لے گا اور پھر ایسے گھوڑے کا فائدہ جس پر تم سواری نہ کر سکو، مگر وہ "بس میں یہی چاہتی ہُوں" کی رٹ لگائے گئی اور آنسو بہا بہا کر بُرا حال کرتی گئی تا آنکہ وہ گھوڑا لا کر اُس کی پائنتی رکھ دیا گیا۔

اُس شام جب لارا اُس کے کمرے میں گئی، تو اُس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہائی سنتھ نے گفتگو کا آغاز ہی ایسے کیا کہ رنج و غم سے وہ پتھر ہو کر رہ گئی۔ تیوری پر بل ڈال کر اُس نے بیزاری سے ماں کو دیکھا۔

"ممی! کیا میں اتنی بڑی نہیں ہوگئی کہ لوگ آنے سے پہلے اطلاع پہلے دستک دے دیا کریں ــــــ ممی! آپ نے مجھے ہمیشہ نصیحت کی



ہے کہ میں آپ کے کمرے میں جانے سے پہلے دستک دیا کروں۔"

صدمے سے نڈھال لارا نے مشکل سے اپنے حواس مجتمع کیے، تو ہائی سنتھ نے لاتعلق سی ہو کر لکڑی کے گھوڑے پر نظریں جما دیں۔ لارا نے اُس طرف دیکھا جدھر وہ دیکھ رہی تھی، تو اُسے معلوم ہُوا کہ حیرتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہُوا، ابھی کچھ اور دیکھنا ہے۔

لکڑی کا گھوڑا ہلکورے لے رہا تھا۔

"تم بستر سے اُتری تھیں ہائی سنتھ؟"

"نہیں تو ــــــ کیوں؟"

"بس یونہی ــــــ میں نے سوچا تم بہت شریر ہوگئی ہو، بستر سے اُتر کر گھوڑے پر سواری کرتی رہی ہوگی۔ میں جب کمرے میں آئی، تو یہ حرکت میں تھا ــــــ مگر نہیں ــــــ یہ میرا وہم ہوگا۔"

اس پر ہائی سنتھ مسکرا دی۔ پُراسرار ناقابلِ فہم مسکراہٹ!

"ممی! آپ مجھے کوئی اچھی سی کتاب پڑھ کر سُنا دیں۔" بات ٹالنے کے لیے اُس نے فرمائش کی اور لارا تو تیار ہو کر آئی تھی، کتاب کھول کر پڑھ گئی۔

"ڈارلنگ! سب سے پہلے میں تمہیں ایک خوش خبری سُنانا چاہتی ہُوں۔" اُس نے بڑے پیار سے کہا: "ڈاکٹر نے کہا ہے تم ایک ہفتے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور ہم اگلے ہی دن لندن چلیں گے۔"

"کیا؟" ہائی سنتھ نے جیسے انتہائی ناخوشگوار بات سُنی ہو۔ "آپ مجھے لندن لے جائیں گی؟"

"ہاں ــــــ ہم وہاں خوب گھومیں گے، سیر کریں گے۔"

اور ہائی سنتھ سسک سسک کر رونے لگی ــــــ "او نہیں ممی! ــــــ نہیں ــــــ نہیں نہیں ــــــ ممی پلیز! مجھے یہاں سے نہ لے جائیں ــــــ میں نہیں جا سکتی ــــــ میں جانا نہیں چاہتی ــــــ کبھی نہیں ــــــ مَر نہیں جاؤں گی!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" لارا کو غصہ آ گیا۔ "کیا احمقانہ باتیں کر رہی ہو! لندن کیسا حسین شہر ہے! ہم تمہیں چڑیا گھر لے جائیں گے، عجائب گھر لے چلیں گے۔ ہم اُن تمام جگہوں پر چلیں گے جن کا ذکر کبھی تم بڑے شوق سے کرتی رہی ہُوں!" مگر وہ چُپ نہیں ہُوئی، سسک سسک کر روتی رہی۔

"او نہیں ــــــ ممی پلیز! مجھے اس خوبصورت جگہ سے کہیں نہ لے جائیں ــــــ میں نہیں جانا چاہتی!"

"ہائی سنتھ ڈارلنگ!" سختی سے کام نہ چلتے دیکھ کر اُس نے پیار سے بچی کے آنسو پونچھتے ہُوئے کہا: "مجھے پتہ ہے تم یہاں رہنا چاہتی ہو، مگر انسان ساری زندگی ایک جگہ تو نہیں رہ سکتا۔ سیر و تفریح بھی ضروری ہوتی ہے ــــــ دیکھو جب ہم گھوم پھر کر واپس آئیں گے، تو یہ جگہ اور بھی اچھی لگے گی۔"

"مَیں کچھ نہیں جانتی ــــــ میں یہاں رہنا چاہتی ہُوں ــــــ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی ــــــ پلیز مجھے نہ لے جائیں ــــــ پلیز پلیز پلیز!" ہائی سنتھ جیسے صدمے سے پاگل ہونے لگی اور اُس کی یہ حالت دیکھ کر ماں کو اپنا رویّہ پھر بدلنا پڑا۔ دل پر پتھر رکھ کر اُس نے سختی سے کہا:

"ہائی سنتھ! خاموش ہو جاؤ ــــــ اب میں اس معاملے میں کوئی بات نہ سنوں!" اس کے بعد لارا نے بظاہر پُرسکون آواز میں کتاب پڑھنی شروع کی، مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ ہائی سنتھ ایک لفظ بھی نہیں سُن رہی تھی۔

اگلے دن جب لارا نے ہائی سنتھ کو بتایا کہ اُن کے سفر کے انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں، تو اُس نے کسی ہنگامے کے بغیر سکون سے یہ بات سُن لی، مگر صاف ظاہر تھا کہ اُسے یہ بات پسند نہیں اور یہ سب کچھ اُس کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہے۔ سوچ میں ڈوبی آنکھیں اور ننھے پیلے چہرے پر کشمکش کے آثار اُس کے اندرونی اضطراب کا پتہ دے رہے تھے۔

"یوں لگتا ہے۔" لارا نے اپنے خاوند کو بتایا۔ "وہ اپنے آپ کو منانے کی کوشش میں لگی ہے۔"

"اپنے آپ کو منانے کی کوشش؟" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "کیا احمقانہ بات ہے! ــــــ تم اسے سمجھ ہی نہیں سکی ہو۔"

"ہاں۔" ٹھنڈی سانس بھر کر اُس نے اعتراف کیا۔ "میں اُسے سمجھ ہی نہیں سکی۔"

• • •

لارا نے کرسمس پہ زیادہ وقت ہائی سنتھ کے لیے کرسمس کے درخت کی تیاری اور سجاوٹ میں گزارا۔ دمکتے گولے، چمکیلی پنیوں میں لپٹے ہُوئے تحفے، الیکٹرک لائٹس اور جھل جھل کرتے ستارے، جب ہر طرح کی آرائشات سے سجے ہُوئے درخت کو لے کر وہ اُوپر پہنچی، تو ہائی سنتھ خوشی سے بے قابو ہو کر تالیاں پیٹنے لگی۔ ماں نے درخت وہیں رکھا اور بیٹی سے ایک گھنٹے بعد واپس آنے کا کہہ کر چلی آئی۔ جاتے ہُوئے اس نے کہا:

"میں گھر کا کام کاج دیکھ کر ابھی آتی ہُوں اور موم بتیاں خود روشن

www.iqbalkalmati.blogspot.com



رکھنا بھی۔ مگر ایک گھنٹے بعد جب وہ آئی تو پہنچی، تو موم بتیوں کی روشنی سے جگ مگ جگ مگ کرتا روشن کمرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بانی سنتھ تو نیند میں تھی، مگر دروازہ کھلنے کی آواز پر اُٹھ بیٹھی۔ لارا نے سمجھا کہ اُس کی بیٹی نے اپنی آیا سے موم بتیاں روشن کرائی ہوں گی۔ اُس نے ہنستے ہُوئے بیٹی کو فہمائش کی:

"جب مَیں نے کہا تھا مَیں آ رہی ہُوں، تو تم نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ ــــ چلو کوئی بات نہیں۔ لاؤ ہم پٹاخوں کو کوٹری میں پرو دیں۔"

اس پر وہ پشیمان ہو گئی۔ اُس نے اشارے سے ماں کو سمجھایا۔ وہ دونوں پٹاخے چلائے جا چکے تھے۔ اُن کے خالی خول اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

"جی! مَیں شرمندہ ہُوں مَیں انتظار نہیں کر سکی۔ مجھے موم بتیوں کی روشنی اچھی لگتی ہے ــــ مَیں نے انہیں روشن کر کے پٹاخے بھی چلا دیے ــــ ممی اس دفعہ مجھے آتش بازی کے کھلونے نہیں ملیں گے؟"

"نہ بیٹی! وہ کھلونے بہت خراب ہوتے ہیں، انتہائی خطرناک۔"
"او نہیں ممی! کہاں خطرناک ہوتے ہیں؟ پلیز مجھے منگوا دیجیے ــــ کیسے منگوائیں گے نا؟ اچھا مَیں ڈیڈی سے کہوں گی۔ اُنہوں نے وعدہ کیا تھا کرسمس پر وہ میری ایک فرمائش ضرور پوری کریں گے ــــ جو کھلونوں کی منگوائیں گے۔"

لارا وہاں سے اُٹھ کر بچی کی آیا کے پاس گئی۔
"موم بتیاں جلانے سے پہلے تم نے مجھ سے پُوچھ تو لیا ہوتا؟" اُس نے اُسے ڈانٹا۔ "یہ خطرناک نہیں کہ بانی سنتھ کو ان جلتی ہُوئی موم بتیوں کے ساتھ کمرے میں اکیلے چھوڑ دیا جائے؟ ــــ موم بتیوں سے عموماً عمارت میں آگ لگ جاتی ہے ــــ مَیں حیران ہُوں تم نے یہ سب کچھ کیوں نہیں سوچا۔"
"مگر مادام مَیں نے تو موم بتیاں روشن نہیں کیں۔" آیا نے کہا۔ "مَیں تو دو گھنٹے سے کمرے کی طرف بھی نہیں گئی۔"

اس جواب پر لارا تقریباً دوڑتی ہُوئی بانی سنتھ کے کمرے میں واپس پہنچی۔ "بانی سنتھ! مَیں تمہیں کرسمس کے دن ڈانٹنا نہیں چاہتی، مگر تم نے شرارت کی انتہا کر دی۔ تم بستر سے اُتریں اور موم بتیاں جلائیں ــــ تمہیں سختی سے منع کیا گیا تھا کہ زمین پر پاؤں نہ رکھنا۔"
"مجھے معاف کر دیجیے ممی! ــــ مَیں شرمندہ ہُوں۔" بانی سنتھ نے شرمندگی کا زبانی اظہار تو کیا، مگر اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اُسے بہت سکون ملا ہو۔ اُس نے جوشِ محبت میں ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ شاید وہ جانتی تھی کہ ماں کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے۔

بالآخر ایک دن بانی سنتھ کا پاؤں ٹھیک ہو گیا اور ڈاکٹر نے اُسے سفر کی اجازت دے دی اور اس مختصر سے خاندان نے اگلے ہی دن یہ مقام چھوڑنے کا قطعی پروگرام بنا لیا۔ اُس شام کلاڈ اپنے ایک لنگوٹیے دوست کے گھر مدعو تھا جو حویلی سے چار میل دُور رہتا تھا ــــ دعوت پر جانے سے پہلے وہ بیٹی کو خدا حافظ کہنے اُس کے کمرے میں گیا، تو وہ سامان باندھنے کا کام ادھورا چھوڑ کر باپ سے لپٹ گئی۔
"اوہو میری ننھی کا ستیاناس نہ کرو۔" باپ نے ہنستے ہُوئے بیٹی کو دھکیلنا چاہا۔
"جہنم میں جائے ننھی۔" اُس نے بدستور باپ کے گلے میں جھولتے ہُوئے کہا۔ "ڈیڈی! آپ کتنے اچھے ہیں۔ اتنے اچھے کہ اتنے اچھے کہ بس۔ ڈیڈی! آپ کا شکریہ ــــ مجھے آتش بازی والے کھلونوں کا بکس مل گیا ہے ــــ یہ آج ہی کی ڈاک سے ملا ہے ــــ دیکھیے بکس پر کتنی خوبصورت تصویریں بنی ہیں ــــ ہے نا شاندار؟"
"اوہ! تو یہ بکس آ گیا۔" اُس نے بیٹی کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہُوئے کہا، پھر ایک دم لہجہ بدل کر پیار سے ڈانٹا۔ "دیکھو خبردار جو تم نے اسے چھوا بھی ــــ مَیں خود اسے کھولوں گا۔ لاؤ مجھے دو ــــ مَیں اسے الماری میں بند کر دوں۔"
"اوہ ڈیڈی! نہیں ــــ اسے میرے پاس ہی رہنے دیں ــــ مجھے یہ تصویریں اچھی لگتی ہیں۔"
"بالکل نہیں ــــ مجھے تم پر ذرا بھروسہ نہیں ــــ تم اسے کھول لوگی۔"

بانی سنتھ پریشان ہو گئی۔ ایک دم اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور چلائی: "ڈیڈی! ڈیڈی! دیکھیے۔" اُس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "کیسا شاندار اُلّو ہے! برف جیسا سفید۔"
"کہاں؟" کلاڈ ترنگ میں آ گیا۔
"اوہو! اُدھر دیکھیں۔ اُدھر کیوں دیکھ رہے ہیں؟ ــــ وہ دیکھیں میری انگلی کی سیدھ میں۔"
"بھئی کدھر؟" وہ زچ ہونے لگا تھا۔



"نکلیں! وہ چیڑ کے ٹاور کے ساتھ والی شاخ پر بیٹھا ہے۔" کلاڈ نے کوشش کی مگر اُسے اُلّو دکھائی نہیں دیا۔ اُس کی آنکھیں اُس وقت انگلی کی سیدھ میں اُلّو تلاش کر رہی تھیں جب ملازم نے آ کر کار تیار ہے۔
"لعنت بھیجو اُلّو پر۔" اُس نے کہا۔ "میرا دوست وقت کا بڑا پابند ہے۔"

اُس نے بیٹی کو پیار کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ آتش بازی والے کھلونوں کا بکس اُسے یاد ہی نہیں رہا جسے بیٹی سے لے کر اُس نے میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ جب کار میں بیٹھ رہا تھا، تو اُس نے اُلّو کی آواز سُنی۔ خیال آیا کہ بانی سنتھ بڑی مہارت سے جانوروں کی آوازیں نکالتی ہے۔ یہی سوچ کر اُس نے اُوپر دیکھا تو وہ کھڑکی میں جھکی ہُوئی مُنہ پر ہاتھ رکھے اُلّو کی آوازیں نکال رہی تھی۔ باپ کو متوجہ دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کلاڈ نے بناوٹی غصے سے اُسے ڈانٹا:
"چڑیل کہیں کی! اب سو جاؤ۔"
جواب میں بانی سنتھ نے ہاتھ ہلایا: "خدا حافظ ڈیڈی ــــ خدا حافظ۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

•••

سردی شدید تھی، مگر تاروں بھری رات اس قدر سہانی تھی کہ کلاڈ نے گاڑی وہیں چھوڑ دی اور فطرت کے حُسن سے لطف اندوز ہوتا ہُوا پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے دوست سے عرصے بعد ملا تھا۔ ایک دوسرے سے کہنے سُننے کو اُن کے پاس بہت کچھ تھا، اس لیے کلاڈ کو وہاں دیر ہو گئی اور نصف رات گزرنے کے بعد ہی اس کا دوست اُسے رخصت کرنے پر راضی ہُوا ــــ اُس وقت چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف اس کے قدموں کی چاپ تھی یا کبھی کبھار دُور سے آتی ہُوئی اُلّو، گیدڑ یا سردی سے ٹھٹھرتے ہُوئے کسی آوارہ کُتے کی آواز اس سکوت کو توڑ دیتی تھی ــــ رات کے اس بے کراں سناٹے اور آسمان پر ہر سمت پھیلی ہُوئی تاروں کی مدھم روشنی نے ماحول کو کچھ عجیب سا بنا دیا اور کسی وجہ کے بغیر اس بھری پُری دُنیا میں خود کو تنہا محسوس کر کے وہ اُداس ہو گیا۔ اُس کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ ماضی کی یادوں اور حال کے خیالات نے اُسے تنہا پا کر بُری طرح گھیر لیا۔
حال ــــ جس میں کلاڈ نے ایک ایک لمحہ اپنے ماضی کو بھلانے میں صرف کیا۔
ماضی ــــ جو اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

تب یادیں جن سے وہ پیچھا چھڑا رہا تھا، دُھند بن کر اُس پاس دُور دُور تک پھیل گئیں اور اُس کا ذہن خود بخود اُن کا اسیر ہو گیا۔ وہ ماضی جسے اُس نے ہمیشہ حال میں گم رہ کر بھلانا چاہا تھا، اُس کے لیے زنجیر بن گیا اور زمان و مکان سے بے نیاز یادیں آئینہ بن کر سامنے آنے لگیں۔

کلاڈ کو اپنے حسب نسب سے بہت پیار تھا۔ اُس نے اپنی قابلِ فخر وراثت کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ اُس کے چہرے پر غم و اندوہ کی پرچھائیاں اُس کے چاہنے والوں کو پریشان رکھتی تھیں۔ یہ غم و اندوہ اس لیے تھا کہ وہ کچھ بھولنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی یاد جس نے اُس کے لاشعور، ہوش و حواس پر پنجے گاڑ دیے تھے، جسے بھولنے کے لیے وہ خود سے جنگ کرتا رہا تھا، ہزار جتن کر چکا تھا، مگر بارہ برس کی تپسیا آج ضائع ہوتی نظر آ رہی تھی۔

بارہ برس پہلے ــــ اسی وقت ــــ ایسی ہی ایک تاروں بھری رات وہ آج ہی کی طرح اپنی موروثی حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ "منکن ہال" جو اُس کے لیے بچپن ہی سے جنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ رُوئے زمین پر ایسی حسین اور پُرشکوہ عمارت دوسری نہیں ہو سکتی۔ اُسے حویلی سے اس قدر محبت تھی کہ وہ اکثر اُس کے بارے میں سوچتا رہتا، مگر بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اُسے مل نہیں سکتی تھی۔ جائیداد کے بالفعل وارث رنڈوے اور اپاہج بھائی کی موت کے بعد وہ قانوناً اُس کی بیٹی ڈیانا کو منتقل ہونی تھی۔ کلاڈ اپنی محبت کے اس مرکز کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا کہ کچھ عرصے بعد دس سالہ ڈیانا جوان ہو جائے گی، وہ شادی کرے گی اور یہ حسین یادگار کسی اجنبی کے قبضے میں چلی جائے گی۔
انہی سوچوں میں گم وہ کھیتوں میں چلا جا رہا تھا کہ حویلی نزدیک آ گئی اور پھر اُس کے کانوں سے خوفناک آوازیں ٹکرانے لگیں۔ لوگوں کی چیخ پکار کی آوازیں جو چرچ کے بڑے ٹاور کے بے وقت بجنے والے گھنٹے کی آوازوں میں دب کر رہ گئیں۔
"آگ ــــ آگ۔" آوازیں ہی آوازیں۔
"اوہ خدایا!" دہشت زدہ ہو کر وہ دوڑتا ہُوا حویلی تک پہنچتا ہے جہاں اُس کی آنکھیں دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل دیکھتی ہیں، حویلی کے ایک حصے سے اُٹھتے ہُوئے شعلے سب کچھ چاٹ جانے کی فکر میں نظر آتے ہیں اور اُن کی زد میں آئی ہُوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی منحوس آوازیں کانوں میں پڑ رہی ہیں ــــ تیزی سے دوڑتا ہُوا وہ لان میں پہنچتا ہے ــــ

بوکھلائے ہوئے نوکر ابھی ابھی کسی کو لے کر حویلی سے نکلے ہیں۔ یہ اُس کا اپاہج بھائی ہے۔ کلاڈ اُس کی طرف دوڑتا ہے۔ بڑا بھائی اپنے معذور جسم کو حرکت دینے کی کوشش میں ناکام ہو کر بے آواز رو رہا ہے۔ بھائی کو دیکھ کر وہ سسک اُٹھتا ہے اور حویلی کی طرف اشارہ کر کے صرف اتنا کہتا ہے "ڈیانا! ——— ڈیانا!! ——— ڈیانا!!!"

کلاڈ کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو چکا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ڈیانا کا کمرہ شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ فائر بریگیڈ ابھی تک نہیں پہنچا۔ خطرے کی گھنٹیاں ذرا دیر پہلے ہی بجنا شروع ہوئی ہیں اور نوکروں کو جاگے ہوئے بھی دیر نہیں ہوئی۔ آگ آناً فاناً پھیل ہے، اس لیے وہ اس وقت تک صرف اپنے معذور آقا کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ بچی کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ وہ گرمی سے جاگ کر خود ہی باہر نکل آئے گی، مگر افسوس وہ سوتی ہوئی اپنے کمرے میں گھر کر رہ گئی تھی۔

بھائی کو تسلیاں دے کر کلاڈ حویلی میں گھستا ہے۔ آتش زدہ حصے کو جانے والا راستہ دھوئیں سے بھر چکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے دھوئیں سے لڑتا، شعلوں سے بچتا اُوپر پہنچتا ہے۔ سامان والے کمرے تک، جہاں ڈیانا کے کھلونے بھی رکھے تھے، آگ پہنچ گئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر وہ اندر کودتا ہے۔ ڈیانا وہاں باہر کھلنے والی کھڑکی کے نزدیک فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ دھوئیں کی زیادتی اور آگ کی گرمی نے اُس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ پلنگ سے اُتر کر وہ دوڑتی ہوئی کھڑکی تک پہنچی ہوگی، مگر کھڑکی کھولنے سے پہلے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

کلاڈ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی اپنی پیاری بھتیجی کو دیکھتا ہے اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ اپنے آپ کو یہ کارنامہ انجام دیتے اور بھائی کی آنکھوں سے خوشی کے چمکتے آنسو دیکھ لیتا ہے۔ اُس کے لیے یہ ذرا مشکل نہ تھا کہ وہ بچی کا ہلکا پھلکا بوجھ اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھائے اور سیڑھیاں اُتر کر کھلی فضا میں لے جائے ——— مگر اسی کے ساتھ اُس کے ذہن میں ایک اور خیال آ جاتا ہے۔ بچی کو اسی طرح فرش پر پڑی رہنے دیا جائے۔ وہ بے ہوش ہے۔ قطعی طور پر حواس سے بیگانہ، ہر آفت سے بے خبر ——— وہ اسی طرح گہری کبھی نہ ختم ہونے والی نیند سو جائے گی اور کلاڈ کا مستقبل ——— اُس کی موروثی حویلی . . . .

اُس کے لاشعور نے پتہ نہیں کیا فیصلہ کیا اور اُس کے جسم نے آپ ہی آپ بے چون و چرا اُس کا ساتھ دے دیا۔

"تُم نے یہ فیصلہ خود نہیں کیا ——— یہ میرا فیصلہ ہرگز نہیں" اس دن کے بعد اُس نے جب بھی اس بارے میں سوچا، خود کو یہی کہہ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ آگے جھک کر بچی کا ہلکا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ ڈیانا کے تپتے ہوئے سرخ بال چچا کے چہرے پر بکھر جاتے ہیں اور اگلے ہی لمحے وہ اُسے وہیں چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور نیچے پہنچ کر چلاتا ہے:

"وہ اس طرف نہیں ہے ——— وہ یہاں نہیں ہے۔"

جواب میں وہ اپنے بھائی کی ایک دلدوز چیخ سنتا ہے جو اُس کے منہ سے نکلنے والی آخری آواز تھی۔ پھر تو مرتے دم تک وہ پتھر کی طرح خاموش رہا۔

فائر بریگیڈ آ جاتا ہے۔ کلاڈ آگ بجھانے والوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ وہ انہیں ایک ایک کمرے میں لے جاتا ہے۔ سوائے ڈیانا کی خوابگاہ کے۔ وہ دیکھتا ہے متاثرہ حصے کی چھت کا بڑا حصہ گر گیا ہے۔ آگ بجھائی جا چکی ہے اور ڈیانا کی جلی ہوئی معصوم لاش مل گئی ہے۔

"بدقسمتی سے بدنصیب بچی نے پلنگ کے نیچے پناہ لی تھی۔ اس لیے اُس کا بہادر چچا جان کی بازی لگانے کے باوجود اُسے دیکھ نہیں سکا۔" آگ بجھانے والے کہتے ہیں اور ڈیانا کا بدنصیب باپ بے حس و حرکت آنکھیں آسمان پر جمائے پڑا رہتا ہے۔ اُس کی آنکھ میں اب آنسو نہیں، مگر ایسا کرب ہے جو پتھروں کو پگھلا سکتا ہے۔

• • •

کلاڈ گزرے وقت کے ایک ایک لمحے کو ایسے جیتا جاگتا دیکھ رہا تھا جیسے وہ بارہ برس پیچھے پہنچ گیا ہو اور سب کچھ سامنے ہو رہا ہو ——— اپنے خیالات سے خوفزدہ ہو کر اُس نے ماضی سے ناطہ توڑ کر حال میں آنا چاہا، مگر اپنے بھائی کی خونبار آنکھیں یاد کر کے وہ اندر ہی اندر لرز گیا۔ کیا وہ بھی ڈیانا سے اسی قدر محبت کرتا تھا جتنی کہ اپنی ہائی سنتھ سے؟ ——— فرض کر لو وہ کرتا تھا، مگر فرض کیوں کرو، کیوں نہیں کرتا ہوگا؟ ——— کیا وہ ہائی سنتھ جیسی پیاری بچی نہ تھی؟ ——— وہ خود اُس سے اپنی پیاری بھتیجی سے محبت نہیں کرتا تھا؟ وہ اُسے ننھی دوست کہہ کر پکارتا تھا ——— آخری بار جب وہ ڈیانا کو خدا حافظ کہنے گیا، تو اُس نے ٹُنک کر کہا تھا:

"اوہ! اسے نہ کو گولی ماریں، مجھے اس لفظ ہی سے نفرت ہے۔ مجھے کھیلنے کے لیے پورا وقت نہیں ملتا اور رات ہو جاتی ہے۔"



"احمق لڑکی! ——— کھیل سے تمہارا دل کیوں نہیں بھرتا؟"

"پتہ نہیں ——— میرا دل چاہتا ہے بس ہر وقت کھیلتی رہوں۔ ریس لگاؤں، تیز تیز بھاگتی پھروں اور درختوں کی سب سے اُونچی شاخوں تک جا پہنچوں۔"

کلاڈ نے ایک بار پھر ڈیانا کے بازو اپنے گلے میں محسوس کیے۔ اُس کا ذہن اُسے ماضی سے حال میں لے آیا۔ ریس کا تنہا مقابلہ۔ تنہا آنکھ مچولی۔ درختوں کی اُونچی شاخوں تک پہنچنے کا جنون۔ ایک ایک لمحہ کھیل کود میں گزارنے کی ضد۔ بیوی کے واہمے ——— اب وہ اپنے گھر کے نزدیک پہنچ چکا تھا ——— اُس کی خاندانی حویلی ——— لاما اور ہائی سنتھ کی حویلی ——— "کل رات ہم تینوں یہاں سے بہت دُور ہوں گے ——— میں بالآخر نیویارک واپس چلا جاؤں گا۔" اُس نے سوچا اور پھر آپ ہی آپ اُسے اندر ہی اندر خوف کا ایک نامعلوم احساس ہونے لگا جو خون میں شامل ہو کر رگوں میں تیز تیز گردش کرنے لگا ——— اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ سامنے سے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں، پھر چیپ کے ٹوٹے ٹاور کا بے وقت بجنے والا گھنٹہ ان سب پر حاوی ہو گیا۔

"آگ ——— آگ ——— آگ" کی آوازیں کان میں پڑیں۔

کس قدر خوفناک آوازیں ہیں! ——— مگر نہیں یہ وہم ہے ——— پاگل پن ہے ——— مجھے تیز تیز چل کر حویلی میں پہنچنا چاہیے۔

آوازیں بڑھ رہی ہیں ——— تیز اور تیز ——— وہم حقیقت میں بدل گیا ہے۔

"میرے خدا! یہ سب کچھ کیا ہے؟"

موڑ مڑتے ہی حویلی صاف نظر آنے لگی اور کلاڈ جیسے پتھرا کر رہ گیا۔ یہ حقیقت ہے ——— ماضی و حال ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ خطرے کی گھنٹی، چیخنے چلانے کی آوازیں، دھواں، شعلے، سب کچھ وہی جو بارہ برس پہلے ہوا تھا۔ خاندانی حویلی کا وہی حصہ جل رہا ہے۔ آگ اُسے پھر چاٹ رہی ہے۔

آنکھوں میں آنسو لیے، دہشت زدہ وہ دیوانہ وار حویلی میں داخل ہوتا ہے۔ بالائی منزل شعلوں میں گھری ہوئی ہے ——— ہجوم چیخ پکار کر رہا ہے۔ ایک عورت بار بار لوگوں کے نرغے سے نکل کر آگ کی طرف جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُنہوں نے اُسے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے ——— کیا وہ لاما ہے؟ ——— ہاں!

بے ہنگم آوازوں سے اُسے پتہ لگتا ہے کہ پانی کے نلوں میں پانی جم کر برف ہو چکا ہے۔ پائپ بیکار ہو گئے ہیں۔ ٹیلی فون لائنیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ لوگ سکتے ہوئے ہیں اور فائر بریگیڈ کا انتظار ہو رہا ہے۔ بچی ——— اُس کی بچی بالائی منزل پر ہے اور اُوپر جانے والا زینہ ٹوٹ چکا ہے ——— بچی اکیلی ہے ——— سرخ شعلوں میں گھری ہوئی ——— حویلی کی سب سے لمبی سیڑھی بالائی منزل تک کے لیے ناکافی ہے۔ لوگ دوسری سیڑھی ملا کر باندھ رہے ہیں ——— لاما کا بُرا حال ہے ——— وہ رو رہی ہے، چیخ رہی ہے اور اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے سب سے لڑ رہی ہے۔ دونوں سیڑھیاں ایک دوسرے سے باندھی جا چکی ہیں۔ کئی آدمیوں نے اُوپر جانے کی پیشکش کی ہے۔

"میں جاؤں گا۔" وہ چلاتا ہے۔ اُسے اپنی آواز اجنبی لگتی ہے۔ ہائی سنتھ کے کمرے کی دیوار کے ساتھ سیڑھی لگا دی جاتی ہے۔ وہ دیوانہ وار اُس پر چڑھتا ہے۔ ابھی کھڑکی سے دُور، آدھے راستے میں ہے کہ وہ بچی کو دیکھتا ہے۔ سامان کے کمرے کی کھلی کھڑکی میں وہ لمبے بازو پھیلائے کھڑی ہے اور سرخ بال زرد چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔

"زینہ ہٹاؤ ——— جلدی ——— جلدی کرو ——— وہ بیڈ روم میں نہیں ہے۔" وہ مایوسی سے چلاتا ہے۔ "وہ سامان والے کمرے میں ہے۔ تمہیں نظر نہیں آ رہی؟ ——— سیڑھی اُدھر لگاؤ۔ اُس کھڑکی کے پاس۔"

لوگوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا، مگر وہ اُس کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔ بہت لوگ ہیں، پُرجوش اور اُس کی مدد کے لیے دل سے آمادہ۔ وہ سیڑھی سیکنڈوں میں دوسری طرف لے جاتے ہیں ——— کلاڈ اُوپر چڑھتا ہے، اُوپر اور اُوپر۔ بالکل آخری سرے پر پہنچ کر وہ سر اُٹھاتا ہے، تو اُس کے سامنے وہ لڑکی کھڑی مسکرا رہی ہے جسے بارہ برس پہلے شعلوں نے نگل لیا تھا۔ لڑکی ہنستی ہے۔ وہ اُسے دیوانوں کی طرح دیکھتا ہے ——— دیکھے جاتا ہے ——— پھر وہ غائب ہو جاتی ہے ——— وہاں کوئی نہیں۔ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ کلاڈ نے اپنے آپ کو سیڑھی سے نیچے گرا دیا۔

"دوسری کھڑکی پر ——— اُدھر ——— وہ بیڈ روم میں ہے۔"

حیرت انگیز پھرتی سے سیڑھی اُٹھا کر دیوار سے لگائی جاتی ہے مگر بہت دیر ہو چکی ہے ——— فائر بریگیڈ پہنچتا ہے، چھت کا ایک حصہ گرتا ہے اور ——— ایک بار پھر ——— آگ بجھنے کے بعد ایک چھوٹی بچی کی جلی ہوئی لاش وہاں سے برآمد ہوتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com





"وہ اگرچہ مافوق الفطرت علوم پر ایک نادر نسخہ تھا، لیکن میں نے کمرے میں داخل ہو کر اُس منحوس کتاب کو آتش دان میں پھینک دیا اور...."

# محبوبہ کی رُوح

منور جاوید

"جناب! مجھے افسوس ہے کہ کتاب نمبر ۷۷ اس وقت سٹاک میں موجود نہیں ہے۔" سیلزمین نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ سیلزمین کے جواب سے مجھے مایوسی بھی ہوئی اور قدرے حیرانی بھی۔ نئی کتابوں کی فہرست مجھے صبح کی ڈاک ہی سے ملی تھی۔ ناشتے کے دوران میں نے فہرست پر سرسری سی نظر ڈالی اور کتابوں کا تعارف پڑھتے ہوئے اچانک میری نظر کتاب نمبر ۷۷ پر رُک گئی۔ کتاب کے مختصر سے تعارف کے مطابق یہ نسخہ ستر ہویں صدی میں ملکہ الزبتھ کے دَور سے تعلق رکھتا تھا جس میں زمانۂ قدیم کی قوموں کے مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ رُوحوں کو بُلانے اور اُن سے ہم کلام ہونے کے متعلق مختلف طریقے، کلمے اور وظائف درج تھے۔ علاوہ ازیں مصری اور یہودیوں کے علومِ ارواح اور اُن سے ہم کلام ہونے کے پُراسرار طریقوں کا تذکرہ بھی ایک باب میں تفصیل سے درج کیا گیا تھا۔

گزشتہ پچیس برسوں میں علمِ ارواح کے موضوع پر اگرچہ ... کی کتابیں میرے مطالعے سے گزری تھیں، لیکن اس نسخے کے مختصر تعارف ... میں کچھ نئی باتیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ نسخہ ... الزبتھ کے نامور اور شہرت یافتہ ماہر نجومی ڈاکٹر جان ڈی کی تصنیف ... ہے اور ... یہ مفروضہ درست ہے تو پندرہ پونڈ کی حقیر رقم اس نا... کے سامنے کچھ ... نہیں رکھتی۔

چنانچہ جلدی جلدی چائے حلق میں اُنڈیلی اور میرا شوق مجھے ا... تک کھینچ لایا۔ گھر سے ایجرٹن بک شاپ تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ لگے ہوں گے اور آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیلزمین کا جواب سُن کر مجھے کتنی مایوسی ہوئی ہو گی۔ سیلزمین نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا: "وہ دیکھیے مسٹر ایجرٹن آ رہے ہیں، بہتر ہے اس سلسلے میں آپ ان سے بات کر لیجیے۔"

میں دکان کے مالک کی طرف مُڑا جو اس وقت غالباً دُکان سے باہر جا رہا تھا۔

"مسٹر ایجرٹن! کیا فہرست میں درج شدہ کتاب نمبر ۷۷ بک چکی ہے؟" میں نے مسٹر ایجرٹن کو فہرست دکھاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ ابھی نہیں بکا ... بصورتِ دیگر میں صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

... اس دکان سے کتابیں خریدتے پندرہ برس گزر چکے تھے۔ ایجرٹن ... بااخلاق اور ہمدرد قسم کے دکانداروں میں سے تھا اور اپنے پُرانے گاہکوں کی بہت عزت کرتا اور ہمیشہ اُن کی پسند کا خیال رکھتا تھا۔

میرے سوال پر ایجرٹن رُکا اور اُسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ اچانک ...ن کے چہرے پر کرب پھیل گیا اور ماتھے کی لکیریں زیادہ گہری ہو گئیں۔ اُس نے ... بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور قدرے توقف کے بعد نہایت دھیمے لہجے ... کہا "کیا آپ میرے ساتھ میرے کمرے میں تشریف لے چلیں گے؟" ...ں کوئی جواب دیے بغیر ایجرٹن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ایجرٹن کا دفتر ...ل پر تھا۔ ہم فرسٹ اسسٹنٹ کے کمرے کے ساتھ سے گھومتی ہوئی



سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اگرچہ ایجرٹن کا بیشتر کاروبار قانونی کتابوں کی خرید و فروخت تھا تاہم ایجرٹن بک شاپ کی ماہانہ فہرست میں کبھی کبھی نادر اور نایاب کتابوں کے قدیم نسخے بھی نظر آ جاتے تھے۔ اس کی وجہ دراصل ایجرٹن کی ذاتی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے پُرانے گاہکوں کے ذوق کا نہ صرف خیال رکھتا تھا، بلکہ ہر ماہ نئے نسخوں کی فہرست باقاعدگی سے اپنے گاہکوں کو بھیجتا تھا۔ میں گزشتہ پندرہ برسوں میں تقریباً دو سو نایاب نسخے ایجرٹن سے خرید چکا تھا۔ برسوں کی شناسائی سے اچھے خاصے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔

کتابوں کی خرید و فروخت کے علاوہ ایجرٹن خود بھی بڑا علم دوست آدمی تھا اور اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے وہ اکثر چھوٹی بڑی لائبریریوں [illegible] جایا کرتا تھا۔

میں ایجرٹن کے ساتھ اُس کے دفتر میں داخل ہوا۔ کمرہ کافی کشادہ تھا جس میں چاروں طرف لگی ہوئی الماریوں میں پرانی اور نئی کتابیں بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ ایجرٹن نے بڑے تھکے تھکے انداز میں مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ جس نسخے کو ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں، اُسے میں نے خود تلف کر دیا ہے!"

ایجرٹن کے چہرے پر کرب کی لکیریں اور گہری ہو گئی تھیں۔

"ارے — آخر کیوں؟" میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ "آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"آپ کو پورے حقائق جان کر یقیناً دُکھ ہو گا — یہ ایک حادثہ تھا — رُوح فرسا حادثہ!"

ایجرٹن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور خالی خالی نظروں سے سامنے الماریوں کی طرف دیکھنے لگا میرا اندازہ تھا کہ ایجرٹن اس معاملے میں زبان کھولتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا، لیکن میں نسخے کے تلف ہونے کی تفصیل جاننا چاہتا تھا اور میرا تجسس لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر چند لمحے کے توقف کے بعد ایجرٹن بڑے دھیمے لہجے میں بولا:

"میں جن دلخراش اور ناقابلِ یقین حقائق کا انکشاف کرنے والا ہوں، اس موضوع پر آپ کا مطالعہ مجھ سے کافی وسیع ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس حادثے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے —" ایجرٹن کی آواز جیسے کنوئیں کی گہرائی سے آ رہی تھی۔ ایک لمبا سانس لے کر اُس نے سوال کیا۔

"آپ میری دکان کے مینیجر مسٹر مرٹن کو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" میں نے کہا۔ "اس دکان میں مرٹن کو تو میں گزشتہ پندرہ سال سے دیکھ رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے اس سے پہلے میں نے مرٹن کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا!" ایجرٹن کے چہرے پر ٹھہراؤ کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

"مرٹن ۱۹۱۳ء میں آکسفورڈ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی ملازمت کی غرض سے لندن آیا تھا۔ جلد ہی مہینوں میں جنگِ عظیم اوّل کے شعلے بھڑک اُٹھے اور مرٹن کو بھی جبری بھرتی کر لیا گیا۔ اس طرح جوانی کے چار سال تک وہ آگ اور خون کا یہ ڈرامہ مختلف محاذوں پر اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ [illegible] سسک سسک کر دم توڑتے ہوئے بے سہارا بوڑھوں اور ایسے ہی ہزاروں دلخراش واقعات نے اُس کا حساس ذہن جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور نتیجتاً وہ جدید تہذیب کی ملمع بازی اور حصولِ اقتدار کے لیے انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر معاشرے سے متنفر ہو گیا۔ وہ ۱۹۱۸ء میں فوج سے فارغ ہوا — لیکن ذہنی طور پر مفلوج اور ایک اعصابی مریض بن کر —

وطن واپس آنے پر اُسے معلوم ہوا کہ جنگ کی آگ میں اُس کے والدین بھی بھسم ہو چکے ہیں — یہ خبر سُن کر جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ گھر اُسے کاٹنے کو دوڑتا۔ زندہ رہنے کے لیے اب بھی اُسے کسی ملازمت کی ضرورت تھی اور اسی غرض سے وہ میرے پاس آیا تھا۔ میری دکان میں وہ پندرہ برس تک نہایت ایمانداری اور جانفشانی سے کام کرتا رہا۔" یہ کہتے کہتے ایجرٹن کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے اور آواز بھرا گئی۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دکان کے دوسرے معاملات کے علاوہ مرٹن کا اصل کام نئی آنے والی کتابوں کی ماہانہ فہرست تیار کر کے گاہکوں کو روانہ کرنا تھا۔ اُسے مطالعے کا بھی کافی شوق تھا اور کتابوں کا تعارف لکھنے کے لیے اُسے بیشتر کتابوں کو پڑھنا بھی پڑتا تھا چنانچہ وہ دن رات کتابیں پڑھنے اور تعارف لکھنے میں مصروف رہتا۔ گزشتہ کئی برسوں کی فہرستوں کے مختصر لیکن جامع تعارف مرٹن ہی کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ وہ قدرے خشک مزاج بھی تھا اور اپنی طبیعت کے خلاف معمولی سی بات بھی برداشت نہ کرتا تھا لیکن مجھے اس کی ذہنی کیفیت سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اصل میں ماضی کے تلخ واقعات نے ذہنی انتشار کے سوا اُسے کچھ بھی نہ دیا تھا اور ایسے حالات میں اُسے پیار اور ہمدردی کی اشد ضرورت تھی۔ وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بنیادی طور پر لاأبالی لیکن کم گو شخص تھا۔ کئی کئی ہفتے وہ بالکل خاموش رہتا اور اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے اور اُن کے تعارف لکھنے میں معروف رہتا۔ اس کی محنت اور اچھا کام مدِنظر رکھتے ہوئے میں بھی اُس کی چھوٹی موٹی غلطیاں درگزر کر دیتا تھا۔

گزشتہ برس، غالباً دسمبر کے مہینے میں وہ ایک صبح میرے کمرے میں آیا اور مجھے بتایا کہ اُس کی منگنی ہو گئی ہے اور جلد ہی اُس کی شادی ہونے والی ہے۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی، تاہم مَیں نے اُسے نہایت گرمجوشی سے مبارک باد دی اور شادی کے بعد تنخواہ میں معقول اضافے کا بھی وعدہ کیا۔ اُس کی منگیتر اکثر اُس سے دکان میں بھی ملنے آیا کرتی تھی اور ایک بار مرٹن نے مجھ سے تعارف بھی کروایا تھا۔ پہلی نظر ہی میں مجھے وہ لڑکی پسند آئی۔ میرا خیال تھا مرٹن جیسے لاأبالی شخص کو جیسی بیوی کی ضرورت تھی اس لڑکی میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ بہت جلد مرٹن اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے۔ مرٹن بھی بہت بدل گیا تھا۔ اب نہ اس میں تنہا اور خاموش رہنے کی عادت تھی، نہ تنک مزاجی اور نہ پہلے کی سی جھجک، بلکہ اُس کی آنکھوں میں پھر نئی زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔"

مَیں نے بڑی بے چینی سے اپنی کرسی میں پہلو بدلا۔ میں حیران تھا کہ اس کہانی سے آخر کتاب نمبر ۲ کا کیا تعلق ہے، لیکن شاید مرٹن میری بے چینی بھانپ گیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کو کھولتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ خیال نہ کریں کہ اس کہانی کا اصل حادثے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ آپ مزید واقعہ سُن کر خود ہی فیصلہ کریں گے کہ کتاب نمبر ۲ کا اس تمام واقعے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

"اسے بدقسمتی کہیے کہ چار ماہ کے بعد مرٹن کی منگیتر موٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ قدرتی امر تھا کہ مرٹن کو اپنی منگیتر کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ اس کے باوجود مَیں نے مرٹن کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہ دیکھے تھے، تاہم مرٹن پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔ ماضی کی قنوطیت عود کر آئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پہروں کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا۔ چند ہی ہفتوں میں اُس کے چہرے سے طویل بیماری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

اُس کی روز بروز گرتی ہوئی صحت میرے لیے تشویش کا باعث بھی، چنانچہ مَیں نے اُسے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے علاوہ ایک ماہ کی چھٹی دینے کا بھی وعدہ کیا، لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اگر وہ میری ذمہ کا اتنا پرانا اور محنتی ملازم نہ ہوتا تو ایسے حالات میں یقیناً میں اُسے نوکری سے جواب دے دیتا، لیکن مَیں ہر طرح اُس کی دلجوئی کرتا اور انہی دنوں مرٹن سے مختلف موضوعات پر بڑی تفصیل سے گفتگو بھی ہوئی جس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ مافوق الفطرت اور کالے سحر جیسے علوم کے مطالعے نے اُس کا ذہن بُری طرح متاثر کیا ہے اور وہ روحوں کو بلانے اور اُن سے ہم کلام ہونے کے متعلق کچھ تجربے بھی کر چکا ہے۔ اُس نے گفتگو کے دوران مافوق الفطرت علوم کے بارے میں میرا نظریہ بھی معلوم کرنا چاہا۔ دراصل ان طریقوں کے بارے میں مرٹن کا عمیق مطالعہ اور دلچسپی اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ اپنی منگیتر کی رُوح کو بلا کر اُس سے باتیں کرنے کا متمنی ہے اور اُسے اپنی کامیابی کا پورا یقین بھی ہے، اگرچہ مَیں مرٹن کے گہرے مطالعے سے بہت متاثر ہُوا تھا لیکن مجھے یہ سوچ کر بہت دُکھ ہُوا کہ ایک بالغ اور ذی شعور شخص پر ارواح و آسیب کا سودا سوار ہو چکا ہے۔

اُن دنوں مرٹن کی حالت بڑی غیر تھی۔ مَیں نے شروپ شائر کی ایک لائبریری سستے داموں خریدی تھی۔ اس لائبریری میں کئی قیمتی اور نادر نسخے موجود تھے۔ چند قلمی نسخے بھی تھے جو سولھویں صدی کے دوران میں تصنیف کیے گئے اور سحر اور علم نجوم سے تعلق رکھتے تھے۔ مَیں نے آپ کو جو فہرست روانہ کی ہے اُس میں اس لائبریری کی صرف نصف کُتب درج ہیں، لیکن مَیں جلد از جلد تمام کتابوں کی فہرست اپنے پرانے اور باذوق گاہکوں کو بھیج دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مرٹن اس لائبریری کی صرف ایک تہائی کتابوں کی فہرست اور تعارف تیار کر سکا تھا۔ باقی کام مَیں نے خود ہی کیا ہے۔ ادارے کے دوسرے آدمی ابھی اس قابل نہیں کہ کتابوں کی فہرست اور ان کے جامع تعارف لکھ سکیں۔ یہ نہایت عرق ریزی کا کام ہے۔ آپ نے جو فہرست پڑھی ہے، ان میں مافوق الفطرت علوم کے بارے میں دوسری کتابوں کے علاوہ کتاب نمبر ۲ بھی درج ہے۔ یہی وہ فہرست ہے جسے مرتب کرتے ہوئے مرٹن نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے دن رات ان کتابوں کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اپنی منگیتر کی موت کے بعد اُسے اس طرح دلجمعی اور غیر معمولی دلچسپی سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی منگیتر کی موت کا صدمہ بھول جائے گا اور پہلے کی طرح کام کرنے لگے گا۔

اس بات کو آج ایک ہفتہ گزرا کہ مرٹن دکان بند ہونے سے چند منٹ پہلے میرے پاس آیا اور کتاب نمبر ۲ کی قیمت پندرہ پونڈ میرے سامنے رکھ دی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کیوں کہ اُسے کتابیں جمع کرنے کا شوق نہ تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ اپنی تنخواہ کے مطابق اُسے یہ مہنگا شوق راس نہیں آ سکتا، چنانچہ



مَیں نے انکار کر دیا۔ جب وہ چلا گیا تو مَیں نے کتاب نمبر ۲ کے صفحات اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھے۔ یہ کتاب روحوں کو بلانے کے متعلق یہودیوں کے قدیم عقائد اور طریقوں، افریقہ کے وحشی قبیلوں کے روحوں کو بلانے کے مختلف ممبو جمبو منتروں، حضرت سلیمان کے پُراسرار علوم وغیرہ سے بھری پڑی تھی۔ جگہ جگہ مختلف زائچے بنے ہوئے تھے۔ درحقیقت رُوحوں کو بلانے کے علم پر اب تک اتنی مکمل اور ضخیم کتاب میری نظر سے نہ گزری تھی۔ اس کتاب میں منتر پڑھ کر پھونکنے اور جادو کے زور سے روحوں کو بلانے کے کئی طریقے لاطینی زبان میں بھی درج تھے۔ اس قسم کی کچھ کتابیں میرے مطالعے سے گزری ہیں جس میں درج لاطینی زبان کے کئی طریقے کالا جادو کرنے والے اکثر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ مَیں نے کچھ سوچ کر یہ کتاب تجوری میں رکھ دی اور اس پر مزید خیال آرائی نہ کی۔

پرسوں دوپہر کے وقت مرٹن نے مجھ سے تجوری کی چابی مانگی۔ مرٹن قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ تجوری کی چابیاں اکثر اس کے پاس ہی رہتی تھیں۔ دراصل تجوری میں بہت نایاب کتابوں کے نسخے رکھے جاتے تھے۔ جب مرٹن ان کا تعارف لکھنا چاہتا تو چابیاں مجھ سے لے جاتا تھا۔ میری دانست میں مرٹن کو ان کتابوں کے تعارف لکھنا تھے۔ اس لیے مَیں نے اُسے چابیاں دے دیں۔

ہم دکان شام کو اکثر چھ بجے کے قریب بند کرتے ہیں۔ میں سب ملازموں کے جانے کے بعد اور اکثر سات آٹھ بجے کے درمیان جاتا ہوں۔ ملازمین ٹھیک چھ بجے چلے جاتے ہیں، لیکن مرٹن اکثر آدھ پون گھنٹہ دیر ہی سے چھٹی کیا کرتا تھا۔ اُس شام میں معروف تھا۔ مجھے جرمن زبان کی ایک کتاب سے چند حوالے نقل کرنا تھے، لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے مطلوبہ حوالے ڈھونڈنے اور نقل کرنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ اُس وقت تقریباً ساڑھے سات بجے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مرٹن جا چکا ہو گا۔ مجھے مرٹن کے جانے کا، اس کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بڑے دروازے کے بند ہونے کی آواز سے پتہ چل جاتا تھا۔ دکان کے درمیان صرف ایک بلب روشن تھا کہ اچانک مجھے سیڑھیوں کے نیچے واقع مرٹن کے کمرے سے ایک دلدوز چیخ سُنائی دی۔ میرا خیال ہے مَیں نے زندگی میں اتنی دلخراش چیخ کبھی نہیں سُنی۔ یہ مرٹن کی آواز تھی۔ مَیں نے تیزی سے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا اور بَل کھاتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے بھاگا۔

ہال میں روشن بلب کی ہلکی سی روشنی میں مَیں نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ مرٹن کے کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے اور مرٹن دروازے کا ہینڈل گھمانے میں مصروف ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اچانک اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ تیزی سے بھاگتا ہوا دُکان کے بڑے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اُسے آواز دینا چاہتا تھا، لیکن الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اسی لمحے مرٹن کے کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی اس زور سے آواز آئی کہ میں کانپ گیا۔ اچانک مرٹن کے کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور ایک سایہ تیزی سے ہال کی طرف جاتا ہوا محسوس ہوا جو بڑے دروازے کے قریب جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہوا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دھیمی روشنی میں ہال کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے فضا میں لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی ہوئی عجیب سی بدبو کا احساس ہوا۔ بُو اتنی شدید تھی کہ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کے مارے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"ایسی بدبو سے مجھے زندگی میں آج سے پچاس سال پہلے صرف ایک بار سابقہ پڑا تھا۔ میں اُس وقت بچہ تھا۔ کسی تفتیش کے سلسلے میں ہمارے گاؤں کے قبرستان سے پولیس ایک دفن شدہ لاش کو نکالنے کے لیے آئی تھی۔ چند آدمی قبر کھود رہے تھے اور گاؤں کے بہت سے لوگ قبرستان کی چار دیواری کے گرد کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایک پولیس افسر نے سب لوگوں کو اپنے اپنے گھر جانے کے لیے کہا۔ میرے لیے یہ بڑا دلچسپ معاملہ تھا، چنانچہ میں پولیس والوں کی نظروں سے بچتا ہوا ایک گھنے درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر سارا منظر دیکھتا رہا۔ جب تابوت قبر سے نکالا گیا تو فضا میں اتنی شدید بُو پھیل کر سانس لینا دوبھر ہو گیا۔

"اُس وقت دُکان میں پھیلی ہوئی بُو بالکل ایسی ہی تھی۔ اس قدر تعفن تھا کہ میرے دماغ کی رگیں تن گئیں اور مجھ پر عجیب سی غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور واپس آ کر کمرے میں بیٹھ گیا۔ کرسی پر بیٹھا چند منٹ سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کس طرح اور کیوں ہوا۔ اچانک ذہن میں آیا کہ مرٹن بھاگ کر کہاں گیا ہو گا۔!
میں نے اپنے دل کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ دکان میں سناٹا تھا۔ مرٹن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر پہنچ کر میں نے بجلی کا سوئچ دبایا — ہر چیز اپنی جگہ جُوں کی توں موجود تھی۔

میں تیزی سے دُکان سے باہر نکلا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، لیکن مرٹن کہیں دکھائی نہ دیا۔ مرٹن کی رہائش قریبی محلہ بیل بورن میں تھی۔ سوچا شاید وہ اپنے گھر گیا ہو۔ میں نے دُکان کو تالا لگایا اور بیل بورن کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں نے بمشکل آدھ فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے درمیان بہت سے لوگ جمع ہیں۔ "حادثہ" — میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے پندرہ سالہ رفیق اور خاموش ساتھی کی لاش خون میں لت پت سڑک پر پڑی تھی۔ اس کا جسم بُری طرح کچلا گیا تھا۔ ایک پولیس والے سے معلوم ہوا کہ وہ بگٹٹ بھاگتا ہوا سڑک عبور کر رہا تھا کہ تیز رفتار بس کے نیچے کچلا گیا اور موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ مرٹن کا پوسٹ مارٹم اور تجہیز و تکفین تقریباً رات کے دس بجے مکمل ہوئی۔

"میں اپنے ساتھی کو اپنے ہاتھوں لحد میں اُتار کر جب واپس دُکان میں پہنچا تو میرا جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور ذہن کی جو کیفیت ہو گی اس کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صرف چند گھنٹوں کے اندر کتنے حیران کُن واقعات رونما ہو چکے تھے۔ میں ہال کمرے کی زرد روشنی میں ہر چیز کی طرف دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ مرٹن کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ یہ دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ وہ منحوس کتاب نمبر ۷۷ مرٹن کی میز پر کھلی پڑی تھی اور قریب پڑے ہوئے پیڈ پر چند زائچے بنے ہوئے تھے۔ ایک علیحدہ کاغذ پر ایک ہاتھ بنا تھا جس کی تین انگلیاں جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے پیڈ کے صفحات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو میری حیرانی کی حد نہ رہی کہ روحوں کو بلانے کے سلسلے میں مرٹن کالے جادو کی بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا۔

ابھی میں یہ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ہال کمرے میں قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سُنائی دی۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ ہال کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کاؤنٹر کی طرف نظر دوڑائی۔ اچانک کلاک نے گیارہ بجائے۔ کلاک کی آواز میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔

میں واپس کمرے میں آیا اور اُس منحوس کتاب کو آتش دان میں پھینک دیا، اگرچہ مافوق الفطرت علوم پر ایک نادر نسخہ تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے میرا بہت مخلص اور ذہین ساتھی چھین لیا تھا۔ ایک ایسا ساتھی جس نے ایک طویل عرصے تک میرا ہاتھ بٹایا اور مجھے کبھی کام کی زیادتی کو محسوس نہ ہونے دیا۔ اس لیے اس نسخے کا تلف کر دینا ہی بہتر تھا۔

"میں جانتا ہوں یہ سُن کر آپ کو یقیناً دُکھ پہنچا ہو گا، لیکن میں نے سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا ہے۔ اگرچہ پُراسرار علوم کی کتابیں بے حد نفع بخش ہیں، لیکن آئندہ ایسی کتابیں ایجرٹن بُک شاپ میں جگہ نہ پا سکیں گی، ایسی کتابیں جو انسان کی رفاقت و رہنمائی کے بجائے زندگی سے فرار کی ترغیب کا ذریعہ ثابت ہوں۔"

خوف ناک کہانی

# یانگ شی

غیر ملکی ادب

کراچی سے حیدرآباد تک سپر ہائی وے کی تعمیر کے سلسلے میں ایک اہم ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ کراچی سے تقریباً ۴۵ میل دُور ہمارا کیمپ تھا۔ قرب و جوار میں مزدوروں کی کچی پکی جھونپڑیاں اور ٹھیکیداروں کے خیمے نصب تھے۔ سڑک کی تعمیر کی وجہ سے اس ویران اور غیر آباد علاقے میں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ سڑک نکالنے میں سب سے دُشوار مرحلہ راہ میں حائل چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں جنہیں کاٹنے اور صاف کرنے کا کام جاری تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ ایک شام میرے کیمپ پر تین مزدور آئے اور بڑی رازداری کے ساتھ کہنے لگے کہ صاحب ہم نے ان پہاڑیوں میں ایک بالکل ننگ دھڑنگ آدمی دیکھا ہے جس کا بدن شیشے کی طرح ہے یعنی اس کے جسم کی ہڈیاں پسلیاں اور آنتیں وغیرہ صاف نظر آتی ہیں۔ پہلے تو میں اس بات کو محض ایک وہم سمجھا مگر جب یہی بات اور کئی مزدوروں نے مجھے بتائی تو میرے ذہن میں کسی زمانے کی پڑھی ہوئی ایک کہانی تازہ ہو گئی۔
بہت عرصہ گزرا میں نے ڈاکٹر ہربرٹ اے جائلز کی مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کردہ چین سے متعلق "بایوگرافیکل ڈکشنری" میں شفاف انسان کے متعلق پڑھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ چین کے ایک شہر "ہی لی" میں "پسیہ ہیوآن" نام کا ایک ایسا آدمی تھا جس کا جسم شیشے کی مانند شفاف تھا وہ جب اپنا لباس اُتار دیتا تو اس کا دل، جگر، پھیپھڑے، آنتیں، ہڈیاں اور پسلیاں حتیٰ کہ غذا اور نظامِ ہضم کی کیفیت تک صاف نظر آتی تھی۔

پسیہ ہیوآن چین کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس نے چین کی اعلیٰ تعلیمی ڈگری "چوجن" حاصل کی تھی اور ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا اس کے جسم کی اس مجوبہ خصوصیت کو دیکھ کر بے شمار لوگ اس کے عقیدت مند ہوگئے تھے۔ ۱۵۷۲ میں کسی جرم کی پاداش میں اسے پھانسی کی سزا دے دی گئی مگر کچھ عرصہ بعد مقلدینِ کنفیوشس کے احتجاج پر حکومت نے اسے بے قصور تسلیم کرلیا اور اسے ایک بزرگ کا درجہ دے کر اس کے معبد میں اس کے نام کی ایک تختی لگوا دی۔

اس کہانی کے یاد آنے پر میں نے مزدوروں سے مزید سوالات کیے اور مجھے یقین ہوگیا کہ ان پہاڑیوں میں شفاف جسم کا انسان یقیناً موجود ہے۔ اس شفاف انسان سے ملاقات کا اشتیاق بڑھ چکا تھا لہٰذا میں شام ہوتے ہی اپنا پستول لگا کر قرب وجوار کی پہاڑیوں پر اس کی تلاش میں نکل گیا، مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ اب میرا ہر شام یہ معمول بن گیا تھا کہ کام سے فارغ ہو کر شفاف انسان کی تلاش میں نکل جاتا اور گھنٹوں سرگرداں رہتا مگر افسوس پانچ چھ روز کی تلاش و جستجو بیکار ہی گئی اور میں ناامید سا ہوگیا۔

پھر ایک شام اچانک ہی میری اُمید بر آئی۔ میں نے اسے بہت دور ایک چھوٹی پہاڑی پر کھڑے دیکھا واقعی اس کا جسم شیشے کی طرح صاف شفاف تھا۔ میں اس پہاڑی کی طرف تیزی سے دوڑا مگر میرے وہاں پہنچتے پہنچتے وہ چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ شام کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اس لیے میں ناکام لوٹ آیا۔ دوسرے روز چار بجے ہی میں اس پہاڑی پر اس عجیب و غریب انسان کو تلاش

کرنے کی غرض سے پہنچ گیا۔ میری تجسس بھری نگاہیں پہاڑی پہ کھڑے کھڑے کئی میل کی حدود کا جائزہ لے رہی تھیں مگر آج بھی شام کا جھٹپٹا بھی آہستہ آہستہ اندھیرے میں تبدیل ہونے لگا اور مجھے ایک بار پھر مایوس واپس آنا پڑا۔

وقت گزرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ میرا شوقِ ملاقات بڑھتا چلا گیا —— ایک رات کا ذکر ہے میں اپنے خیمے میں حسبِ عادت مطالعے میں منہمک تھا کہ دفعتاً باہر کسی کے پراسرار قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس غیر متوقع آہٹ پر میرے کان کھڑے ہوتے میں نے احتیاطاً پستول تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ چند لمحے بعد خیمے کے دروازے پر جسے رات کو تختے لگا کر بند کر دیا جاتا تھا، آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے انتہائی رعب دار آواز میں کڑک کر پوچھا: "کون ہے؟" باہر سے ایک نحیف آواز سنائی دی۔

"میں آپ سے ملنے آیا ہوں —— شفاف انسان...... جسے کئی روز سے آپ تلاش کرتے رہے ہیں۔"

شفاف انسان، آج خود ہی مجھے ملنے آگیا تھا۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی مگر دوسرے ہی لمحے خوف و دہشت میں بدل گئی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ ایک لمحے کے بعد وہ میرے خیمے کے اندر میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا۔ مارے دہشت کے پستول میرے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ خوف کی سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ گیس لیمپ کی تیز روشنی میں اس کے شفاف جسم کے اندر کی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے مسلسل دیکھے جارہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ پورا جسم صحت مند تھا اور کسی قسم کی وحشت یا خوفناکی نہ تھی۔ ان چند منٹوں میں میں نے کئی بار اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کرتے ہوئے اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر آواز میرے حلق سے نکل نہ سکی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے میری ساری قوتیں سلب کرلی ہوں۔



بڑی مشکل سے میں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے اپنے حواس مجتمع کیے اور اس سے پوچھا کہ تم مجھے کس مقصد سے ملنے آئے ہو۔ وہ بڑے نرم لہجے میں بولا کہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ کئی روز سے مجھ سے ملنے کی کوشش کر رہے ہیں لہٰذا آج میں خود ہی آپ سے ملنے چلا آیا ویسے بھی مجھے آج آپ کے پاس آنا ہی تھا کیونکہ آج میں اپنی زندگی کا ایک اہم راز افشا کرنا چاہتا ہوں۔ اتنی دیر میں میرے ہوش و حواس بھی بجا ہوچکے تھے۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا:

"مجھے تمہارے متعلق تفصیلات معلوم کرکے خوشی ہوگی آرام سے بیٹھ کر اپنی داستان یا وہ اہم راز جس کا تم ذکر کر رہے ہو سناؤ۔" میرا شکریہ ادا کرکے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ بالکل خاموشی سے سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا:

"میں یہاں تین سو اٹھاون سال سے موجود ہوں۔"

"تین سو اٹھاون سال سے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کوئی انسان اس زمانے میں تین سو اٹھانوے سال تک زندہ رہ سکتا ہے؟"

اس نے میری حیرت پر کوئی توجہ نہ دی اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ بولا: "ویسے اس وقت میری عمر چار سو اٹھائیس برس ہے۔ ۱۵۷۲ میں حکومتِ چین نے مجھے ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں پھانسی کی سزا دے دی تھی۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی۔ میں حیرت اور خوف سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے اوپر دہشت طاری ہوتے ہوئے محسوس کی۔ وہ بولا: "چین کی حکومت اور عوام کی نظروں میں میں مرچکا ہوں لیکن درحقیقت میں زندہ ہوں اور تین سو اٹھاون سال سے اس ویرانے کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہوں۔"

"تو کیا تمہارا نام "پسیہ ہیوآن" ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں آپ کو میرا صحیح نام معلوم ہے۔ مگر میں آپ کی اس معلومات پر حیرت کا اظہار نہیں کروں گا کیونکہ اس معلومات کی بنا پر ہی آپ مجھے تلاش کرتے تھے۔"

"کیا پیدائش کے وقت ہی سے تمہارا جسم شیشے کی مانند شفاف تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں پیدائش کے وقت میں بالکل عام انسانوں کی طرح تھا مگر....."

وہ کہتے کہتے رک گیا اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور دہشت سی طاری ہوگئی۔ چند لمحوں کے بعد خود ہی بولا: "یہی وہ راز ہے جو تین سو اٹھاون سال سے میرے سینے میں دفن ہے۔" لیکن اب میں تھک گیا ہوں۔ اتنی طویل مدت تک زندہ رہنے کے بعد اب میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش اور ایک ہی تمنا مچل رہی ہے کہ موت کی پُرسکون آغوش میں سو جاؤں مگر میری یہ خواہش اسی وقت پوری ہوسکتی ہے کہ وہ راز جو صدیوں سے میرے سینے میں دفن ہے پھر اس میں کسی کو ہمراز بنا لوں۔"

میں مبہوت بیٹھا اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تقریباً چار سو سال قبل جبکہ میری عمر ۲۵ سال کے قریب تھی۔ میں اپنے ملک میں ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس دیوانگی نے مجھے بھی اپنا شکار بنا لیا اور مجھے اپنے شہر کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ سے پیار ہوگیا...

"میری محبوبہ کا نام "یانگ شی" تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ وہ مجھ پر نثار تھی اور میں بھی اس پر فدا۔ ہماری پاک محبت وقت سے بے نیاز پروان چڑھتی رہی۔ آخر ہم دونوں نے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک دن میں یانگ شی کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ میرا مدعا سُن کر اس کا باپ آبدیدہ ہوگیا اور بڑے دکھ کے ساتھ کہا: "ہیوآن میں تم سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہاری شرافت کی میرے دل میں بڑی قدر ہے یقین کرو اگر میں "یانگ شی" کی شادی کرسکتا تو پورے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملک میں صرف تم ہی وہ پہلے اور آخری انسان ہوتے جس کے ہاتھ میں اپنی پیاری بیٹی کا ہاتھ دینے میں مَیں حقیقی خوشی محسوس کرتا مگر افسوس یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ میں مجبور ہوں۔

"مَیں نے زندگی میں صرف ایک ہی بار قسم کھائی ہے اور اپنی اس قسم کو کسی بھی قیمت پر توڑنا نہیں چاہتا۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنی جوان بیٹی کی زندگی برباد ہوتے دیکھتا رہوں گا مگر بخدا قسم نہ توڑوں گا۔"

"مَیں دُکھی دل کے ساتھ یانگ شی کے باپ کی بات سن رہا تھا۔ وہ بزرگ خود بڑا رنجیدہ تھا۔ ادھر میں سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا قسم ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کو عمر بھر کنواری رکھنے پر مجبور ہے مگر پیشتر اس کے کہ میں کچھ پوچھتا اس نے خود ہی اپنی قسم اور اس کا حیرت انگیز سبب مجھے بتا دیا۔ اس نے کہا جب یانگ شی صرف دو ماہ کی تھی میں پورے خاندان کے ساتھ دریائے یانگ شی میں ایک کشتی کے ذریعے سفر کر رہا تھا کہ یکایک کشتی الٹ گئی۔ بڑی جدوجہد کے بعد تمام مسافر بچا لیے گئے مگر میری بچی ڈوب گئی۔ بچی کے غم میں اس کی ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی اس وقت تک ہم نے بچی کا کوئی نام بھی نہیں رکھا تھا۔ کئی مشاق ملاح گھنٹوں میری بچی کی لاش تلاش کرتے رہے مگر وہ نہ ملی تو اس کی ماں نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں زندگی بھر اس دریا کے کنارے بیٹھ کر اپنی بچی کا انتظار کروں گی۔ اس کی اس دیوانگی سے مجبور ہو کر میں دریا سے مخاطب ہوا اور کہا۔ کہ اے دریائے یانگ شی آپ میری بچی کو زندہ سلامت واپس کر دیجیے میں اس کا نام آپ ہی کے نام پر رکھ دوں گا۔ میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی میری بیوی نے کہا 'اے دریائے یانگ شی ہم اپنی بچی کا بیاہ بھی آپ ہی کے ساتھ کر دیں گے۔ میں نے اس کی تائید کی اور مزید کہا کہ اے دریائے یانگ شی میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ دونوں وعدے ہم ضرور پورا کریں گے۔ آپ ہماری "یانگ شی" کو زندہ سلامت واپس کر دیجیے۔ ہیوآن شاید تم یقین نہ کرو بیٹا! دریا میں بڑے زور کا تلاطم پیدا ہوا اور چند ہی لمحوں کے بعد اونچی اونچی موجوں پر ہماری بچی ہنستی کھیلتی آتی نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے موجوں نے ہماری بچی کو ہمارے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ماں نے لپک کر اپنی لخت جگر کو اٹھا لیا اور ہم نے ایک بار پھر اپنے دیوتاؤں کو حاضر و ناظر جان کر دریا سے کیے ہوئے وعدے کو دُہرایا اور ہنسی خوشی واپس آ گئے۔"

"یانگ شی کے باپ کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں مایوس و نامراد واپس آ گیا۔ ان واقعات کو سننے کے بعد اب کچھ کہنا سننا محض حماقت تھی۔ میرے ساتھ ساتھ خود یانگ شی نے بھی پہلی بار یہ راز اپنے باپ کی زبان سے سنا تھا اس پر تو سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ دوسرے روز جب یانگ شی مجھے ملنے آئی تو بے حد پریشان اور نڈھال تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یانگ شی اس قسم کی وجہ سے تمہارے والدین واقعی مجبور ہیں۔ وہ کسی قیمت پر اپنی قسم نہیں توڑیں گے لہٰذا ہم یہ راہ نکال سکتے ہیں کہ کسی دوسرے ملک چلے جائیں اور وہاں جا کر شادی کر لیں۔ مگر یانگ شی خود بھی بڑی مذہبی قسم کی لڑکی تھی اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔ میں ساری زندگی یونہی تڑپ تڑپ کر گذار لوں گی۔ اپنے ہاتھوں اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دوں گی مگر قسم توڑنے کا پاپ نہ کروں گی۔

"پھر کچھ عرصہ ہم معمول کے مطابق ملتے رہے مگر اس انکشاف کے بعد وہ یانگ شی جو پہلے ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ بالکل پژمردہ ہو کر رہ گئی۔ اس کی ساری اُمنگیں۔ آرزوئیں اور شرارتیں مر چکی تھیں۔ چند ماہ انہی اذیت ناک حالات میں گزر گئے۔

"پھر ایک روز یانگ شی نے مجھے ایک عجیب و غریب بات کہی جسے سن کر میں لرز اُٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کل رات اسے خواب میں دریائے یانگ شی ایک دیوتا کے روپ میں نظر آئے اور کہنے لگے کہ یانگ شی ہم تم سے اور تمہارے والدین سے بہت خوش ہیں کہ انہیں اپنے وعدے کا احساس ہے۔ لہٰذا ہم تمہاری جوانی اور جوانی کے ساتھ زندگی کو بھی امر بناتے ہیں اور نہ صرف تمہاری بلکہ تم سے محبت کرنے والے ہیوآن کو بھی طویل زندگی بخشتے ہیں لیکن اس کے لیے تمہیں ایک بار موت کا کھیل کھیلنا ہو گا اور اس کھیل میں ہیوآن کو درندہ بننا ہو گا۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اس پورے کھیل میں تمہیں ذرا سی بھی تکلیف نہ ہو گی۔ ہیوآن سے کہو کہ وہ تمہارا نرخرا چبا کر تمہارے جسم کا خون پی لے۔ اس طرح تم دونوں امر بن جاؤ گے۔"

ہیوآن یہ بات کہتے کہتے خود ہی لرز سا گیا تھا اور میں تو سچ مچ خوف کے مارے کانپ رہا تھا مگر ہمت کیے بیٹھا رہا۔ ہیوآن نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میں نے یانگ شی کو اس خوفناک ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر طرح سمجھایا۔ اپنی محبت اور اس کی زندگی کے واسطے دیئے۔ منت سماجت کی۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانی اور برابر اصرار کرتی رہی کہ اگر واقعی تمہیں مجھ سے محبت ہے تو دیوتا کے فرمان کو پورا کر دو۔ یہ کشمکش کئی دن جاری رہی۔ جب میں ہر طرح مجبور ہو گیا تو اس خوفناک کام پر آمادہ ہو گیا۔ اور اسے اپنے گھر کے تہہ خانے میں لے گیا پھر نہ معلوم کس طرح غیر اختیاری طور سے میرے اندر ایسی خوفناک درندگی پیدا ہو گئی کہ میں نے آناً فاناً اس کا نرخرا چبا ڈالا۔ اس کے حلق سے گرم گرم خون کا فوارہ اُبل پڑا جسے میں نے اپنے منہ میں لے لیا۔ یہ ایک ناقابل یقین سی بات ہے مگر یانگ شی کو اس طرح مرنے میں ذرا برابر بھی تکلیف نہ ہوئی۔ نہ وہ چیخی چلائی بالکل خاموشی کے ساتھ انتہائی محبت بھرے انداز میں میری گرفت میں لیٹی رہی۔ میں اس کا گلا چباتا اور خون پیتا رہا۔ وہ عالم نزع میں مجھے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ میرے گالوں پر پھیرتی رہی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے بجائے تکلیف کے بڑی راحت اور سکون مل رہا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اور میں گھنٹوں اس کی سرد لاش سے چمٹا ہوا روتا رہا۔ میں نے تہہ خانے ہی میں اس کی لاش کو بڑی عزت و احترام سے دفن کر دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ خون پینے کی وجہ سے میرے اندر بیک وقت کئی انسانوں کی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ یانگ شی کی تدفین کے بعد میں نے غسل کیا اور کپڑے پہن کر گھر سے باہر نکل آیا۔ میرے حواس بالکل بجا تھے کسی قسم کا ڈر یا خوف نہ تھا اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے اپنے اس بھیانک فعل کا یا یانگ شی کی جدائی کا ذرا برابر رنج نہ تھا بلکہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یانگ شی کو اپنی ملکیت بنا کر میں اپنے گھر کے تہہ خانے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر آیا ہوں۔ یانگ شی کے خون نے مجھے اس وقت ایسا سکون اور سرور بخشا تھا جو نہ اس سے پہلے کبھی حاصل ہوا تھا اور نہ ہی اس کے بعد۔ میں کافی دور تک چہل قدمی کرنے کے بعد لوٹا تو میرے دل میں خود بخود یہ احساس پیدا ہوا کہ اپنی محبوبہ کے لیے پھول ہی لیتا چلوں۔ میں نے خوشبودار شگفتہ پھولوں کے گلدستے خریدے اور گھر آ کر سیدھا تہہ خانے میں چلا گیا۔ قبر پر پھول چڑھا کر میں اس کی قبر سے چمٹ گیا۔

"یقین مانیں مجھے بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری آغوش میں زندہ سلامت لیٹی ہوئی ہے۔ پھر اسی عالم میں مَیں سو گیا۔ خواب میں یانگ شی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ آج بے حد خوش اور مطمئن تھی۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی مگر اس وقت وہ اور بھی زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو بالکل ہشاش بشاش تھا۔ پوری رات یانگ شی کی آغوش میں گزارنے کا احساس دل و دماغ میں تازہ تھا۔ اس کی لطیف اور گرم آغوش کا سرور جوں کا توں قائم تھا۔ دوسرے روز صبح جب میں نہانے کے لیے غسل خانے گیا اور لباس اُتارا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے آپ کو اسی عالم میں پایا جیسا کہ آپ مجھے اس وقت دیکھ رہے ہیں مگر مجھ پر کسی قسم کا ڈر یا خوف طاری نہ ہوا۔ میں نے اطمینان سے غسل کیا۔ کپڑے پہنے اور اس تبدیلی کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے حسب معمول اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لیے چلا گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"میرے نے لطیف و لذیذ ناشتہ لا کر میرے سامنے رکھا۔ میں نے ایک لقمہ اٹھایا مگر منہ میں لے جا نہ سکا۔ ہاتھ کا لقمہ پلیٹ میں رکھ کر کاؤنٹر پر آیا۔ بل ادا کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ معمول کے مطابق تمام وقت اپنا فرض منصبی انجام دیتا رہا۔ سارا دن نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ ہی کوئی ضرورت محسوس ہوئی۔

"اس رات میں پھر اپنی یانگ شی کے مرقد سے جا لپٹا اور تھوڑی ہی دیر بعد پُرسکون گہری نیند سو گیا۔ وہ کل کی طرح آج بھی اپنے قیامت خیز حسن کے ساتھ مجھے خواب میں ملی۔ وہ میرے شفاف جسم کو دیکھ کر نثار ہوتی جا رہی تھی۔ وہ میرا جسم بار بار چُومتی اور خوش ہوتی تھی پھر جاتے جاتے کہنے لگی میرے اچھے ہیوآن تم آج سارا دن نہ کچھ کھا سکے نہ ہی پی سکے ہو۔ مگر تم اس کی فکر نہ کرنا۔ دیوتاؤں نے تمہیں کھانے پینے کی علّت سے پاک کر دیا ہے۔ اوّل تو تمہیں بھوک لگے گی ہی نہیں لیکن اگر کبھی محسوس ہو بھی تو تم صرف پرندوں کا خون پی سکتے اور کچا گوشت کھا سکتے ہو۔ تم امر بنا دیئے گئے ہو۔ تم اس وقت تک نہ مر سکو گے جب تک کہ تم خود ہی میری موت کا راز کسی پر افشا نہ کر دو۔ میرا اور تمہارا یہ رشتہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تم پرندوں کے خون اور گوشت کے سوا کوئی دوسری چیز استعمال نہ کرو گے۔" ہیوآن یہ لرزہ خیز داستان بلا تکان سنائے چلا جا رہا تھا۔ میں کئی دفعہ اس دہشت انگیز کہانی کو سُنتے سُنتے لرز اٹھا تھا۔ اس وقت بھی میرے بدن میں یہ خوفناک داستان سننے کی وجہ سے کپکپی سی آگئی تھی۔ ہیوآن چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا :

"یانگ شی کے خاندان والوں کو اس کی گمشدگی سے مجھ پر ذرا سا بھی شک نہ ہوا۔ میں احتیاطاً کئی بار خود اس کے والد سے ملنے گیا مگر انہوں نے مجھ پر کسی قسم کے شک و شبہ کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ اس عالم میں ایک سال گزر گیا۔ میں کبھی کبھی دفتر سے واپسی پر کچھ پرندے خرید لاتا اور رات کو یانگ شی کے مزار کے پاس بیٹھ کر انہیں کچا کھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی صرف ان کا خون پی کر باقی گوشت پھینک دیا کرتا۔

کچھ عرصے بعد حکومت نے مجھ پر ایک بالکل جھوٹا الزام لگا کر گرفتار کر لیا۔ اس عرصے میں بعض لوگوں کو میرے شفاف جسم کے متعلق کسی نہ کسی طرح علم ہو چکا تھا۔ البتہ آہستہ آہستہ بہت سے لوگ مجھے دیوتا کا اوتار سمجھ کر میری بڑی عزت کرنے لگے۔ سینکڑوں عقیدت مندوں نے میرے مقدمے کی پیروی میں حصہ لیا۔ مگر ان کی ایک نہ چلی اور مجھے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔

"پھانسی کی سزا میں صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے کہ یکایک جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں میری یانگ شی آئی۔ وہ آج حد سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بڑے پیار سے جگایا۔ اور بولی۔ پیارے ہیوآن! آج صبح حکام اعلیٰ بظاہر تمہیں پھانسی کی سزا دے دیں گے۔ مگر تم خوف زدہ نہ ہونا۔ میرے اچھے دیوتا تم بالکل نہ گھبرانا۔ پھانسی کے تختے سے اتار کر میں تمہیں یہاں سے دُور ——— بہت دُور لے چلوں گی جہاں ہم اور تم قیامت تک پوری آزادی سے ملتے رہیں گے اور محبت کے لازوال گیت الاپتے رہیں گے۔ اور اس روز سے آج تک مَیں آپ کی اس سرزمین پر ان پہاڑیوں میں زندگی گزار رہا ہوں۔ میری یانگ شی ہر لمحے میرے ساتھ رہتی ہے۔ وہ ہر وقت میری دلجوئی کرتی ہے۔ مجھے اس کے پہلو میں بڑا سکون اور آرام ملتا رہا ہے مگر اب... مگر اب۔ ہیوآن کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل پڑے۔

میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا : "مگر اب کیا ہوا ہیوآن تم ہراساں کیوں ہو گئے؟ تم تو بڑی ہمت اور حوصلے والے انسان ہو ——— اس پوری داستان میں ہر جگہ تمہارا حوصلہ اور ہمّت ہی تو کارفرما ہے۔"

وہ میری بات سن کر بولا : "ہاں جناب۔ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ اس حالت میں قیامت تک بھی رہتا تو مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ مگر اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا اور اسی لیے اس راز کو ظاہر کر رہا ہوں کیونکہ یانگ شی کے کہنے کے مطابق میں جب میں یہ راز



کسی پر ظاہر کر دوں گا تو موت مجھے اپنی آغوش میں لے لے گی۔"

"ایک روز میں یانگ شی کے انتظار میں ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھا تھا کہ چھوٹا سا خوبصورت ہرن کا بچہ اُچھلتا ہوا میرے قریب آگیا۔ میں نے ایک ہی جھپٹے میں اسے پکڑ لیا۔ وہ میرے ہاتھوں میں بُری طرح مچلتا رہا مگر مجھے اس وقت شدّت کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ننھے مُنّے خوبصورت بچے کا گلا چبا ڈالا اور اس کا گرم گرم خون پی گیا۔ ابھی میں اس کا خون پی ہی رہا تھا کہ فضا میں ایک عجیب قسم کی لرزہ خیز گڑگڑاہٹ ہوئی۔ ساری فضا لرز اٹھی اور مجھے یانگ شی کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے دردناک لہجے میں چیخ رہی تھی: "ہیوآن ——— ہیوآن، یہ تم نے کیا کیا ——— ہیوآن یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ یہ تم نے کیا کر دیا؟"

"میں نے تڑپتے ہوئے ہرن کے بچے کو یونہی چھوڑ دیا اور کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فضا میں ایک گہرا غبار سا اٹھا اور میرے خوابوں کی ملکہ یانگ شی پریشان حال میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بڑی دُکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی طرف دوڑا۔

"خبردار ہیوآن، اب میرے قریب نہ آنا۔ اُف ہیوآن آج تم نے میری محبت کا گلا خود ہی اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالا ہے۔" اس نے کہا "تمہیں تو صرف پرندوں کے خون اور گوشت کی اجازت تھی یہ تم نے ہرن کے بچے کو کیوں چبا ڈالا؟ تم دیوتاؤں کی نصیحت کو کیوں بھول گئے ....؟"

"اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں واقعی گھبرا گیا تب یانگ شی نے رقت بھری آواز میں کہا: "تمہاری اس غلطی پر دریائے یانگ شی کے دیوتا کو غصہ آگیا ہے۔ اس نے ہی یہ طوفان بھیجا ہے اور اسی نے اس طوفان میں مجھے بھسم کر ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ میں اب مر جاؤں گی ہیوآن ——— تم نے خود ہی مجھے مار ڈالا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ میری گرفت میں آنے سے قبل ہی دور بھاگ گئی اور بڑی کمزور آواز میں لڑکھڑاتے ہوئے بولی :

"دیوتا تمہیں معاف کریں ہیوآن۔ تمہاری یانگ شی کو تمہارے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ تمہاری خاطر میں زمین سے اٹھا کر پاتال میں بھیجی جا رہی ہوں...؟"

"نہیں نہیں" ——— میں چیخا ——— "یانگ شی میں ایسا کبھی نہ ہونے دُوں گا ——— میں دیوتاؤں سے خود معافی مانگ لوں گا۔ چلو میں تمہارے ساتھ دیوتا کے حضور چلتا ہوں مگر۔"

"مگر میری ان بدنصیب آنکھوں کے سامنے میری پیاری یانگ شی دیکھتے ہی دیکھتے ایک رقیق مادے کی شکل میں بہہ گئی اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میری ایک ذرا سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مجھے آناً فاناً دے دی گئی۔"

ہیوآن خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس المناک کہانی کے انجام پر میری اپنی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں میں سر جھکائے اس خوفناک آپ بیتی پر غور کر رہا تھا کہ یکایک میری نظریں اُٹھیں اور میں یہ دیکھ کر کانپ گیا کہ کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیوآن کا شفاف جسم رقیق مادے کی شکل میں زمین پر بہہ رہا ہے۔ خوف و دہشت سے میں لرز اٹھا اور میں اپنے خیمے سے باہر نکل بھاگا۔ خیمے سے باہر آنے کے چند منٹ بعد جب میرے حواس کسی قدر درست ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ صبح صادق کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔

اس لرزہ خیز کہانی کا ایک ایک حرف میرے ذہن میں تازہ تھا۔ جب صبح کی روشنی پھیلی تو میں بڑی ہمت کر کے اپنے خیمے کے اندر گیا۔ اُف خدایا، کرسی کے قریب ہیوآن کا جسم رقیق مادے کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھ پر اب تک ایک لرزہ سا طاری تھا۔ پھر میں نے اپنا خیمہ وہاں سے اکھڑوا کر کافی دُور نصب کرا لیا۔ اس واقعہ کو گو کافی عرصہ گزر چکا ہے مگر آج بھی جب مجھے یہ داستان یاد آتی ہے تو میری رُوح تک لرز کر رہ جاتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو کسی ملازم کو بھیج دو" خدا بخش نے جواُیا حیرانگی سے دیکھا اور پھر ... ایک عجیب واقعہ!

# بیری کا درخت

انوکھی کہانی

میرا نام سننے والا سمجھتا ہے کہ کسی گورے نے مجھے تعمیر کروایا ہوگا۔ ہاں بنوایا تو مجھے ایک گورے ہی نے تھا مگر وہ ولایتی نہیں، دیسی گورا تھا رنگ رُوپ اُس کا انگریزوں کا سا تھا اس لیے وہ گورا مشہور ہُوا۔ اِس خاندان کے غیر معمولی گورے رنگ کی وجہ اُن کا یمنی الاصل ہونا تھا اُن کے آباؤاجداد جو یمن کے حمیری قبیلے سے تھے کسی زمانے میں یمن سے ہجرت کر کے برِصغیر میں گھومتے گھماتے یہاں آن بسے تھے۔

میری بنیاد اُس وسیع قطعۂ اراضی کے مشرقی جانب قریباً ایک کنال کے ٹکڑے پر رکھی گئی جس پر ۱۸۰۷ء میں افغانوں کو شکست دے کر سکھوں نے شہر کے ساتھ ساتھ قبضہ کر لیا تھا اور حاکمِ شہر نے اُس وسیع قطعۂ اراضی کے شمالی جانب اپنی رہائش اور عدالت کے لیے ایک خوبصورت عمارت بنوائی تھی جس کی چھت بے مثل تھی اُس پر لکڑی کے کام سے گل کاری کا ایسا اعلٰی و نفیس کام کیا گیا تھا کہ جو دیکھتا ششدر رہ جاتا تھا۔ حاکمِ شہر نے اپنی عدالت کے سامنے کھلے میدان



کے اُس پار بندی خانہ (جیل خانہ) بھی بنوایا جو رد و بدل کے ساتھ ابھی تک باقی ہے اور اُس میں دکانیں کھل گئی ہیں۔

۱۸۴۹ء میں جب انگریز نے قصور پر قبضہ کیا تو یہی جگہ تحصیل کے دفاتر کے لیے منتخب کی، چنانچہ پرانے کاغذات میں اب بھی یہ جگہ پرانی تحصیل درج ہے۔ اس وسیع قطعۂ اراضی کے مغرب میں ایک خوبصورت کنواں تھا جس سے ملحق ایک تہ خانہ تھا۔ اس میں گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے حاکمِ شہر دوپہر کو آرام کیا کرتا تھا۔ اس تہ خانے کی کھڑکی کنوئیں کے وسط میں کھلتی تھی تاکہ ٹھنڈی ہوا آتی رہے۔ یہ تہ خانہ اور کنواں بھی آج تک موجود ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی ۱۹۰۸ء میں میری بنیاد کے رکھے جانے کی۔ میری بنیاد رکھنے والے میاں فضل دین گورا تھے۔ قد میانہ، بدن چھریرا چہرہ بیضوی، ناک ستواں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن، رنگ سُرخ و سفید جس میں یمن کے حمیری قبیلے کے خون کی آمیزش تھی۔ لباس اُن کا اُس زمانے کے رؤسا کا یعنی سفید قمیض اور شلوار اور سفید ململ کی پگڑی اور سردیوں میں اُس لباس پر لمبا گرم کوٹ۔

زمین کے اس ٹکڑے پر بیری کا ایک قدیم درخت تھا جس پر جنوں کا مسکن تھا۔ اس لیے یہ ٹکڑا ۱۹۰۸ء تک خالی پڑا رہا تھا۔ میاں صاحب راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اس لیے اُنہوں نے بیری اور اُس کے جنوں سے متعلق لوگوں میں مشہور خرافات پر کوئی توجہ نہ دی اور اُس ٹکڑے کو خرید کر میری بنیاد رکھ دی۔ مَیں بطور مہمان خانہ کے تعمیر کروائی گئی کیونکہ اُس زمانے میں بلکہ آج تک بھی اِس شہر میں کوئی صاف ستھرا اور اعلٰی قسم کا ہوٹل وجود میں نہ آیا تھا جہاں کوئی معزز آدمی ٹھہر سکتا۔ میاں صاحب کا اس زمانے میں چمڑا سازی کا کارخانہ تھا۔ اُن کے ہاں اکثر ملکی اور کبھی کبھار غیر ملکی مہمان بھی آجایا کرتے تھے جن کی رہائش کے بندوبست میں بہت دقت پیش آتی تھی۔ اُنہوں نے اس مہمان خانے کی تعمیر اِس طرز پر کروائی کہ اِس میں ملکی کے ساتھ غیر ملکی مہمان بھی آرام و آسائش سے ٹھہر سکیں، چنانچہ پہلی منزل پر بڑے محرابی طرز کے دروازے کے ساتھ ۱۶x۱۲ فٹ مربع کا ایک کمرہ بطور استقبالیہ، اس سے ملحق ۱۸ فٹ مربع کا ایک ہال کمرہ بنوایا جو مہمانوں کی نشست و طعام دونوں کا کام دے سکتا تھا۔ اس ہال کمرے کے دونوں جانب برآمدے تھے تاکہ تازہ ہوا کی آمد و رفت جاری رہے۔ وہ بجلی کے پنکھوں کا زمانہ نہ تھا۔ اُوپر دوسری منزل پر مہمانوں کے آرام کے کمرے بنائے گئے۔ میری طرزِ تعمیر چونکہ مشرقی سے زیادہ مغربی تھی اور سارے شہر میں اس طرز کا کوئی اور مکان نہ تھا اس لیے لوگ مجھے کوٹھی کہنے لگے حالانکہ میرے پیشانی پر فضل منزل لکھا ہُوا تھا۔ اُس کے باوجود میں گوروں کی کوٹھی اور مختصراً گورا کوٹھی کہلائی۔

۱۹۰۸ء سے آج تک صرف تراسی برس ہوتے ہیں۔ اِس عمر کو تو بہت سے انسان بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن عمارتوں کے لحاظ سے یہ کوئی بڑی عمر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ لڑکپن یا جوانی کی عمر کہلا سکتی ہے۔ مَیں نے اس مختصر سی زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے معزز لوگ میرے کمروں میں ٹھہرے۔ ماضی قریب کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کی یہاں چلتے پانی سے تواضع کی گئی۔ سرکاری افسر بھی اپنے دوروں پر یہاں ٹھہرتے رہے۔ ملکی اور غیر ملکی تاجر بھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بعض اوقات مجھ میں ایسے لوگ بھی آن ٹھہرے جو اپنے گھروالوں سے کسی بنا پر ناراض ہو گئے تھے اور ایسے سرکاری افسر بھی جن کا یہاں تبادلہ ہو گیا اور اُنہیں مناسب رہائش نہیں مل رہی تھی۔ غرضیکہ پاکستان بننے سے قبل ہندو و مسلم اور سکھ بھی جن کا کچھ تعلق میاں صاحب سے ہوتا یہاں آن ٹھہرتے تھے۔ کوئی ایک آدھ دن ٹھہرا، کوئی دو چار دن اور کوئی ہفتہ دو ہفتے بعض مہمان ایسے بھی آتے جن کا قیام برسہا برس رہا۔ مَیں اگر سب کا تذکرہ کرنے لگوں تو مہینے درکار ہوں گے۔ شاید آپ کے پاس اتنا وقت نہ ہو، لہٰذا مَیں اپنی اور اپنے بعض خاص مہمانوں کی چند دلچسپ داستانیں مختصراً بیان کرنے پر اکتفا کروں گی۔

مَیں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری تعمیر سے پہلے اس جگہ بیری کا درخت ہُوا کرتا تھا جس پر جنات کا بسیرا تھا، لیکن میاں فضل دین نے راسخ العقیدہ، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونے کی بنا پر اس کو خرافات خیال کرتے ہوئے اس کی کچھ پرواہ نہ کی تھی اور اُس درخت کو کٹوا دیا تھا۔ جن چونکہ ایک مدت سے یہاں رہتے چلے آ رہے تھے، اِس لیے انہوں نے بیری کے کٹ جانے کی زیادہ پرواہ نہ کی اور اپنا ٹھکانہ نہ چھوڑا۔ وہ میرے مالکوں اور مہمانوں کو طرح طرح سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے۔ بچوں کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتے، نوجوانوں سے شرارتیں کرتے اور بڑوں سے اُن کی نیک و بد زندگی کے لحاظ سے سلوک کرتے۔

جنات کو بیری کے درخت کے کٹ جانے کا غصہ تھا، لہٰذا جب میں مکمل ہو چکی تو ہال کمرہ (جہاں میاں صاحب کی نشست ہُوا کرتی تھی) کی بتّیاں اندر سے خود بخود لگ جاتیں جنہیں کھولنے کے لیے نوکروں کو روشن دانوں میں سے اندر اُترنا پڑتا۔ کبھی مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ جنہیں گلوب لیمپ کہا جاتا تھا، خود بخود بُجھ جاتے یا بُجھے ہوئے لیمپ جل اُٹھتے۔

اُن ہی شروع شروع کے دنوں کی بات ہے کہ شیخ محمد صدیق تھانے دار میاں صاحب کے مہمان ہُوئے۔ کسی نے کہا ہوش سے سوئیے گا، اِس کوٹھی میں جنّات کا بسیرا ہے، لیکن تھانیدار نے ساری بات قہقہے میں اُڑا دی۔ رات جب وہ میٹھی نیند سو رہے تھے تو کسی نے اُن پر سے رضائی کھینچ لی۔ اُنہوں نے نیند ہی میں رضائی اپنے اُوپر درست کر لی مگر ذرا دیر بعد پھر وہی حرکت ہُوئی تو وہ پریشان ہو کر اُٹھ گئے۔ لیمپ جلایا اور رضائی درست

نیوی کا ایک جہاز بھٹک کر ایک چھوٹے سے نامعلوم جزیرے کے قریب جا نکلا۔ جزیرہ بہت خوبصورت تھا اور وہاں کی لڑکیوں کو بلاشبہ دنیا کی حسین ترین مخلوق کہا جا سکتا تھا۔ جہاز کا ایک نوجوان سپاہی جلد ہی لڑکیوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ اپنے چھوٹے سے کیمرے سے دن بھر لڑکیوں کی تصویریں کھینچتا رہتا۔ وہ تصویریں کھینچنے کے بہانے تقریباً ہر لڑکی کو گھمانے لے جا چکا تھا۔ نوجوان سپاہی کے افسر نے رشک بھرے لہجے میں اس سے دریافت کیا "تم دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہے ہو۔ اتنی فلمیں تمہارے پاس کہاں سے آ گئیں؟"

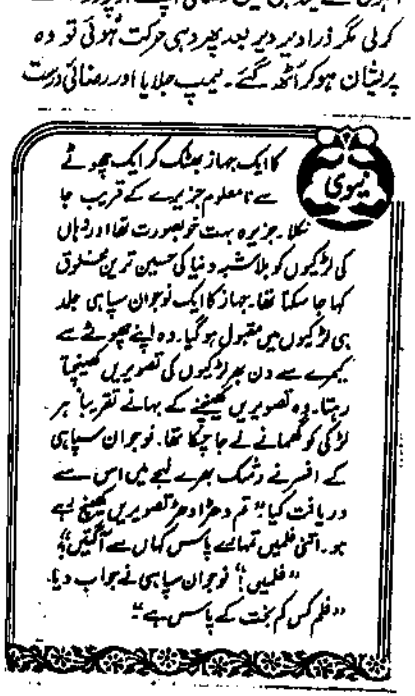

"فلمیں!" نوجوان سپاہی نے جواب دیا۔

"فلم کس کم بخت کے پاس ہے۔"



کر کے پھر سے لیٹ گئے لیکن رضائی کے ایک کونے سے آنکھ لگائے رہے۔ انہیں نظر تو کچھ نہ آیا مگر رضائی سر سے کھینچ کر پاؤں میں آن رہی۔ اُنہوں نے سرہانے کے نیچے رکھا پستول نکالا۔ پلنگ کے نیچے جھانکا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا مگر بے سُود۔ آدھی رات اور شدید سردی، ٹھٹھر کر پھر سے رضائی میں آن دبکے، خاصی دیر جاگتے رہے۔ نیند نے پھر غلبہ کیا اور رضائی میں منہ دے کر لیٹ گئے۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ رضائی پھر سے کھینچ لی گئی۔ یہ کھینچا تانی ساری رات جاری رہی۔

تھانے دار صاحب صبح بالائی منزل سے جب نیچے اُترے تو انتہائی پریشان اور سخت ہراساں تھے۔ رات کی بیداری سے آنکھیں سُوجی ہوئیں اور خوف سے چہرہ پیلا پڑا ہُوا۔ نوکر نے بہت مشکل سے ناشتے کے لیے اُنہیں روکا۔ ناشتے پر اُنہوں نے رات جو بیتی تھی بیان کی۔

"محبت کی یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں"——میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس دن کے بعد شیخ محمد صدیق کا جب بھی آنا ہُوا، میاں صاحب کی حاضری تو ضرور دی مگر رات کسی اور جگہ بسر کی۔

اُن ابتدائی برسوں میں ایک جن بچے نے والدین سے ضد کی کہ وہ کچھ وقت کے لیے انسانوں میں رہنا چاہتا ہے۔ والدین نے اُسے سمجھایا کہ جن بچے کا انسان بن کر انسانوں میں گزارا کرنا بہت ہی مشکل ہے ہاں البتہ اگر وہ چاہے تو بلّے کی شکل و صورت میں انسانوں میں رہ سکتا ہے۔ اُس نے ایسا کرنا منظور کر لیا اور والدین نے اُسے اپنی ہیئت بدلنے کا گُر سکھلا دیا اور اُس نے ایک چِتکبرے بِلّے کی صورت اختیار کر لی۔

میاں فضل دین دوپہر اور شام کا کھانا اکثر یہیں کھایا کرتے تھے، کیونکہ کوئی نہ کوئی مہمان موجود ہوتا تھا اور جب ایسا نہ ہوتا تو گھر پر کھانا کھاتے۔ یہ چِتکبرا بِلّا ہمیشہ اُن کے دسترخوان پر بیٹھتا تھا۔ اُس کے لیے یہاں اور گھر میں علیحدہ طشتری کا انتظام تھا۔ میاں صاحب کھانے کے لیے جب ہاتھ دھوتے تو وہ بھی نل پر باقاعدہ اپنا منہ اور پنجے دھوتا اور اُن کے ساتھ دسترخوان پر اپنی جگہ آن بیٹھتا۔ نوکر اُس کی طشتری لگا دیتا۔ میاں صاحب پہلا نوالہ شوربے میں بھگو کر اُس کی طشتری میں ڈالتے اور دوسرا نوالہ خود لیتے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا تاآنکہ بِلّا سیر ہو جاتا اور طشتری سے الگ ہٹ جاتا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ وہ نوالہ ڈالنا بھول جاتے اور اُسے بھوک ابھی باقی ہوتی تو وہ نیچے سے اُن کا دامن آہستہ سے کھینچتا اور وہ مسکرا کر نوالہ ڈال دیتے۔ کھانے کے بعد میاں صاحب کے ساتھ نل پر جا کر پنجے اور منہ پانی میں ڈبو کر صاف کرتا۔ رات میاں صاحب جب یہاں سے گھر جاتے تو بِلّا ایک چوب دار کی طرح اُن کے آگے آگے دوڑتا چلا جاتا اور یہ علامت ہوتی کہ وہ گھر آ رہے ہیں۔ انہیں گھر پہنچا کر وہ رات بھر کے لیے غائب ہو جاتا اور ناشتے پر آن موجود ہوتا۔ جب میاں صاحب اپنے رُوئی کے کارخانے جِک جھرہ گئے ہوتے تو اُن دنوں یہ بِلّا نظر نہ آتا۔

جنات کو میاں فضل دین کا اپنی اولاد سے پیار و محبت کا یہ سلوک بہت اچھا لگا اور اُنہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ رہیں گے تو یہیں لیکن کوٹھی کے مالکوں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اُس کے مکینوں کو تنگ نہیں کیا کریں گے۔ چنکبرے بِلّے کی یہ دوستی میاں صاحب سے اُن کے انتقال تک جاری رہی۔ یکم مارچ ۱۹۴۳ء کو میاں فضل دین گورا نے چک جھمرہ میں انتقال کیا اور اُن کی میّت قصور لائی گئی۔ یہ چنکبرا بِلّا بھی اُن کے جنازے کے ساتھ ساتھ چلا۔ اُس پر میاں صاحب کے ایک بیٹے کی نظر پڑی تو اُنہوں نے پکڑ کر گھر بھجوا دیا۔ اُس کے بعد یہ چنکبرا بِلّا کسی کو نظر نہ آیا۔ نظر آتا بھی کیونکر ؟ میاں صاحب کی اولاد تو اُسے ایک بِلّا خیال کیے ہوئے تھی مگر وہ تھا ہی کچھ اور!

مَیں تو میاں صاحب کا ڈیرہ اور مہمان خانہ تھی۔ اُن کی رہائش سو ڈیڑھ قدم اندر محلّے میں تھی۔ جب کوئی بہت ہی معزز مہمان آجاتا اور اُس سے ملاقات لمبی ہو جاتی تو گھر اطلاع کروا دیتے اور یہیں پڑ رہتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر سونے کے لیے جب میرے ایک کمرے میں آئے تو وہاں اُن کے پوتے عبدالوحید جو قیامِ پاکستان کے بعد لاہور کے راشننگ کنٹرولر مقرر ہوئے اور بعد میں ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی ڈائرکٹر فوڈ ریٹائر ہُوئے اور ۱۹۷۵ء میں وفات پائی، اُن دنوں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں یہیں مقیم تھے۔ دادا ابّا کے پاؤں دابنے لگے۔

"میاں عبدالوحید! مجھے نیند آنے لگی ہے"۔۔۔ جب نیند طاری ہونے لگی تو میاں صاحب نے کہا۔

عبدالوحید اُٹھ گئے اور میاں صاحب نے کروٹ بدل لی۔ ذرا دیر بعد پھر اُن کے پاؤں دابے جانے لگے۔

"میاں عبدالوحید!" ۔۔۔ میاں صاحب نے آنکھیں بند کیے کیے کہا ۔۔۔ "تم گئے نہیں۔ بس اب جاؤ، میری نیند خراب ہو رہی ہے۔"

پاؤں دابے جانے بند ہو گئے مگر ذرا دیر بعد اُن کے پاؤں پھر سے دابے جانے لگے۔ اب کے میاں صاحب نے خفگی سے آنکھیں کھولیں کیونکہ یہ سعادت مندی اُن کے لیے تکلیف کا باعث بن گئی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں اُنہیں عبدالوحید نظر نہ آیا تو حیران ہُوئے، اُٹھ کر دیکھا۔ عبدالوحید وہاں ہوتے تو نظر آتے۔ اب بات اُن کی سمجھ میں آگئی کہ سعادت مند کون ذات شریف ہیں۔ مسکرائے اور لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب پھر وہی پاؤں دابے جانے کا سلسلہ شروع ہُوا تو انہوں نے غیر مرئی مخلوق سے کہا ۔۔۔ "بہت بہت شکریہ! مَیں تم سے بہت راضی ہُوں مگر اب مجھے سو جانے دو، بہت مہربانی ہوگی۔"

غیر مرئی مخلوق مان گئی اور میاں صاحب سُکھ کی نیند سو گئے۔

مَیں نہ صرف میاں صاحب کا ڈیرہ اور مہمان خانہ تھی بلکہ بعد میں اُن کے نوجوان پوتوں کی رہائش گاہ بھی بنی رہی۔ میاں صاحب کے یہاں دستور تھا کہ اُن کے چار بیٹوں میں سے جس کا لڑکا مڈل پاس کر لیتا "کوٹھی" اُٹھ آتا۔ صبح نہانے دھونے کے لیے گھر جاتا اور ناشتہ کر کے کوٹھی آجاتا۔ سکول کے بعد کھانے کے مقررہ اوقات میں اُس کا گھر جانا ہوتا تھا۔

میاں صاحب کے پوتے فیاض احمد ۱۹۴۳-۴۴ء میں میٹرک کے طالب علم تھے اور حسبِ دستور کوٹھی میں مقیم تھے۔ شام کو بازار کی سیر کرتے ہوئے آئے تو اُن کے کمرے کے رنگ دار شیشوں سے بجلی کی روشنی چھن رہی تھی۔ خیال کیا کہ کوئی بے تکلف دوست آیا بیٹھا ہے۔ زینہ طے کر رہے تھے کہ روشنی



غائب ہو گئی۔ خیال کیا کہ دوست نے شرارت کی ہے۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ حیران ہوئے، دروازہ کھولا اور بٹن دبایا تو روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ سمجھ گئے کہ شرارت کسی غیر مرئی دوست کی ہے۔

آٹھ دس برس پہلے کی بات ہے کہ میاں صاحب کے نواسے خالد سلیم اور پوتے مرتاح احمد اور اُن کے دوست میری بالائی منزل کی چھت پر شام کی محفل جمانے لگے۔ تاش کھیلی جاتی اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پی جاتیں۔ ایک شام حسبِ دستور ہارنے والوں نے سوڈے کی بوتلیں منگوا کر پلائیں اور اُن کے ڈھکن ایک طرف کو پھینک دیئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ڈھکن گھومنے لگے ہیں، پھر کبھی اُوپر اُٹھ جاتے ہیں اور کبھی نیچے آجاتے ہیں۔ اس پر اہلِ محفل میں سے ایک نے گالی بک دی تو شیشے کا ایک گلاس اُڑتا ہُوا آیا اور اُن کے درمیان گِر کر چُور چُور ہو گیا۔ اس سے اہلِ محفل سراسیمہ ہو کر بھاگ گئے اور پھر ایک مدّت ایسی محفل نہ جمی۔

میرے رُخ پر اور بائیں ہاتھ کو کُھلا میدان ہے جو تحصیل کے دفاتر یہاں سے اُٹھ جانے کے بعد سے جوتیوں والی منڈی کہلانے لگا کیونکہ یہاں کے پُرانے بندی خانوں اور اُن سے ملحق مکانوں میں سُرخ چڑے اور تلے کے کام کے دیسی جوتے بنانے والوں نے یہاں بھی کام شروع کر دیا تھا۔ قصور کے جوتے نہ صرف پنجاب بلکہ پُورے ملک میں مشہور تھے۔ یہ کُھلا میدان تو سکھوں کے زمانے ہی سے چلا آتا ہے لیکن تحریکِ خلافت کے آغاز میں اس نے جلسہ گاہ کا کام بھی دینا شروع کیا۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے مولانا محمد علی جوہر کی والدہ امّاں بی کو یہاں تقریر کرتے دیکھا اور اس میدان میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے کئی بار دھواں دھار تقریریں کیں۔ چوہدری فضل حق کی آواز مَیں نے سُنی اور پھر قیامِ پاکستان سے پہلے ملک برکت علی اور میاں افتخار الدین کے جلسوں کے سٹیج میری آنکھوں کے سامنے بنائے گئے۔ ممتاز دولتانہ اور نواب ممدوٹ کی چپقلش کے بعد میرے ہی ہال کمرے میں قصور میں جناح لیگ کی بنیاد رکھی گئی اور پھر اسی ہال کمرے میں چوہدری محمد علی کی دعوت کی گئی اور انہوں نے نظامِ اسلام پارٹی کے سلسلے میں اسی میدان میں جلسہ کیا اور قیامِ پاکستان سے قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا جب تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں دَورے پر نکلے تو انہوں نے میرے ہی کمروں میں قیام کیا۔ زمانۂ حال میں ہر ایم پی اے اور ایم این اے اپنی انتخابی مہم کے دوران میں یہاں دو ایک جلسے ضرور کرتا ہے۔

میاں فضل دین گورا کے زمانے ہی سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ قصور کی شیخ برادری کے آپس کے چھوٹے بڑے جھگڑے یہیں طے ہو جاتے تھے۔ تھانوں اور عدالتوں میں جا کر دھکے کھانا بے عزتی خیال کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مارچ ۱۹۴۳ء میں اُن کی وفات کے بعد اُن کے تیسرے بیٹے میاں محمد صدیق گورا نے جاری رکھا۔ ۱۹۵۹ء میں اُن کا انتقال ہُوا اور ۱۹۶۰ء میں ایوب خان کا بی ڈی سسٹم جاری ہُوا تو میاں صدیق کے بیٹے میاں فیاض احمد گورا بی ڈی ممبر بنے۔ مَیں اپنے حلقے کی مصالحتی عدالت بھی بنی۔ بی ڈی سسٹم کے ختم ہو جانے کے بعد اب بھی کچھ لوگ اپنے تنازعے طے کروانے کے لیے میاں فیاض احمد گورا کے پاس چلے آتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اس طرح دادا سے پوتا تک مَیں نے تین نسلیں لوگوں کے تنازعے اور جھگڑے تماشائی دیکھی ہیں۔

میری آنکھوں نے نہ صرف اماں بی سے لے کر چوہدری محمد علی تک قومی لیڈروں کو دیکھا اور میرے کانوں نے اُن کی تقریریں ہی سنیں بلکہ بعض امیر کبیر گھرانوں کے رُوٹھے ہُوئے بیٹوں کو بھی اپنی گود میں پناہ دی ہے اور بعض ایسے اللہ والوں نے مجھے ٹھکانہ بنایا جو اپنے عزیز و اقارب اور ٹھکانوں کو ترک کر آئے تھے۔

پٹنہ کے ایک نواب گھرانے کے چشم و چراغ نواب زادہ اسد اللہ تھے۔ ان کے والد نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری نوجوان بیوی کر لی تھی اور اُن کے یہ نوجوان صاحبزادے اس بنا پر والد سے ناراض رہنے لگے تھے۔ اُن کے دوست حسین امام تھے۔ وہ بھی کسی بنا پر اپنے والد سے ناراض تھے۔ اُن کی ننھیال قصور تھی۔ اُنہوں نے ننھیال آنے کا پروگرام بنایا تو نواب زادہ اسد اللہ بھی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ حسین امام کے ننھیال کی رہائش ایک اوسط درجے کے مکان میں تھی جہاں نواب زادہ کا قیام مشکل تھا لہٰذا اُنہوں نے میاں صدیق گورا سے بات کی اور اُنہوں نے نواب زادہ کو یہاں اُٹھ آنے کو کہا۔

بلاشک و شبہ گورا خاندان کے لوگ اپنے رنگ رُوپ اور ناک نقشے میں قصور کے اکثر گھرانوں سے زیادہ خوبصورت تھے لیکن نواب زادہ اسد اللہ اُن سے بھی چند قدم آگے تھے، رنگ گورا، پیشانی کشادہ، لب نازک قد نکلتا ہُوا۔ اُن کے آنے سے میری خوبصورتی میں مزید اضافہ ہُوا۔ وہ یہاں دو ڈھائی برس مقیم رہے۔ اُن کے والد گو اُنھیں باقاعدگی سے ماہانہ

### انکم ٹیکس آفیسر

ایک مداری ایک بڑے مجمع میں کرتب دکھا رہا تھا اس نے کوٹ کی جیب سے ایک لیموں نکالا اور اس کے رس کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا پھر اس نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا "ہے کوئی مائی کا لال! جو اس لیموں سے ایک قطرہ بھی نکال سکے۔"

مجمعے پر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر ایک آدمی آگے بڑھا اور اس لیموں کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر بہت سے قطرے نکال دیئے۔ لوگ حیران رہ گئے سب سے زیادہ حیرانی مداری کو ہوئی اس نے آدمی سے تعجب بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم بھی کوئی مداری ہو؟" "نہیں!" آدمی نے جواب دیا۔ "میں تو انکم ٹیکس آفیسر ہوں۔"

مبشر حسین اشعر ـــــ مظفر گڑھ

بھجواتے تھے لیکن میاں صدیق گورا اُن کی مہمانی میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ وطن اور عزیز و اقارب سے دُوری کا دُکھ بہت گہرا دکھ ہوتا ہے اور یہ دُکھ انہیں دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ آخر ش وہ گھر لوٹ گئے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر سینی ٹوریم میں داخل ہو گئے ہیں اور وہیں اُن کا انتقال ہُوا۔

میاں فضل دین گورا ابھی زندہ تھے کہ ایک درویش اُن کے ہاں مہمان ہُوئے اور اُنہوں نے میری دوسری منزل پر اپنا بوریا بچھا لیا۔ حسبِ دستور اُن کا دو وقت کا کھانا اور ناشتہ میاں صاحب کے ہاں سے آتا رہا۔ اِس درویش کو سوائے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی یاد



کے اور کوئی کام نہ تھا۔ مَیں بہت خوش ہُوئی کہ یہاں سرکاری افسر، تجارتی فرموں کے نمائندے، میاں صاحب کے مسلمان، ہندو اور سکھ دوست سبھی مہمان ہُوئے، لیکن اب تک کسی اللہ والے نے یہاں ڈیرہ نہیں جمایا تھا۔ اُن کا وطن تو اب مجھے یاد نہیں، شاید اُنہوں نے کسی سے اِس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ چونکہ اُن کی مادری زبان اُردو تھی اس لیے وہ دہلی یا اُس کے پار کے کسی علاقے کے رہنے والے ہوں گے۔ اِس درویش کی ایک ہی ضد تھی کہ حضورؐ کے دیدار ہوں اور اسی جگہ ہوں۔ آخر ایک دن اُس کی یہ آرزو پُوری ہوئی اور وہ حضورؐ کے دیدار سے نوازا گیا۔ حضورؐ بنفسِ نفیس ایک شیر پر سوار تشریف لائے۔ اُس وقت میاں فضل دین بڑے دروازے کے باہر معززینِ شہر کی محفل جمائے بیٹھے تھے کہ اُس درویش نے دوسری منزل کی بالکونی سے دو مرتبہ صدا لگائی ـــ "میاں فضل دین فوراً اُوپر آؤ، تمہارا دین دنیا سدھر جائیں گے" لیکن اُنہوں نے درویش کی اس صدا کو مجذوب کی بڑ خیال کیا اور اُوپر نہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ درویش نیچے اُترا اور اُس نے میاں صاحب سے اس انہونے واقعہ کا تذکرہ کیا تو میاں صاحب تصدیق کے لیے اُوپر گئے تو دیکھا کہ شیر کے پنجوں کے تازہ تازہ نشان چھت کی گرد پر ثبت ہیں اور انہیں حضورؐ کے شرفِ دیدار کی اِس محرومی کا ساری عمر افسوس رہا۔ انہوں نے اپنے اِس دکھ کا اظہار دوستوں سے کئی بار کیا۔

اس درویش کی ضد جب پُوری ہو چکی تو اُس نے وطن جانے کے لیے بوریا سمیٹا اور ایک دن میاں صاحب یہ کہتے ہوئے کہ میرا وقت پُورا ہونے والا ہے، اپنے وطن جا رہا ہُوں، اِنشاء آپ کو میری خدمت کی جزائے خیر دے، اجازت چاہی۔ میاں صاحب نے اُسے رخصت کیا اور زادِ راہ کے لیے بھی کچھ دیا۔

چند دن ہی گزرے تھے کہ وہ درویش لوٹ آیا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ میرا وقت پُورا ہو گیا ہے" ــــــ میاں صاحب نے مسکراتے ہُوئے پُوچھا۔

"ہاں! وقت تو ضرور پُورا ہو گیا ہے مگر میرا خمیر اِسی مٹی کا ہے اور مجھے یہیں دفن ہونا ہے"

میاں صاحب نے درویش کے اِس جواب پر ایک حرف نہیں کہا، صرف مُسکرا دیئے۔ درویش نے دوسری منزل میں اُسی جگہ ڈیرہ جما لیا لیکن اب کے اُس کا ڈیرہ صرف دو چار دن ہی جما اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اُس نے وصیت کی تھی کہ مجھے بطورِ امانت دفن کیا جائے کہ شاید میرے عزیز و اقارب میں سے کوئی میری تلاش میں یہاں آ نکلے، چنانچہ اُسے بڑے قبرستان میں گورا خاندان کی چوکھنڈی میں بطورِ امانت دفنا دیا گیا۔ اِس بات کو اب نصف صدی سے بھی زیادہ ہو گئی اور وہ درویش خدا مست میٹھی نیند پڑا سوتا رہا۔ اُس کے کسی عزیز نے آ کر اُس کی نیند میں خلل نہیں ڈالا۔

اس درویش سے مجھے ایک ایسا ضدی فقیر یاد آیا جو میاں صاحب کے پاس شراب کی ایک بوتل کی فرمائش لے کر آیا تھا۔ میاں صاحب صوم و صلوٰۃ کا پابند اُس کی ایسی فرمائش کیونکر پوری کر سکتا تھا چنانچہ اُنہوں نے کھرا جواب دے دیا کہ مَیں یہ فرمائش پُوری نہیں کر سکتا اور کوئی سی فرمائش کرو، میرے بس میں ہُوا تو ضرور پُوری کروں گا مگر وہ فقیر شراب کی بوتل پر ہی بضد رہا۔

جنوری کی شدید سردی کا زمانہ تھا میاں صاحب

www.iqbalkalmati.blogspot.com



عشاء کی اذان پر اٹھ کر مسجد چلے گئے اور مسجد سے گھر، مگر انہیں نیند نہیں آ رہی تھی، اُن کا دھیان فقیر کی طرف تھا جسے وہ میری دہلیز پر چھوڑ گئے تھے۔ وہ گھر سے گرم دودھ کا گلاس لیے فقیر کے پاس آئے اور اُس کی بہت منت سماجت کی کہ پی لے اور اوپر جا کر گرم بستر میں آرام کرے مگر اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک شراب کی بوتل نہیں دلواؤ گے، یہیں کوٹھی کے سامنے پڑا رہوں گا۔ میاں صاحب نے سُوکھی لکڑیاں منگوائیں اور میری دہلیز سے ذرا ہٹ کر ایک الاؤ روشن کروا دیا۔ فقیر نے ساری رات اسی الاؤ کی تپش میں کاٹ دی اور جب دن چڑھا تو اُسی الاؤ کی راکھ کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ میاں صاحب کے اُس زمانے میں قصور کے علاوہ فیروزپور، پھالیاں، علی گڑھ اور چک جھمرہ میں رُوئی بیلنے کے کارخانے تھے اور وہ نہ صرف شہر ہی کے بلکہ علاقے کے بڑے بڑے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے اور اپنے دروازے پر اس طرح کسی فقیر کا دھرنا مار کر بیٹھ جانا اُنہیں بہت کھٹک رہا تھا، لیکن اُس کی فرمائش ایسی تھی جس کا پورا کرنا اُن کے دین میں حرام تھا، سو پورا دن اسی کشمکش میں گزر گیا۔

شام کی آمد آمد ہوئی، سردی بڑھنے لگی تو میاں صاحب کو خدشہ ہوا کہ کہیں یہ فقیر ایسی شدید سردی میں اللہ ہی کو پیارا نہ ہو جائے۔ اُسے بہت سمجھایا لیکن وہ فقیر بھی اپنی ضد کا پکا تھا اور دوسری رات بھی اُس نے الاؤ کے سامنے گزار دی جو سرِ شام روشن کر دیا گیا تھا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسری شام ہوئی تو مغرب کی نماز کے بعد میاں صاحب نے دُعا مانگی، اے اللہ! میں تیرے ہی ایک بندے کے ہاتھوں زچ اور بے بس ہو کر ایک ایسا کام کرنے چلا ہوں جسے تُو نے گناہ قرار دیا ہے۔ تُو ہر گناہ بخشنے پر قادر ہے، میرا یہ گناہ بھی بخش دیجو جو مجھ سے سرزد ہونے والا ہے کہ تیرے اس بندے کی بھوک و پیاس نے میری رات کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔

مسجد سے مغرب کی نماز کے بعد حسبِ عادت وہ کوٹھی آئے اور خزانچی سے کہا — "جاؤ میاں جس قسم کی شراب یہ فقیر چاہتا ہے، ٹھیکے سے لا کر اسے دے دو! اور ساتھ ہی اس کے کھانے کا انتظام بھی کراؤ!"

خزانچی نے حیرانی و پریشانی سے میاں صاحب کی طرف دیکھا۔

"اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو کسی ملازم کو بھیج دو!" — میاں صاحب نے کہا۔





فقیر نے جس شراب کا نام لیا وہی منگوا دی گئی اور بہت سا کھانا بھی ایک سینی میں لگ کر آ گیا۔ فقیر نے کھانا کھایا اور شراب کی بوتل منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا۔

"میاں فضل دین!" — فقیر نے سرُور سے جھومتے ہوئے کہا — "مانگ کیا مانگتا ہے؟"

"اللہ کا دیا سب کچھ ہے، کسی چیز کی حاجت باقی نہیں" — میاں صاحب نے کہا — "بس یہ دُعا کرو کہ اللہ میرا یہ گناہ معاف کر دے!"

"یہ تیرا نہیں میرا گناہ ہے" — فقیر نے کہا — "اور اللہ دوستوں کے گناہ نہیں، اُن کی دوستی کا دیکھنے والا ہے۔ مَیں جانوں اور میرا اللہ! تُو اس میں دخل مت دے۔ جا عیش کر، تیری اولاد بھی عیش کرے اور اُن کی اولاد بھی عیش کرے گی اور اُن میں سے بعض یہی گناہ کریں گے جو مَیں نے کیا ہے اور اللہ جانے گا تو اپنے اس غلام کے صدقے [illegible] بخش دے گا!"

فقیر [illegible] اُٹھا اور ایسا غائب ہوا کہ [illegible] اور جو کچھ اُس نے کہا تھا پُورا ہُوا [illegible] میاں صاحب کے بعد اُن کی اولاد اُن کے کمائے ہوئے [illegible] دولت و جائیداد سے عیش و آرام کی زندگی بسر [illegible] رہی، پھر اُن کی اولاد کی اولادوں کا زمانہ آیا جو اب [illegible] آخری ایام کو آن لگا ہے۔ میاں صاحب کے [illegible] نے بھی عیش و آرام میں گزاری مگر اس عیش [illegible] حصول میں جائیداد کا بہت [illegible] [illegible] ہوئی۔

میرے ہاں ایک ایسا مہمان بھی بہت عرصہ مقیم رہا جو نہ صرف خود کانگرس کا لیڈر بن کر نامور ہوا بلکہ اُس کی اولاد نے بھی وکالت اور لیڈری میں اُس سے بھی زیادہ ناموری اور شہرت حاصل کی اور یہ شہرت اب اُس کی تیسری پُشت میں ہے۔ وہ صاحب مولوی عبدالقادر تھے جو گجرات سے میاں صاحب کے نام تعارفی خط لائے تھے۔ اُن کے پاس مختاری کی سند تھی۔ وہ گجرات میں مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میاں صاحب نے کوٹھی ہی میں اُن کے طعام و قیام کا بندوبست کر دیا اور وہ وکالت کرنے لگے۔ میاں صاحب کا میل جول اور اثر و رسوخ دُور دُور تک تھا جو مولوی صاحب کی وکالت کو چمکانے میں کارگر ثابت ہُوا اور مولوی صاحب کی وکالت خوب چل نکلی، پھر انہوں نے اپنی رہائش کا بندوبست کر لیا۔

میاں صاحب مہمان نواز تو تھے ہی دوست پرور بھی تھے۔ جب انہوں نے قصور میں رُوئی بیلنے کا کارخانہ لگوایا تو اُس کے برابر ہی مولوی عبدالقادر کے لیے بھی زمین خرید لی جہاں بعد میں مولوی صاحب نے ایک وسیع کوٹھی تعمیر کروائی۔ یہی وہ کوٹھی تھی جہاں خورشید محمود قصوری کے والد میاں محمود علی قصوری اور تایا مولوی محمد علی نے جنم لیا اور بعد میں شہرت کی بلندیوں کو پہنچے۔

قصور کے گرد و نواح میں جہاں بھی میاں فضل دین گورائے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لیے زمین خریدی وہاں مولوی صاحب کے لیے ایک قطعہ زمین ضرور خریدا اور مولوی صاحب بعد کو اُس کی قیمت ادا کرتے رہے۔ اس طرح وہ بھی وسیع اراضی کے مالک بن گئے، چنانچہ آج اُن کے نام پر باقاعدہ ایک محلہ کوٹ مولوی عبدالقادر ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



شیخ فضل دین دولت مند ہونے کی بنا پر میاں فضل دین کہلاتے تھے کہ یہی اِس شہر کا قدیم دستور ہے کہ مالدار شیخ ،میاں کہلاتے ہیں۔ میاں فضل دین سے دوستانہ مراسم کی بنا پر مولوی عبدالقادر کا گھرانا بھی میاں کہلانے لگا، حالانکہ مولوی عبدالقادر کا تعلق نہ تو قصور کی شیخ برادری سے تھا اور نہ ہی لاہور کے باغبانپورہ کی کاشت کار میاں برادری سے۔

میاں صاحب کے پوتوں کی جوانی کے زمانے میں مجھ میں بڑی رونقیں لگیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسروں کی دعوتیں ہوتیں۔ راگ رنگ کی محفلیں بھی جمیں اور ان میں فقیر کے پسندیدہ مشروب کا استعمال بھی ہُوا۔ عیش وآرام کی زندگی کو جیتا رکھنے کے لیے میاں فضل دین کی پیدا کردہ جائداد کا ایک بڑا حصہ غیروں کے ہاتھوں جب فروخت ہُوا تو مجھے بہت دُکھ ہُوا اور دُکھ میں اضافہ اِس خدشے سے ہُوا کہ کہیں میں بھی گورا خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر کسی اور کی ملکیت نہ بن جاؤں۔ اِدھر میری تعمیر کو قریباً ستر برس گزر چکے تھے اور میری بگڑتی ہُوئی حالت پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میاں صاحب کی جائداد تو اُن کے مارچ ١٩٤٣ء میں انتقال کے بعد ہی چاروں بیٹوں نے بانٹ لی تھی، صرف چک جھمرہ کا ایک کارخانہ تھا جو سانجھے میں چل رہا تھا اور اس کے بِٹ جانے کے بھی امکان پیدا ہو رہے تھے۔

آخر میرا یہ دُکھ درد جنّات کے اُس خاندان پر ظاہر ہو گیا جو اِس جگہ میری تعمیر سے بھی پہلے سے مقیم تھے۔ اُنھوں نے یہ بات میاں محمد صدیق کی اولاد میں فیاض احمد کے دل میں ڈالی کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اُس کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں لہٰذا خود کو بدلا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، ورنہ فضل منزل کی مرمر کی تختی بھی کسی دن اکھڑ دی جائے گی۔

بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ اُس نے میری [illegible] مرمت کروائی اور مجھے صاف ستھرا بنا کر یہاں دیسی ادویات بنانے کی ایک فارمیسی کھول دی۔ اس [illegible] وہ مجرب نسخے تیار ہونے لگے جو میاں فضل دین کے ہمسائے حکیم عبدالقادر کے زمانے سے آزمودہ چلے آ رہے تھے اور اب حکیم صاحب کا صاحبزادہ حکیم غلام الثقلین کئی برس سے اُن نسخوں کی وجہ سے شہرت حاصل کیے ہُوئے تھا۔

قریباً تیرہ برس یہ فارمیسی چلتی رہی۔ ادویات کو نسخوں کے مطابق بنا لینا کوئی مشکل بات نہ تھی مگر تو اِن ادویات کی تجارت تھی جو اِس رئیس ابنِ رئیس کے بس کی بات نہ تھی، لہٰذا یہ کاروبار چند برس قبل مدھم ہونا شروع ہُوا کہ خاصی رقم دُور دراز کے ادویات فروشوں کی طرف پھنس کر رہ گئی تھی، پھر قریباً تین برس قبل میاں





فیاض احمد گورا نے خسارے کی اِس تجارت کو بند کر دیا اور اپنی جمع پُونجی سُوت کے کاروبار میں لگا دی جس سے اتنی آمدن ہونے لگی کہ وہ باعزت طریقے سے اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں لیکن اب مسئلہ میری خستہ حالی اور ویرانی کا درپیش تھا۔ فارمیسی کے کھلنے سے میرے ہال کمرے میں رونق ہو گئی تھی اور دیسی ادویات میں استعمال ہونے والی مشک و زعفران میں مہک اُٹھی تھی۔ اس کے بند ہو جانے سے خوشبوئیں غائب ہو گئیں۔ ملازموں کی رونق ختم ہو گئی۔ میرے کمروں میں مکڑی جالے تننے لگی اور ساون بھادوں کی برساتوں سے میری دیواروں کا چُونا جھڑنے لگا اور دروازوں کا رنگ روغن اُتر گیا۔ مَیں ایک بار پھر دُکھ میں مُبتلا ہو گئی اور جنّات کے خاندان پر میرا یہ دُکھ ڈھکا چُھپا نہ رہا۔ اُنھوں نے فیاض احمد گورا کے دل میں ایک ایسی شے کی تجارت کی بات ڈالی جس کے بھاؤ آئے دن بڑھتے گھٹتے رہتے تھے اور بھاؤں کے اُتار چڑھاؤ میں اُس کی راہبری بھی کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بگڑتی ہوئی بات ایک بار پھر بن گئی۔

پچھلی سردیوں میں میری دیواروں کے جھڑتے ہُوئے چونے کو اُتار پھینکا گیا، ان پر سیمنٹ کا پلستر ہُوا، میرے بیسیوں دروازے اور کھڑکیاں جن کا رنگ و روغن ایک زمانے سے خراب ہو چکا تھا، پھر سے زمانۂ حاضر کے خوبصورت رنگ و روغن سے چمک اُٹھے اور سب سے بڑی بات میرا چہرہ مہرہ تھا کہ جس پر میرا نام اور حضورؐ کی مدح میں سنگِ مرمر کی تختیوں پر یہ شعر کندہ ہے:

محمدؐ عربی کابروی ہر دو سرا است
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

میرے چہرے کا سُرخ رنگ جسے زمانے کے انقلابات نے دُھندلا دیا تھا، کشمیر کے سیب کی طرح دمکنے لگا۔

لوگ کہتے ہیں عمارتیں اینٹ پتھر اور چُونے کے بے جان تودے ہیں۔ مَیں کہتی ہُوں نہیں، ہم بھی جذبات واحساسات رکھتے ہیں۔ مکینوں کے دُکھ سُکھ ہم پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اُن کی خوشی اور خوشحالی ہمیں بھی تازگی و توانائی بخشتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں جنّات انسانوں کو تنگ کرتے اور انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ مَیں کہتی ہُوں نہیں، جنّ نیکوں اور اُن کی اولاد کی بھی مدد کرتے ہیں اور اگر کسی کو میری بات پر شک وشُبہ ہو تو وہ مجھے یعنی گورا کوٹھی کا نظارہ کرے۔ میری ویرانی ختم ہو چکی ہے۔ میرے استقبالیہ کمرے میں صبح گیارہ سے ایک بجے تک روزانہ میاں فیاض احمد گورا اور اُن کے دوستوں کی محفل لگتی، چائے اور پان کا دَور چلتا ہے۔ اگر برادری کا کوئی تنازعہ ہو تو یہیں نمٹ جاتا ہے۔ میرے ہال کمرے میں صبح سے آدھی رات تک بجلی کے پنکھے چلتے اور برقی روشنیاں جگمگاتی ہیں۔ بلیرڈ کی شاندار میزیں بچی ہیں جہاں میاں فضل دین کے پڑپوتوں عمران اور عدنان اُن کے پرنواسے خالد سلیم اور شہر کے اُمرا وشرفا کے لڑکے فارغ اوقات میں اپنا دل بہلاتے ہیں۔ اس سے میرا دل بھی بہلا رہتا ہے اور مجھ میں بسنے مگر نظر نہ آنے والے جنّ بچّے بلیرڈ کی میزوں پر دوڑتی اُچھلتی گیندوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میری دُعا ہے کہ اللہ میاں فضل دین گورا کے گھرانے کو خوش وخرم رکھے اور یہی دُعا مجھ میں بسنے والے جنّ اور جنّ بچّوں کی بھی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا، تو اندر روزی کی لاش پڑی تھی اور جارج غائب تھا۔

# رُوح کی واپسی

پراسرار کہانی



کہنے کو تو جارج میرا دوست تھا لیکن سچ پوچھیے تو میں اس کے ساتھ کسی تقریب میں شامل ہونا، پارک میں گھومنا یا تفریح پر جانا پسند نہ کرتا تھا۔ بس صورت سے ... ہی ساکا دُون نظر آتا۔ چھوٹا قد، گنجا سر، ... آنکھیں ... دانت باہر کو نکلے ہوئے، چال ایسی بے ڈھنگی کہ ... دیکھ کر محسوس ہوتا زمین پر گیند ... لڑھک رہا ہے ... جسمانی خامیوں سے آگاہ اور ان کے ... احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ گفتگو کرتے ہوئے یکایک خاموش ہو جاتا اور کچھ سوچنے لگتا۔ سب لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور لڑکیاں تو بالخصوص اُسے دیکھتے ہی ہنسنے لگتیں۔ یہی وجہ تھی ہماری منڈلی میں بیٹھنے کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی چار دیواری سے باہر اس کا ساتھ دینا پسند نہ کرتا تھا۔ شکل صورت کے ... اس کی تعلیم معمولی اور مالی حالت خراب تھی۔ اس کے باوجود جب ... نے ایک شام یہ اعلان کیا کہ روزی اس کی ... منظور کر لی ہے، تو ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

... نہیں روزی ہمارے دوست جارج کی چہیتی ... تھی۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ شہر کے سارے کنوارے ... میرے سمیت اُسے شادی کا پیغام بھجوا چکے تھے، دوسرے اُسے جارج سے دلی نفرت تھی، کم از کم ہمارا یہی خیال تھا، کیونکہ وہ جارج سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتی تھی اور کئی بار اس نے ہمارے سامنے ... طرح اس کی بے عزتی کی تھی۔ جارج یہ خبر سنا کر چلا گیا، تو ہم سوچنے لگے ایسی حسین و جمیل لڑکی جس کے تذکروں سے کلب آباد تھا، جارج جیسے بدصورت، مفلس و قلاش اور کم تعلیم یافتہ شخص سے شادی کرنے پر کیونکر رضامند ہو گئی۔ کچھ دوستوں کا خیال تھا جارج نے یہ ... گپ لگائی ہے۔ لیکن ریمنڈ ... اتفاق سے روزی کا پڑوسی تھا۔ تصدیق کی ... نے دو تین بار روزی کو جارج کے ساتھ ... جاتے دیکھا ہے۔ ہم کل نو دوست وہاں جمع تھے اور ہم میں سے سات کو روزی نے ٹھکرا دیا تھا، حسد اور رقابت کے سبب ہماری بُری حالت تھی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہم میں سے دو



اشخاص خفیہ طور پر جارج کی نگرانی کریں اور اس امر کا کھوج لگانے کی کوشش کریں کہ روزی اور جارج کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے اور کیا واقعی وہ حسین لڑکی چڑیا کے اس غلام کے ساتھ شادی پر رضامند ہو گئی ہے یا وہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ قرعۂ فال میرے اور ریمنڈ کے نام پڑا۔ ریمنڈ تو روزی کا پڑوسی تھا مجھے منتخب کرنے کی وجہ محض یہ تھی کہ دوسروں کی نسبت جارج ... اعتماد کرتا تھا۔ علاوہ ازیں میں شادی شدہ تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی وقت بسر کر ... تھا۔ لہٰذا روزی بھی مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اُسے معلوم تھا میں اُس کا اُمیدوار نہیں ہوں۔

خدا کی قدرت دیکھیے ریمنڈ انہی دنوں بیمار پڑ گیا اور مجھے شرلاک ہومز بننے کا نہایت آسان راستہ مل گیا، یعنی میری بیوی بچوں کو لے کر اپنے میکے گئی ہوئی تھی اور میں گھر پر اکیلا تھا، چنانچہ بڑی تندہی سے روزی اور جارج کی نگرانی شروع کر دی۔ جلد ہی مجھے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا موقع مل گیا۔

مارچ کی ایک کہر آلود صبح تھی، میں جارج کے گھر سے قریب ہی ایک کیفے میں ناشتے کی غرض سے گیا، تو روزی اور جارج سڑک پر نظر آئے۔ انہوں نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ کر شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں ناشتا ادھورا چھوڑ کر اپنے موٹر سائیکل کی طرف لپکا اور آن واحد میں اسے اسٹارٹ کر کے ٹیکسی کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ ٹیکسی بڑی سڑک چھوڑ کر قبرستان جانے والی چھوٹی سڑک پر آ گئی۔ میں نے کچھ فاصلے پر ان کا تعاقب جاری رکھا۔ سینٹ اینوز کے قبرستان کے دروازے پر ٹیکسی رکی اور جارج اور روزی اُتر کر اندر چلے گئے۔ میں نے اپنا موٹر سائیکل سڑک کے کنارے ایک چائے فروش کے پاس چھوڑا اور دوڑتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا۔ وسیع و عریض قبرستان میں انہیں تلاش کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ انہیں میری موجودگی ... بہت مشکل کام تھا، تاہم میں نے جاسوسی کہانیوں اور سراغرسانی کی فلموں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بالآخر درختوں کے ایک جھنڈ میں انہیں ڈھونڈ نکالا۔

قبر کی ... روزی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ جارج اس کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا ... اہم موضوع پر بات چیت کر رہے تھے۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا ... ایسی جگہ چھپ گیا جہاں سے ان کی آواز بخوبی سنائی دیتی تھی۔ روزی کہہ رہی تھی:

"میں چاہتی ہوں میرا ہونے والا شوہر میرے حکم پر اپنی جان تک قربان کر دے۔"

"تم جب چاہو مجھے آزما سکتی ہو۔" جارج نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم نے میرے کہنے پر اپنا ہاتھ جلتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیا تھا، لیکن میں زیادہ سخت امتحان لینا چاہتی ہوں۔ وہ ایک وقتی جذبہ تھا، ہو سکتا ہے تمہیں میری وجہ سے کچھ دیر تک آزمائش میں مبتلا رہنا پڑے تو ہمت ہار بیٹھو۔"

"اب مجھے کیا کرنا ہو گا؟" جارج جیسے مکمل طور پر روزی کے قبضے میں تھا۔

"مجھے قبرستانوں سے خوف آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں رات کے وقت قبرستانوں میں آوارہ رُوحیں آتی ہیں۔ میں ان رُوحوں کی حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں، لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ رات کے وقت یہاں رہ سکوں۔ میری جگہ تم آج رات اس قبرستان میں بسر کرو اور دیکھو رات میں کسی وقت بھی یہاں آؤں ... اگر تم موجود نہ ہوئے تو زندگی بھر تم سے کلام نہیں کروں گی۔ بس اسی غرض سے تمہیں یہاں لائی تھی۔"

"ایک رات تو کیا میں عمر بھر قبرستان میں رہنے پر تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے قبر کی سِل اُٹھا کر تابوت پر لیٹ جاؤ، کل صبح میں تمہیں لینے آؤں گی۔ بسکٹ کا یہ ڈبا اور چائے کا تھرموس اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



پاس رکھ لو۔"

یہ کہہ کر روزی اُٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں چیزیں جارج کے پاس رکھ دیں۔ جارج نے پرستش کے سے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ نئی بسل ایک طرف کھسکا دی اور تابوت پر لپیٹ گیا۔ روزی نے کچھ خشک جھاڑیاں اُس کے اُوپر رکھ دیں تاکہ قبرستان میں آنے والے کسی شخص کی نظر اس پر نہ پڑے اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی قبرستان کے دروازے کی طرف چل دی۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو آگے بڑھ کر جھاڑیاں ایک طرف پھینک دیں اور ہنستے ہوئے کہا:

"بیسویں صدی کے مجنوں صاحب! ذرا باہر تشریف لائیے۔"

میری آواز سن کر جارج کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اُٹھا اور میرے قدموں میں گر کر بولا:

"خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اگر تم نے کسی کے سامنے میرے بارے میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالا، تو میں قسم کھاتا ہوں فوراً خودکشی کر لوں گا۔"

اُس نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کہی کہ مجھے رحم آ گیا۔

"میں کسی سے نہیں کہوں گا، مگر تم باہر تو نکلو۔"

جارج باہر آ گیا۔ ہم دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا، پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا:

"میں جانتا ہوں تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، تمہارا خیال ہے مجھ پر عشق کا بھوت سوار ہے، حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں — روزی کے باپ نے اُس کی ماں کو گھر سے نکال دیا تھا، ماں بیٹی اب تک ملازمت کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ روزی نے بچپن ہی سے اتنے غم اُٹھائے ہیں کہ اسے مرد کی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ ہونے والے شوہر کو اپنے قدموں پر جھکانے سے اُس کی انا کو تسکین ملتی ہے۔ وہ میری چچا زاد ہے اور میں چاہتا ہوں اُس کا مرد کی ذات پر اعتماد بحال ہو جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تم جانتے ہو شکل صورت اور مالی لحاظ سے میری حیثیت معاشرے میں اُونچی نہیں۔ میں اور روزی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اُسے اعتماد چاہیے اور مجھے کوئی ایسا وسیلہ جس کے ذریعے میرا اعتماد اپنی ذات پر بحال ہو سکے اور احساسِ کمتری دور ہو جائے۔ روزی میری آخری اُمید ہے، وہ میرے لیے محبوبہ نہیں زندگی کی علامت ہے۔ اگر اس کے ساتھ میری شادی ہو جائے تو تم سب لوگوں پر مجھے ایک طرح سے فوقیت حاصل ہو گی اور یہ فوقیت مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں مدد دے گی۔ میں نے کبھی تمہارا بُرا نہیں چاہا اور اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں میرے بارے میں اپنی زبان بند رکھو۔"

"تم کہتے ہو تو میں اپنی زبان بند رکھوں گا لیکن دوست! مجھے یقین ہے روزی کا ذہنی توازن درست نہیں۔ کیا واقعی اس نے تمہیں جلتے ہوئے انگاروں پر ہاتھ رکھنے کا حکم دیا تھا؟"

"ہاں مگر میں تمہیں اس کی وجہ بتا چکا ہوں۔ علاوہ ازیں میں اس کی خواہش پر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا چکا ہوں اور بڑے پُل پر سے دریا میں کود چکا ہوں۔ ایک بار اُس نے مجھے رسّے یا پائپ کی مدد کے بغیر تیسری منزل سے زمین پر آنے کا حکم دیا تھا اور میں نے اس حکم کی تعمیل میں اپنا ایک گھٹنا زخمی کر لیا۔ تمہیں یاد ہو گا میں نے تم لوگوں کے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ گاف کھیلتے ہوئے چوٹ لگی ہے۔ پچھلے سنیچر کو روزی کے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں یوگا کی ورزشیں لکھی تھیں۔ اس نے وہ سب ورزشیں مجھے کرائیں اور ایک دفعہ تو میں سر کے بل نصف گھنٹے تک دیوار کے ساتھ کھڑا رہا۔ روزی نے وعدہ کیا ہے وہ جلد ہی شادی کے لیے اپنی ماں سے بات کرے گی۔ شاید یہ آخری امتحان ہو کیونکہ اس ماہ کی بیس تاریخ کو روزی کی سالگرہ ہے اور وہ چاہتی ہے اس موقع پر ہماری شادی ہو جائے۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جارج کی تعریف کروں یا اس کی بے وقوفی پر قہقہے لگاؤں، تاہم اُس نے میری اتنی خوشامد



کی کہ مجھے اپنے بچوں کی قسم کھا کر وعدہ کرنا پڑا میں کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کروں گا۔ اس کی خواہش پر میں نے دوبارہ اُسے قبر میں لٹا دیا اور اس کے اُوپر خشک جھاڑیاں بکھیر دیں۔

تیسرے روز وہ کلب میں آیا تو روزی اس کے ساتھ تھی۔ اسی شام ان کی منگنی ہو گئی۔ شادی کے لیے ۲۰ تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران میں حسبِ وعدہ میں نے کسی سے جارج کے بارے میں ذکر نہ کیا، چنانچہ وہ مجھ سے بہت خوش تھا۔ ایک بار تو وہ روزی کو ساتھ لے کر میرا شکریہ ادا کرنے گھر پر بھی آیا۔

۱۹ مارچ کی شام اُس نے مجھے فون کیا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاؤں وہ مجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ہامی بھر لی۔ وہ اور روزی پلیٹ فارم پر میرے منتظر تھے۔ روزی کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ جارج بولا:

"میرے اُستاد اور دادا جان کے نہایت قریبی دوست مسٹر بروین رسج کا تار آیا ہے، وہ سخت بیمار ہیں اور مجھے بہرصورت سگنولی جانا چاہیے۔ روزی پریشان ہے، اس کا خیال ہے میں ۲۰ تاریخ کی صبح گیارہ بجے تک واپس نہ آ سکوں گا اور اس طرح شادی کا پروگرام ملتوی ہو جائے گا، تم اسے تسلی دو۔"

"روزی ٹھیک کہتی ہے۔" میں نے فوراً کہا۔ "ہو سکتا ہے مسٹر بروین رسج کی طبیعت زیادہ خراب ہو اور تمہیں وہاں رُکنا پڑے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، خدا کی، ہر قیمت پر شادی کے وقت سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے تب بھی یہاں نہ رکوں گا۔" اس نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ میں نے روزی کو تسلی دی مگر وہ آخر وقت تک یہی کہتی رہی:

"جارج تم نہ جاؤ، نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے ہماری شادی ملتوی ہو جائے گی کیونکہ تم وقت پر نہ پہنچ سکو گے۔"

جارج ہنس دیا اور مجھے اُس کا خیال رکھنے کی نصیحت کر کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں نے روزی کو موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا

## کرامت

حضرت احمد حربؒ کا ایک ہمسایہ آتش پرست تھا۔ سفر کے دوران اسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا چنانچہ آپ اس کی دل جوئی کی غرض سے اس کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ آپ کے ساتھ بہت احترام سے پیش آیا۔ وہ زمانہ قحط سالی کا تھا۔ آتش پرست کو خیال آیا کہ شاید آپ کھانا کھانے آئے ہیں۔ وہ بولا۔ گو میرا مال لٹ گیا لیکن تین چیزیں لائق شکر ہیں۔ اول یہ کہ دوسروں نے میرا مال لوٹا لیکن میں نے کسی کا مال کا غصب نہیں کیا۔ دوم یہ کہ اب بھی میرے پاس نصف دولت موجود ہے۔ سوم یہ کہ میرا مذہب محفوظ رہ گیا۔ یہ سن کر آپ نے پوچھا' آگ کو کیوں پوجتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس لیے تاکہ روز محشر جہنم کی آگ سے بھی محفوظ رہوں اور خدا کا قرب بھی حاصل ہو جائے۔ آپ نے فرمایا' آگ کی حقیقت تو اتنی سی ہے کہ ایک بچہ بھی اس پر پانی ڈال دے تو بجھ جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ کہ تم ایک عرصے سے آگ کو پوجتے ہو' آج تک اس نے تمہارے ساتھ کیا حسن سلوک کیا جس کی بنا پر تم قیامت میں اس سے کسی بہتری کی توقع رکھتے ہو؟ آپ کے ارشاد سے متاثر ہو کر اس نے عرض کیا کہ اگر آپ میرے تین سوالوں کے جواب دے دیں تو میں مسلمان ہو جاؤں۔ اول یہ کہ خدا نے مخلوق کو کیوں تخلیق کیا؟ دوم تخلیق کے بعد رزق کیوں دیا؟ سوم رزق دینے کے بعد موت سے کیوں دوچار کیا؟ آپ نے جواب دیا' تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ خالق کی شناخت ہو سکے۔ رزق عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے قادر ہونے کو تسلیم کیا جائے۔ یہی جواب تمہارے تیسرے سوال کا بھی جواب ہے۔ یہ کہہ کر آپ بہت دیر تک آگ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے رہے لیکن آپ کا ہاتھ آگ سے ذرا بھی نہیں جلا۔ یہ دیکھ کر وہ آتش پرست مسلمان ہو گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اور اُس کے گھر چھوڑ دیا۔

۲۰ تاریخ کی صبح ہم سب ٹھیک نو بجے ہی گرجا گھر پہنچ گئے۔ ۹½ بجے تک روزی نئی دلہن کے لباس میں اپنی ماں اور چند دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ آ پہنچی۔ کئی بار ہم نے جارج کے گھر سے معلوم کیا، مگر پتہ چلا وہ ابھی تک سنگاولی سے نہیں لوٹا۔ روزی نے مجھے بتایا رات اُس کا تار موصول ہوا تھا وہ صبح سات بجے والی گاڑی سے پہنچ رہا ہے ساڑھے نو بجے تک اس کے نہ پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ دس بجے والی گاڑی میں آئے گا پونے دس بجے میں موٹر سائیکل پر فوراً اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا تاکہ اُسے سواری لینے میں دیر نہ ہو جائے۔ گاڑی تین منٹ لیٹ تھی۔ دس بج کر تین منٹ سے دس بج کر دس منٹ تک یعنی جب تک گاڑی اسٹیشن پر رہی میں نے اس کا ایک ایک ڈبا چھان مارا لیکن جارج کہیں دکھائی نہ دیا۔ مایوس ہو کر میں اسٹیشن سے نکلا اور گرجا گھر کی طرف روانہ ہوا۔

دروازے پر مجھے ریمنڈ مل گیا میں نے اُسے دیکھتے ہی بلند آواز سے کہا:

"جارج نہیں آیا۔"

"جارج تو خیر پہنچ گیا ہے، البتہ اس کی حالت قابلِ رحم ہے، شاید ٹریفک کے حادثے میں شدید زخمی ہوا ہے۔" ریمنڈ نے جواب دیا۔

ہم دونوں اندر پہنچے شادی کی رسوم ادا ہو رہی تھیں، لیکن حاضرین کے چہروں پر خوف کے آثار تھے جارج واقعی روزی کے پہلو میں موجود تھا، لیکن اُف میرے خدا! اُس کا رنگ پیلا تھا کپڑے خون سے تر تھے ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور کندھے پر کاری زخم آیا تھا۔ وہ بار بار اپنی گردن سیدھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے گردن ٹوٹ گئی ہو۔ ریمنڈ نے مجھے بتایا دس بج کر دس منٹ پر وہ دوڑتا ہوا گرجا گھر میں داخل ہوا اور جب لوگوں نے اُس سے پوچھنا چاہا "تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی

---

ضرورتِ رشتہ

ایک نوجوان کریانہ فروش کو ایسی نیک دل خاتون کا رشتہ درکار ہے جس کا دل آٹے کی بوری کی طرح محبت سے بھرا ہوا ہو اور جس کی چاہت میں بے وفائی کے برادے کی ملاوٹ نہ ہو۔ خاتون عام گھریلو عورتوں کی طرح بات کو نمک مرچ لگا کر کرنے کی عادی نہ ہو تو یہ ایک اضافی قابلیت تصور کی جائے گی۔ تاہم دشمنوں کے سینے پر مونگ دلنے کی پوری اجازت لڑکی کو ہو گی بشرطیکہ وہ تیل دیکھے، تیل کی دھار نہ دیکھے۔ نکاح انتہائی سادگی مگر پُروقار طریقے سے ہو گا۔ گویا ہینگ لگائی جائے گی نہ پھٹکری۔ صرف رنگ چوکھا لانے کی کوشش کی جائے گی۔ جہیز میں مٹی کا تیل اور مسور کی دال آنا ضروری ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کو حلف اُٹھانا ہو گا کہ وہ جوتوں میں دال نہیں بانٹے گی۔



ایک ہاتھی کمپنی نوجوان دھوبن کے لیے نہایت دُبلے پتلے چھیل چھبیلے دھوبی کا رشتہ چاہیے جو ہر وقت گردن کو کلف لگا کر اکڑا کر رکھتا ہو اور نہ ہی غصے کی حالت میں بیوی کو دھوبی پٹڑا مارنے کا عادی ہو۔ معمولی میلا بھی ہو تو قابلِ قبول ہو گا۔ بشرطیکہ کپڑوں میں میل نہ ہو۔ زیادہ صابن خرچ کرنے والے اور سوڈا کا نشک میں کپڑے دھونے والے نوجوان زحمت نہ کریں۔ معیار پر پورے اُترنے والے لڑکے کو نکاح نامے میں یہ شرط درج کرانا ہو گی کہ شادی کے بعد اگر دھوبن بارہ من کی ہو گئی تو وہ اُسے چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔

---



ہے" تو اس نے انگلی لبوں پر رکھتے ہوئے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پادری صاحب کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو: "آپ شادی کی رسومات شروع کریں۔"

روزی نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بے ہوش ہو کر گرنے لگی۔ جارج نے اسے سہارا دیا۔

حاضرین دم بخود تھے۔ نہ جانے جارج کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کوئی شخص زبان سے کچھ نہ کہہ سکا خوف کی ایک سرد لہر نے سب کا احاطہ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ پادری بھی خاموشی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔

دولہا اور دلہن باہر نکلے تو کسی نے اُن پر پھول نہیں برسائے۔ پھولوں کے ہار لوگوں کے ہاتھ میں رہ گئے۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی گھر کی طرف چل دی۔ ہم چند ایک دوست محض یہ جاننے کے لیے کہ جارج کو کیا حادثہ پیش آیا ہے گاڑی کے پیچھے ہو لیے۔ ریمنڈ کا خیال تھا جارج گاڑی سے اُترا اور راستے میں اسے ٹریفک کا حادثہ پیش آ گیا، لیکن میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوا کیونکہ میری نظر نے دھوکا کھایا ہے میں نے گاڑی کا ایک ایک ڈبا تلاش کیا تھا۔

تب ہم جارج کے گھر پہنچے تو سڑک پر کہرام مچا ہوا تھا جارج کے گھر کے بازو میں روزی اور اس کی ماں رہتے تھے۔ روزی کی ماں اپنے بال نوچ رہی تھی۔ معلوم ہوا گاڑی گھر کے سامنے پہنچی اور ڈرائیور نے اُتر کر دروازہ کھولا، تو اندر روزی کی لاش پڑی تھی اور جارج غائب تھا۔ رشتہ داروں کا خیال تھا جارج نے راستے میں روزی کا گلا گھونٹ دیا ہے، لیکن میں جانتا تھا وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ ہم نے اسے سارے شہر میں تلاش کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پولیس والوں نے روزی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔

دوپہر کے وقت پوسٹ مارٹم کے نتائج آ گئے۔ ڈاکٹر نے بیان دیا تھا لاش پر کسی ضرب کا نشان نہیں اور نہ گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے، موت حرکتِ قلب بند ہونے سے اور اچانک واقع ہوئی پولیس کا خیال تھا جارج کو زخمی دیکھ کر روزی ڈر گئی اور اسی حالت میں اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی جارج نے اسے مردہ دیکھا تو اس خوف سے کہ پولیس قتل کے جرم میں گرفتار نہ کر لے چلتی ہوئی گاڑی سے باہر کود گیا۔

لیکن تین بجے سہ پہر ہمارے یہ خدشات دُور ہو گئے اور ایک ایسی حقیقت سامنے آئی جس نے حیرت کے سبب ہمیں پاگل کر دیا۔ سنگاولی سے پولیس نے اطلاع دی آج یعنی بیس تاریخ کی صبح ۵ بجے سنگاولی کے اسٹیشن کے قریب جارج نامی ایک نوجوان تیزی سے ریل گاڑی میں سوار ہونے کے لیے پلیٹ فارم کی طرف دوڑا تو ایک تیز رفتار کار نے اسے کچل دیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد تین بجے کی گاڑی سے بھیجی جا رہی ہے۔

جارج صبح پانچ بجے مر اتھا ایک بجے تک پوسٹ مارٹم ہوا، دس بجے اُس نے شادی کی اور پھر راستے ہی میں غائب ہو گیا۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس پر سے پردہ اُٹھانا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



# ہمشکل بھائی

ہنری وائٹ ہینڈ

بلو نے الماری سے چھلانگ لگائی اور اس کے حلق میں اپنے دانت پیوست کر دیئے۔ سرخ سرخ خون اس کی شہ رگ سے ابل پڑا۔

نے ٹیلی فون کا چونگا رکھتے ہوئے بروٹس سے کہا۔ دیکھو بروٹس تم آج دوپہر کو ڈاکٹر پیٹرز کے پاس چلے جانا۔ وہ تمہارا اچھی طرح معائنہ کریں گے۔ سمجھے!

"اچھا صاحب!" بروٹس اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ میں نے ایک ترحم آمیز نظر اس پر ڈالی۔ پیٹ کے درد سے غریب نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کا یہ درد میرے لیے نئی چیز نہیں تھا۔ جس دن سے وہ آیا تھا اسے اس درد کی شکایت کئی مرتبہ ہو چکی تھی۔ اس مرض کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی اور گھر کی دیکھ بھال میرے لیے دردِ سر بن گئی تھی۔ لیکن میں نے کبھی اسے برا بھلا کہا نہ نوکری سے جواب دیا۔ اگر کبھی میں اسے ملازمت سے برطرف کرنے کی سوچتا تو مجھے سٹیفن کا خیال آ جاتا جو میرا انتہائی وفادار اور خیر خواہ ملازم تھا اور جسے میں بہت چاہتا تھا۔ اسے سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اسی شوق کی بدولت اسے ایک لمبے عرصے تک مختلف جہازوں میں کام کرنے اور سیر و تفریح کرنے کا موقع مل گیا۔ ان جہازوں میں خانساماؤں اور اسی قبیل کے دوسرے افراد کے درمیان رہتے رہتے اسے خانہ داری اور گھریلو معاملات میں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ آج وہ ایک اچھے منتظم کی طرح میرے گھر کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اسی سیر و سیاحت کے دوران اس کی ملاقات بروٹس سے ہوئی تھی۔ وہ اسے افریقہ کی برطانوی نوآبادی برٹش ایفٹی گویا سے یہاں امریکی ورجن آئی لینڈ لے آیا۔ اور سینٹ تھامس میں بحریہ کے ایک افسر کے گھر ملازم رکھوا دیا۔ اپنے پرانے اور عزیز دوست کے متعلق سٹیفن بہت فکرمند رہتا تھا کیونکہ اپنی اچانک بیماری کی وجہ سے بروٹس کو وہ ملازمت ختم کرنی پڑی۔ وہ اسے میرے پاس لے آیا اور میں نے اسے عارضی طور پر خانساماں کی جگہ دے دی۔ سٹیفن کی طرح وہ بھی بڑا اچھا ملازم ثابت ہوا۔ ہاں اس کا اچانک بیمار ہو جانا البتہ تکلیف دہ تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس کا برا نہ مانا۔ اسی لیے وہ دونوں میرے گرویدہ تھے۔ ایک دن سٹیفن نے باتوں باتوں میں بروٹس کی بیماری کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے خیال میں ایک چھوٹے اپریشن کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے جرح کرنی مناسب نہ سمجھی۔ بلکہ اپنی بحریہ کے چیف سرجن ڈاکٹر پیٹرز سے اس کا ذکر کیا۔ وہ اس کے معائنے پر تیار ہو گیا۔ اگر وہ جبوت کو پیڑو ریکو جانے کا ارادہ کیے ہوئے نہ ہوتا تو شاید مجھے یہ حیرتناک تجربہ نہ ہو سکتا اور غریب بروٹس پر یہ حیرت انگیز بپتا نہ پڑتی۔ بدھ کو میں نے اسے فون کیا۔ تو اس نے کہا "اسے دوپہر کو میرے پاس بھیج دو۔ میں اس کا معائنہ شام کو کروں گا۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو کل آپریشن کر دوں گا۔ کیونکہ میں ایک ہفتے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔" تقریباً ایک گھنٹہ بعد میں نے بروٹس کو ہسپتال بھیج دیا۔ جہاں ڈاکٹر

www.iqbalkalmati.blogspot.com



نے اس کے پیٹ کا ایک چھوٹا سا آپریشن کر دیا۔ اتوار کی دوپہر تک برونس ہسپتال ہی میں رہا اور اس کے بعد یہ کہ کر گھر واپس آ گیا کہ اب وہ بالکل اچھا ہو چکا ہے۔ واپسی پر وہ بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ "بہت معمولی آپریشن تھا صاحب!" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "پیٹ میں کوئی فالتو چیز پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے کاٹ دیا ہے۔ اور اب تو مجھے بہت آرام ہے!" اس نے مجھے آپریشن کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

برونس کی واپسی سے ایک دن قبل میں نے ایک عجیب چیز دریافت کی۔ میرے مکان کی پشت پر ایک بڑا سا احاطہ ہے جس کا فرش پرانے انداز میں ٹائلیں لگا کر بنایا گیا ہے۔ داہنی جانب احاطے کی دیوار کے پاس ۲ یا ۳ فٹ خالی جگہ ہے۔ ایک قطار میں نوکروں کے تین کمرے ہیں۔ پہلا کمرہ برونس کا ہے۔ سٹیفن چونکہ شہر میں رہتا تھا اس لیے برونس کو یہاں اکیلا ہی رہنا پڑتا تھا۔ برونس کی واپسی سے ایک دن قبل میں اپنے احاطے کا جائزہ لے رہا تھا جہاں ابھی ابھی صفائی کی گئی تھی۔ نوکروں کے کمروں پر سفیدی بھی کی گئی تھی۔ اچانک میری نظر برونس کے کمرے اور احاطے کی دیوار کے درمیان والی خالی جگہ میں ایک چیز پر پڑی۔ وہ کسی بچے کا ٹوٹا ہوا کھلونا تھا یا شہد کی مکھیوں کا مصنوعی چھتہ۔ میں تجسس کے جذبے سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ بالکل افریقی طرز کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جس کی چھت جھاڑو کی تیلیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور ستونوں کے بجائے نوتھ برش کی ڈنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس گول جھونپڑی کا قطر اندازاً ۹ انچ اور زمین سے اونچائی تقریباً ۶ انچ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے باہر سے ہاتھ بڑھا کر اسے اندر پھینک دیا ہو۔ میں نے سوچا اسے اٹھا کر کوڑے کے ڈبے میں ڈال دوں۔ لیکن پھر مجھے برتن دھونے والی ملازمہ کے بچے کا خیال آ گیا۔ شاید یہ اسی کا کھلونا ہو۔ میں نے بچے کو حیران کرنے کے لیے کچھ سکے نکالے اور ہاتھ بڑھا کر اندر رکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ یہ سکے یہاں ڈال دوں۔ کل جب وہ بچہ آئے گا تو یہ سکے پا کر کتنا متعجب ہو گا۔ جونہی میں نے اس جھونپڑی کے اندر ہاتھ داخل کیا کوئی شے اندر کلبلائی اور مجھے اپنی انگلیوں پر چبھن کا تیز احساس ہوا۔ میں نے فوراً ہاتھ جھٹک کر باہر کھینچ لیا لیکن زخم کا کوئی نشان ہاتھ پر نہ تھا۔ شاید اندر کوئی چوہا تھا۔ میں نے وہاں سے ہٹتے ہوئے سوچا سٹیفن کو منع کر دوں گا کہ وہ اس بچے کو گندی چیزیں یہاں نہ رکھنے دیا کرے۔ سامنے ہی میرے دوست مسٹر لارکیر کی کار آتی نظر آئی۔ مسٹر لارکیر بڑے پُرلطف انسان ہیں۔ کافی دیر تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ چلتے چلتے مسز لارکیر مجھے اپنے یہاں کھانے پر مدعو کر گئیں۔ ان تمام باتوں میں میں اس جھونپڑی کو بالکل بھول گیا۔

جس دن برونس ہسپتال سے گھر واپس آیا اسی دن شام کو میں نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ہم لوگ گیلری میں بیٹھے تھے۔ کیونکہ یہ جگہ بڑی پُرفضا ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ زیادہ تر یہیں بیٹھا کرتا تھا۔ موسم بہار میں یہاں پروانے بکثرت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دن شام ہی سے سردی پڑنے لگی تھی۔ اس لیے ہم لوگوں نے سوچا کہ اب اندر چل کر بیٹھنا چاہیے۔ ابھی ہم اٹھے بھی نہ تھے کہ اچانک ایک خوفزدہ انسانی چیخ نے رات کا سناٹا مجروح کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آواز میری جانی پہچانی ہے۔ میں اور میرے دوست کارسویل اٹھ کر گیلری سے گزرتے ہوئے نوکروں کے کمرے کی طرف دوڑے۔ برونس کے کمرے کے دروازے سے ہلکی سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہم لوگ دروازے کو دھکا دے کر اندر گھس گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ چراغ ابھی ابھی جلایا گیا ہے۔ اس کی مدھم روشنی میں ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ برونس اپنے پلنگ پر ایک کونے میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کا تمام بستر ایک طرف لپٹا لپٹایا پڑا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی داہنی پنڈلی پر جمے ہوئے تھے اور ان کے درمیان سے خون کی ایک موٹی دھار نکل کر چادر سے ہوتی ہوئی فرش پر گر رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی وجہ سے ہوا اندر آنے لگی تھی۔ چراغ بھڑکنے لگا۔ کارسویل نے لیمپ کی بتی کو ٹھیک کیا اور کمرے کی کھڑکی کھول دی میں نے بڑھ کر برونس کو پشت سے پکڑ کر چت لٹا دیا اور اس کی



پنڈلی کے زخم کو چادر پھاڑ کر باندھ دیا۔ شاید اس بروقت امداد سے برونس کا دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا۔ اور اس نے ہانپنے والے ختم کر کے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "وہ..... وہ..... آپ نے اسے دیکھا تھا؟" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دی کیونکہ میں اس وقت اس کے زخموں کو دیکھ رہا تھا جن سے بہت سا خون نکل چکا تھا۔ میں نے کارسویل کو غسل خانے سے طبی امداد کا سامان نکال لانے کو کہا۔ برونس نے پھر مجھ سے پوچھا "صاحب آپ نے اسے دیکھا تھا؟"

"کس کو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت چھائی ہوئی تھی۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ "کیا ہوا برونس۔ کونسی چیز؟" میں نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

"جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔" برونس نے بمشکل بتایا۔

"کیا چیز تھی آخر؟" میں نے کچھ الجھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ اب بھی یہیں ہے؟" اس نے ایک بار چونک کر مجھے دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے زخم پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اور چادر اٹھا کر اسے اڑھا دی۔ کارسویل نے اندر آ کر سامان رکھ دیا۔ اور برونس کی طرف پُرتشویش نظروں سے دیکھنے لگا۔ "تم ذرا برانڈی کی بوتل بھی لے آؤ اس کی حالت بہت ابتر ہے۔" میں نے اسے پھر بھیج دیا۔ برونس کا تمام جسم لرز رہا تھا اور وہ شاید بڑبڑا بھی رہا تھا۔ "ڈر گیا ہے بےچارہ بری طرح!" کارسویل نے برانڈی کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے برانڈی کا گلاس لگایا ہی تھا کہ پلنگ کے نیچے سے کسی کے دانت کٹکٹانے کی آواز آئی اور آناً فاناً کوئی چھوٹا سا نیولے جتنا کالا جسم پلنگ کے نیچے سے نکلا اور پلک جھپکتے میں دروازے سے باہر نکل کر اندھیرے میں کھو گیا۔ کارسویل بغیر سوچے سمجھے کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ میں بھی برانڈی کا خالی گلاس پھینک کر کھڑکی سے باہر آ گیا۔ کارسویل فلیش لائٹ کی روشنی پھینکتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں وہ افریقی طرز کی جھونپڑی رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چیز یا تو اسی کے اندر چھپی ہوئی ہے یا اسے اتنی مہلت مل گئی کہ وہ اس چھوٹی سی دیوار کو پھلانگ کر باہر نکل گئی۔ "یہ کیا چیز ہے؟" کارسویل نے اس جھونپڑی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کسی بچے کا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں پہلی بار اسے دیکھ کر میں بھی یہی سمجھا تھا!" میں نے جواب دیا۔ کارسویل نے فلیش لائٹ کا دائرہ اس پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ چیز یہیں چھپی ہوتی ہے!" میں نے اس جھونپڑی کو اٹھا کر الٹ دیا۔ لیکن اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ مطلب صاف تھا۔ شکار ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ ہم واپس چلے گئے۔ میں نے برونس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ اس کے زخموں کے گرد باریک باریک دانتوں کے نشان تھے۔ ہم لوگ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھے پھر اس کی خواہش کے مطابق چراغ چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ دعوت کا سارا خوشگوار ماحول حادثے کی نذر ہو چکا تھا۔ خواتین کو گھر جانے کی جلدی تھی کارسویل اپنی کار میں مسز سپنسر کو لے گیا۔ اور میں مسز کوپر کو ان کے ہوٹل تک چھوڑنے ان کے ساتھ چلا گیا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے میں گھر واپس آیا۔ تمام راستہ میرے دماغ میں برونس کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ گھومتا رہا — میں نے اس حادثے کا سبب معلوم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنا پستول نکالا اور برونس کے پاس پہنچا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا — واپس آتے ہوئے اسے حفاظت کے لیے پستول دے آیا۔ دروازے میں رک کر میں نے اس سے اس چیز کے متعلق دریافت کیا "جو تمام کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود کمرے میں گھس گئی تھی۔" "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں!" برونس بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کمرے میں آنے سے پہلے ہی وہ چیز میرے کمرے میں چھپ گئی تھی اور اس کے بعد میں نے کمرے کے دروازے اندر سے بند کر لیے۔" برونس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اب بھی مجھے اس کھڑکی سے خوف معلوم ہوتا ہے۔" وہ کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

"نہیں اسے کھلا رہنے دو تمہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



میں نے کہا لیکن اسے پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ "نہیں صاحب۔ جو چیز ایک مرتبہ مجھ پر حملہ کر چکی ہے۔ میرے بچ جانے کی صورت میں دوبارہ ضرور حملہ کرے گی۔"

"بیوقوف مت بنو" میں نے کہا "اگر وہ ایک طاقتور نیولا ہو تب بھی اسے اس سپاٹ اور چکنی دیوار کو پھلانگنے میں کافی دقت ہو گی!" بروٹس کو میری بات سے شاید اتفاق نہ تھا۔ وہ مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ "نہ صاحب وہ نہ نیولا ہے نہ چوہا!"

"پھر تم اسے کیا سمجھتے ہو" میں نے پوچھا۔ "خدا بہتر جانتا ہے!" وہ تشویش سے سر ہلا کر رہ گیا۔ میں واپس آ گیا۔ لیکن ابھی آدھا صحن بھی طے نہ کر پایا تھا کہ مجھے ایسی غراہٹ سنائی دی جیسے دو چھوٹے جانور گوشت کے لیے آپس میں لڑ پڑے ہوں۔ جیسے ہی میں رکا، آواز بھی بند ہو گئی۔ غالباً ایک فریق شکست کھا چکا تھا۔ اس کے چند لمحے بعد پھر غراہٹ سنائی دی۔ اُف ... وہ آواز! میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ ہمت کر کے میں اس طرف بڑھا جہاں سے وہ آوازیں آ رہی تھیں۔ ماحول پر ایک سکوت سا طاری تھا لیکن ایسی مدھم آوازیں آ رہی تھیں، جیسے کوئی چوہے کی کسی چیز کو پھاڑ رہا ہو۔ میں پھر ٹھٹکا اور جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کر دی۔ اس گوشے میں جو نوکروں کے کمروں کے برابر تھا، ٹارچ کی روشنی پھیلنے لگی۔ روشنی کے مختصر واقفے میں کوئی چھوٹی کالی سی چیز صرف ایک لمحہ روشنی نظر آئی۔ پھر غائب ہو گئی۔ دوسرا فریق جو ایک موٹا تازہ چوہا تھا مرا پڑا تھا۔ اس کے کترے ہوئے نرخرے سے خون بہ رہا تھا۔ مجھے اچانک کچھ خیال آیا۔ میں مردہ چوہے کو لے کر بروٹس کے پاس آیا۔ "کیا خیال ہے بروٹس؟" میں نے مردہ چوہا اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی جانور ہو سکتا ہے جس نے تم پر حملہ کیا تھا؟ اگر یہ وہی ہے تو اسے اچھا بدلہ مل گیا!" مگر بروٹس نے کچھ مایوسی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ "نہیں صاحب وہ چوہا نہیں تھا۔ میرا تو خیال ہے۔ یہ چوہا بھی اسی کا شکار ہوا ہے۔ یہ زخم نہیں دیکھ رہے ہیں آپ؟" اس نے الٹا مجھ پر سوال جڑ دیا۔ میری تعبیر یقیناً زیادہ صحیح بھی تھی۔ میں نے چوہا پھینک کر اسے خدا حافظ کہا۔ اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

ابھی چار بھی نہ بجے ہوں گے کہ میں پستول کے فائر کی آواز سے اچانک گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ میں نیند بھری آنکھوں سے نہ ٹوکتا ہوا بروٹس کے کمرے تک پہنچا "کیا ہوا؟ مل گیا؟"

"ہاں صاحب" بروٹس نے کہا۔ "اب تو وہ ضرور ہی پکڑا جائے گا۔ آپ کھڑکی میں دیکھیں وہاں اس کا خون پڑا ہوگا!" میں نے دیکھا تو واقعی وہاں خون کا ایک بڑا دھبہ موجود تھا۔ بروٹس کی چلائی ہوئی ساتوں گولیوں میں سے ایک تو اسے ضرور ہی لگ گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں حملہ آور کا کوئی نشان نہ تھا۔ میں نے فلیش لائٹ روشن کر کے جائزہ لیا۔ بیرونی دیوار پر بھی کسی قسم کا نشان نہ تھا۔ اچانک کوئی ہلکی اور نازک سی چیز میری پیشانی سے ٹکرائی۔ میں نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ لاحول ولاقوۃ! اپنے تجسس اور گڑبڑ میں اسے نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ وہ بیل کی ایک لٹکی ہوئی شاخ تھی جو کھڑکی میں جھک آئی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر جھٹکا دیا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اوپر کسی چیز سے بندھی ہوئی ہے۔ میں نے کرسی پر چڑھ کر اوپر جھانکا تو پتہ چلا اوپر کا سرا پانی کے پائپ سے بندھا ہوا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حملہ آور اپنے حملے کو کامیاب بنانے کے لیے ...... طریقے استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ دوسری طرف بروٹس اپنے کارنامے پر اس قدر خوش تھا کہ حادثے کی تفصیلات بکنے کے لیے اسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ ایک بڑے مینڈک سے مشابہ کسی چیز کو کھڑکی پر بیٹھا دیکھ کر اس نے گولی چلا دی۔ بس اس سے میں اتنا ہی معلوم کر سکا۔ میرے دل میں اس چیز کو دیکھنے کی زبردست خواہش پیدا ہو چکی تھی۔ جو ایک بڑے مینڈک جتنی تھی لیکن جس نے ایک موٹے تازے چوہے کا نرخرہ چبا دیا اور جس کا دماغ بالکل انسانوں کی طرح کام کرتا تھا۔ بیل کو باندھنا اور اس کے ذریعے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کسی جانور کی عقل سے بالکل بعید تھی۔ میں نے کھڑکی پر پڑا خون اٹھا کر محفوظ کر لیا۔ اور ڈاکٹر براؤن کے پاس دوسرے ہی دن



ٹیسٹ کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ دوپہر ہی کو ڈاکٹر نے مجھے فون کیا۔ اس کی آواز سے حیرت صاف مترشح تھی "یہ خون کا قطرہ تم نے کہاں سے لیا تھا؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ بولا "مجھے پتہ ہے تم یہی کہو گے کہ یہ کسی چھوٹے سے جانور کا خون ہے!"

"کیوں کوئی خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا

"ہے بھی۔ اور نہیں بھی!" وہ الفاظ چباتے ہوئے بولا "تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ خون انسانی ہے۔ اور وہ بھی افریقی حبشی کا!" میں نے بڑی مشکل سے اس ذہنی جھٹکے کو برداشت کیا اور ریسیور رکھ دیا۔ واقعات نے ایک پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ ایک انسانی ذہن کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یا پھر اتفاقات کا ایسا خاکہ جس میں بروٹس نے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے۔ لیکن وہ خون کا دھبہ کہاں سے آیا۔ بروٹس کے پیر پر پٹی موجود تھی۔ اور بروٹس نے اس چیز پر فائر بھی کیا تھا جس کا گواہ میں خود تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کی یہ انوکھی رپورٹ .... تو پھر .... پھر یہ سب کیا تھا۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔

دوسری صبح بروٹس ہلکا سا لنگڑاتا اپنے گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گیا۔ میں نے اس سے پھر رات والی واردات کے متعلق پوچھنا چاہا! تو اس نے وہی کہانی لفظ بہ لفظ دہرا دی۔ اتنے میں شیفن مجھ سے ملنے آیا۔ دن بھر وہ یہیں رہا۔ بروٹس کے معاملے پر وہ بہت متعجب تھا۔ رات کو میں نے اس سے کہا کہ وہ بروٹس کے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آیا۔ "میں نے سارا کمرہ چھان مارا صاحب!" اس نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "وہاں کوئی جانور وغیرہ چھپا ہوا نہیں ہے۔ بروٹس سو گیا تھا۔ اس لیے میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔" میں پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ رات کو دو بجے کسی کے پکارنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے غور کیا تو یہ آواز بروٹس کی تھی جو میری کھڑکی کے نیچے صحن میں کھڑا مجھے پکار رہا تھا۔ میں نیچے پہنچا تو وہ اپنے ہاتھوں سے دایاں گال دبائے کھڑا تھا۔ مدہم چاندنی میں بھی اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا اور وہاں خون آلود نظر آ رہا تھا۔ میں نے غسل خانے میں لے جا کر اس کے زخم کی مرہم پٹی کی۔ صرف تین گہرے یکساں سوراخ تھے "اب وہ کہاں سے آیا بروٹس؟" میں نے اسے اس کے کمرے تک لے جاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ شاید پہلے سے کمرے میں موجود تھا ....!" اس کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ بے چارہ خوف سے اس کا بُرا حال تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا لیمپ تک نہیں جلایا تھا۔ چاند کی مدہم روشنی ہی میں اس نے اسے اپنی پائنتی کی طرف غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اور پھر زخم دبائے مجھے خبر کرنے آ گیا تھا۔ میں نے اس کا لیمپ جلایا اور تمام کمرہ پھر چھان مارا۔ مختصر سے سامان کے درمیان کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ چھپ سکتا۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ پھر چراغ مدہم کر کے واپس آ گیا۔ صبح بروٹس دیر تک سوتا رہا۔ نو بجے کے قریب شیفن ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا مجھے دیکھتے ہی چیخ کر بولا۔ "صاحب وہ بروٹس وہاں بے ہوش پڑا ہے۔ اس کے شانے پر بہت گہرا زخم آیا ہے۔ سارا بستر خون میں بھرا ہوا ہے!" ایک لمحے کے لیے میں بھی بوکھلا گیا۔ ڈاکٹر کو فون کر کے میں بروٹس کے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد بروٹس کو ہوش آیا لیکن مارے نقاہت کے اس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ اس کے بستر کے قریب زمین پر ایک درمیانے درجے کا جیبی چاقو پڑا تھا جس کا پھل دستے تک خون میں لت پت تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے فوراً بروٹس کے جسم میں خون پہنچانے کا بندوبست کیا اور کچھ مقوی مشروبات پینے کے بعد بروٹس اس قابل ہوا کہ کچھ بتا سکے۔ "آپ کے جانے کے فوراً بعد مجھے نیند آ گئی تھی" بروٹس نے کہنا شروع کیا "مگر میری آنکھ ڈھول کی آواز سے اچانک کھل گئی۔ یہ ڈھول پہاڑی پر بسنے والے حبشی اپنا کوئی جادو کا عمل پورا کرنے کے لیے بجا رہے تھے۔ اچانک میری نظر اپنے پلنگ کے پہلو والی جگہ پر پڑی۔ وہاں وہی چیز اس ڈھول کی تال پر ناچ رہی تھی"

"ناچ رہی تھی؟" میں نے حیرت سے اس کا جملہ دہرایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"ہاں صاحب! اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ صندوقوں کے نیچے سے نکل آئی تھی۔"

"اچھا!" میں نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ اس کمرے کی تلاشی لیتے ہوئے ہم اس جگہ کو بھول گئے تھے۔ اس کے علاوہ بروتس نے کچھ اور بتانے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ بروتس اس چیز کے متعلق بہت اچھی طرح جانتا ہے لیکن بتانا نہیں چاہتا۔ میں بھی اصرار بے سود سمجھ کر خاموش ہو گیا کیونکہ ویسٹ انڈین حبشی جب کسی بات کا تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر اس پر اڑے رہتے ہیں۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

رات کو سٹیفن نے اپنا بستر بروتس کے کمرے ہی میں لگا لیا۔ اور میں نے وہاں تک بجلی کا بندوبست بھی کر دیا۔ سونے سے پہلے مجھے سٹیفن نے وہ ہتھیار بھی لا کر دکھایا جس سے بروتس کے گال زخمی کیے گئے تھے۔ یہ ایک شیشے کا تیز دھار والا افریقی طرز کا نیزہ تھا۔ سٹیفن نے بتایا کہ یہ چیز اسے بروتس کے کمرے کے پاس ہی صحن سے ملی ہے۔ میرا ذہن بہت سی باتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس معاملے پر میں جتنا غور کر رہا تھا یہ اسی قدر الجھ رہا تھا۔ وہ کیا چیز ہے جو بروتس پر بار بار حملے کر رہی تھی۔ بروتس کے کہنے کے مطابق وہ ایک بڑے مینڈک سے مشابہ ہے۔ لیکن اس کی حرکتیں کسی چھوٹے جانور جیسی نہیں تھیں۔ جس کے ثبوت میں بیل باندھنا، نیزہ استعمال کرنا اور چاقو سے حملہ کرنا وغیرہ باتیں موجود تھیں۔ یہ تمام کام تو سراسر انسانی عقل کو کارفرما معلوم ہوتے تھے۔ اور پھر وہ خون کا قطرہ اور ڈاکٹر کی رپورٹ! کیا یہ ممکن نہیں کہ بروتس نے خود وہ خون وہاں ڈال دیا ہو اور اس کے بعد فائر کیے ہوں۔ مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ کس کی سازش ہے جس میں خود اس کی جان خطرے میں پڑ چکی تھی۔ میں ان متضاد اور محیر العقول واقعات کے جال میں الجھتا ہی چلا گیا۔ میرے لیے اب ایک ہی راستہ تھا۔ کسی صورت بروتس کا خون ٹسٹ کروانے کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کروں۔ بروتس کا خون لینا بیکار تھا۔ اس میں دوسرے خون مل چکے تھے۔ میں نے سٹیفن سے وہ چادر منگوائی جو حادثے کی رات کو بروتس کے خون میں لت پت ہو گئی تھی۔ اس کا معائنہ کر کے ڈاکٹر نے بتایا کہ اس خون اور پہلے والے خون میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ایک جسم سے دونوں مرتبہ خون نکالا گیا ہے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ لیکن دوسری طرف اس نتیجے سے دوسرے واقعات بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ افریقی طرز کی جھونپڑی بروتس کے ہسپتال سے آنے سے قبل ہی گھر میں موجود تھی۔ وہ بیل جو کمرے میں بندھی ہوئی تھی۔ اور وہ چاقو! یہ واقعات تو میری نظروں کے سامنے ہی ہوئے تھے۔ بروتس کہاں ... صرف ایک نکتہ جو مجھے سٹیفن کے ذریعے ... ہوا ... تکلیف کے عالم میں رات کو ہذیان بکتے ہوئے بروتس نے کئی مرتبہ ——— کیسیس کا نام لیا تھا۔ یہ اور اچنبھے کی بات تھی۔ بھلا اس نے کب شیکسپیر کے ڈرامے پڑھے ہوں گے جو اسے بروتس کی مناسبت سے کیسیس یاد آ رہا تھا۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نام اس کی زندگی کے کسی دور میں اس کے ساتھ رہا ہو۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کس سے اس گتھی کے بارے میں گفتگو کروں۔ دراصل مجھے ڈاکٹر پلیٹر کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا وسیع مطالعہ ضرور میری گتھی کو سلجھانے میں مدد دے گا۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب میں ڈاکٹر پلیٹر کو اپنے ساتھ بندرگاہ سے لے کر اس کے گھر پہنچا۔ راستے ہی میں میں نے ڈاکٹر کو تمام کہانی سنا دی۔ اختتام پر وہ بڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "اس کے متعلق میرے اسسٹنٹ ڈاکٹر ... نے مجھے ایک عجیب بات بتائی تھی۔"

"اچھا!" میں چونک پڑا۔

"ہاں اس نے رپورٹ ... کہا تھا کہ وہ جسم کا ایک ... زائد حصہ تھا جس کا ... آپریشن کیا تھا۔ آپریشن کے بعد جب میں نے اس چیز کو دیکھنا چاہا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔" ڈاکٹر کچھ دیر کے لیے ... "کیا تم یہ سوچ سکتے ہو کہ وہ ابھی زندہ ہے؟" "نہیں" ایک لخت میرے منہ سے نکلا۔ چند لمحوں کے لیے میں خالی الذہن ہو گیا۔ "میں تصور بھی نہیں کر سکتا!" ڈاکٹر مسکرا دیا۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ بروتس پر حملہ کرنے والی



چیز کتنی بڑی تھی؟" میں اس کے اس بے جوڑ سوال پر غور کرتے ہوئے بولا۔ "ایک بہت بڑے چوہے کے سائز کی! اور رنگ بالکل سیاہ!"

"ہوں!" ڈاکٹر نے پُر خیال انداز میں سر ہلا کر رہا پھر ایک دم اس نے باتوں کا رخ موڑ دیا۔ "اچھا چلو تمہارے گھر چل کر تفصیلی بات کریں گے۔"

گھر آتے ہی ہم پہلے بروتس کے کمرے میں گئے۔ ڈاکٹر نے اس کے زخموں کا جائزہ لیا۔ اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے اسے وہ جگہ بھی بتائی جہاں وہ چیز چھپ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس گیلری میں جھانکا۔ دیوار اور اس افریقی جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی پر تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ایک دم میری طرف مڑ کر بولا۔ "تم نے اس چیز کو یقیناً اس جھونپڑی میں تلاش کیا ہو گا۔" "ظاہر ہے!" میں نے جواب دیا۔ "اور تمہیں مایوسی ہوئی ہو گی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "جی ہاں!" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ "اب سنو جو نتیجہ میں نے اخذ کیا ہے۔" ڈاکٹر نے میری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ میں کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "اچھا یہ بتاؤ تم جڑواں بچوں کے متعلق کیا جانتے ہو؟" ڈاکٹر نے ایک غیر متعلق سوال کر دیا۔ "اتنا ہی جتنا دنیا کے دوسرے لوگ جانتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ ڈاکٹر ہنس پڑا اور "غالباً تم یہ نہیں جانتے کہ جڑواں بچوں کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ قسم جو عام طور پر نظر آتی ہے۔ یعنی دو بچے جو الگ الگ جسم رکھتے ہیں۔ دوسری وہ قسم جس میں بچے آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں آپریشن کے ذریعے علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کو Dizygotic کہا جاتا ہے۔ ایک صورت ایسی بھی ہو جاتی ہے کہ ایک بچہ دوسرے بچے کے جسم میں اس طرح سما جاتا ہے کہ اس کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی قدرت میں کس کو دخل ہے ..." ڈاکٹر کچھ دیر کو رکا۔ "لیکن اس کا تعلق بروتس کے معاملے سے کیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہی تو میں بتا رہا ہوں۔" ڈاکٹر میری بے چینی کو بھانپ گیا۔ "جو چیز میں نے بروتس کے جسم سے آپریشن کے ذریعے کاٹ دی تھی وہ اسی Di_ygotic قسم کا بچہ تھا۔" میں ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو گئی۔ "اچھا اب تم اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کی کڑیاں ملاؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اپنے پہلے حملے کے بعد تمہیں وہ چیز اپنی جھونپڑی میں نہیں ملی تھی! ہے نا؟"

"ہاں" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ میرے دماغ میں کیسیس کا نام اور خون کا تجزیہ دونوں چیزیں ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ "اس سے ایک کلیہ سامنے آتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔

"وہ چیز انتہائی ذہین ہے۔ تم لوگوں کے تلاشی لینے کے بعد وہ اپنے گھر واپس آ جاتی تھی۔" میں احمقوں سے سر ہلا کر رہ گیا۔ "اب پہلے حملے کے زخموں پر غور کرو۔ وہ نشان یا تو صرف بندر کے ہو سکتے ہیں۔ یا پھر ایک بعید از قیاس جسامت کے چھوٹے سے انسان کے!" کمرے میں ایک سکوت طاری ہو گیا۔ بہت سوچ کر میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اچھا زیادہ تفصیل میں جانے سے پہلے اس کا رنگ دیکھو۔" ڈاکٹر نے نیچے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "اس کے سیاہ رنگ سے تم ایک نکتے پر پہنچ سکتے ہو۔ حیاتیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو دو مختلف النسل والدین کا بچہ ان میں سے جو زیادہ سیاہ فام ہو گا۔ اس کے رنگ سے کچھ بہتر رنگ کا ہو گا۔ اس سے زیادہ کالا نہیں ہو گا!" ڈاکٹر رک کر سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔ "میرے نظریے کے مطابق ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے بروتس کے والدین میں سے ایک فرد بہت کالا اور دوسرا بہت گورے رنگ کا تھا۔ بروتس کا رنگ تم دیکھ رہے ہو۔ عام حبشیوں سے کتنا صاف ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" مجھے اعتراف کرنا پڑا۔ "اب میری تمہید تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی اگر وہ بچے پہلی قسم کے ہوتے تو ان کی رنگت بھی یکساں ہوتی۔ لیکن وہ دوسرا جسم تمہارے کہنے کے مطابق بالکل سیاہ ہے۔"

"بے شک!" میں نے کہا۔ "ہاں دیکھو اس کی چند خاص وجوہات ہیں جن کی بنا پر وہ نشوونما پا کر دوسرے بچے کے جسم میں ضم ہو گیا۔" ڈاکٹر نے بڑی روانی سے کہا۔ "دراصل شکم مادر میں پرورش پانے کے دوران ہی وہ غدود جو بچے کی نشوونما میں حصہ لیتے ہیں، اگر اپنا کام مقررہ مدت سے پہلے ہی ختم کر دیں تو بچہ ٹھٹھر کر رہ جاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

[illegible] بروڈس کے معاملے میں یقیناً یہی ہوا ہے چونکہ دونوں بچے [illegible] جڑے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ غذا جو بچے کے لیے فراہم [illegible] تمام کی تمام ایک ہی بچہ ہتھیا لیتا تھا۔ اور دوسرا بچہ غذا نہ ملنے [illegible] میں اس قدر کمزور ہو گیا کہ طاقتور بچہ اس [illegible] پر بڑی [illegible] یہاں تک کہ وہ ایک فالتو شے [illegible] اس کے [illegible] بروڈس [illegible] اس پر ایک قوما سی کیفیت طاری تھی۔ اس میں زندگی تو تھی لیکن [illegible] اور یہ کیفیت اس وقت ختم ہو گئی جب میں نے اس کا آپریشن کیا تھا۔" یقین اور بے یقینی کے ہنڈولے میں جھولتے جھولتے میرا سر چکرانے لگا تھا۔ سٹیفن کے بلانے پر ہم کھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھانا کھاتے ہوئے ڈاکٹر نے سٹیفن سے بروڈس کے والد کے متعلق پوچھا۔ "وہ ایک یورپین انجینئر تھا صاحب۔" سٹیفن نے جواب دیا۔ "اس کی ماں؟" "وہ انیٹی گویا کی رہنے والی ایک حبشی نژاد ہے۔ بروڈس اسے اب بھی پیسے بھیجتا ہے۔" کھانے کے بعد ہم باتیں کرتے ہوئے گھوم پھر کر اسی موضوع پر آ گئے۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ وہ بروڈس سے انتقام لینا چاہتا ہے۔" ڈاکٹر مجھے پھر ذہنی قلابازیاں کھلانے لگا۔ "لیکن اس کا حملہ ہر بار اسی لیے ناکام ہو جاتا ہے کہ وہ جسامت میں چھوٹا اور کمزور ہے۔ اس کے دل میں اپنے بھائی کے خلاف غم و غصہ بھرا ہوا ہے۔ اس نے اپنی ماں سے خاص افریقی جبلت پائی تھی، جس کا ثبوت اس کا افریقی طرز کا گھر ہے۔ جب تک وہ دوسرے جسم میں سویا ہوا تھا وہ بے خبر تھا لیکن جب وہ اس جسم سے علیحدہ ہوا تو اس کی سرشت میں ایک شدید نفرت اس جسم کے خلاف پیدا ہو چکی تھی جس نے اسے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اس نے باہر آتے ہی پہلا کام جو کیا وہ اس ظالم [illegible] سے دور [illegible] تھا۔" میں نے ایک جھرجھری لی "اور اب... اب تو اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ انسان ہے تو اسے [illegible] ہونے کی حیثیت سے [illegible] ہے۔"

دوسرے [illegible] میں اسے پکڑنے کی نیت سے مچھلی پکڑنے والا جال لے کر اس گیلری کی طرف آیا جہاں وہ افریقی طرز کی جھونپڑی رکھی ہوئی تھی۔ ابھی میں سیڑھیاں اتر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے صحن سے کسی بچے کے چیخنے کی آواز اور ساتھ ہی ایک تیز غراہٹ سنائی دی۔ میں چونک پڑا اور ابھی کچھ سوچنے سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ بچے کے ساتھ دو تین عورتوں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں بدحواسی میں چار چار سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا۔ صحن کا منظر مجھے حیران کرنے کو کافی تھا۔ [illegible] کا بچہ آگے بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے وہی چیز جو ایک [illegible] سے مشابہ اور بالکل سیاہ رنگت کی تھی، چاروں ہاتھوں پیروں پر دوڑ رہی تھی۔ اس کے سفید تیز دانت آری کے دانتوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ اور حلق سے اس طرح غراہٹ نکل رہی تھی جیسے وہ بے حد غصے میں ہو۔ معلوم ہوا کہ بچے نے کھیلتے ہوئے اس افریقی جھونپڑی کو الٹ دیا تھا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا۔ بچہ بھاگتے بھاگتے باورچی خانے میں گھس گیا۔ اور برتن رکھنے والے شیلف پر چڑھ گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں گھس گئی۔ اسے پکڑنے کا یہی بہترین وقت تھا۔ میں بھی جال لیے اس کے پیچھے لپکا۔ [illegible] میں باورچی خانے میں داخل ہوا ہی تھا کہ الماری پر بیٹھی ہوئی اس بچے کی پالتو بلی جو اس چیخ و پکار سے ہوشیار ہو کر الماری کے اوپر سے جھانک رہی تھی اپنے چاروں ہاتھ پیر جوڑ کر اس شے پر کود پڑی، اور کودتے ہی اس کے حلق میں اپنے دانت پیوست کر دیئے۔ سرخ... سرخ خون اس کی گردن سے ابل پڑا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل کانپ گیا۔ آخر کچھ بھی ہو، پیدائشی طور پر وہ ایک انسان تھا اور اس نے ایک انسان کے جسم سے جنم لیا تھا۔ میں نے بلی کو [illegible] کر ایک طرف ہٹایا، اور دوڑ کر اس کے قریب آ گیا [illegible]... میں نے ایک لمبی جھرجھری لی۔ ایک انسان کا یہ انجام! میں نے اس مظلوم کی لاش کو اٹھا لیا جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی قدرت کی ناانصافی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے گھر کے پاس ہی گڑھا کھود کر میں نے اس کی آخری آرام گاہ بنا دی۔



ایک خوفناک اور دہشت انگیز کہانی

# بھیانک خواہش

ڈبلیو ڈبلیو جیکبس

رات یخ بستہ تھی۔ گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ بڑے کمرے میں آتشدان دہک رہا تھا اور باپ بیٹا آمنے سامنے بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ مسٹر وائیٹ کے بال سپید ہو چکے تھے اور اس کی بیوی مسز وائیٹ کا سر بھی کھچڑی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر اور بیٹے کے کھیل سے لاتعلق آگ کے سامنے بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ وائیٹ نے پیادے کو آگے بڑھایا۔ ہربرٹ جیسے اسی چال کا منتظر تھا۔ اس نے مہرہ آگے کر کے باپ کو شہ مات دے دی۔

"لو ڈیڈی میں یہ بازی بھی ہار گیا۔"

"ہمت نہ ہارو، تیسری بازی کھیلو۔"

بوڑھا وائیٹ شطرنج پر مہروں کو ترتیب دے رہا تھا کہ باہر کا بڑا گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

"لو... وہ بھی آ گیا۔" وائیٹ نے مہرے رکھ دیئے اور آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ مسز وائیٹ نے قدرے دلچسپی کے ساتھ اجنبی کو دیکھا۔ وہ ایک لانبے قد کا چیاں سی آنکھوں والا لاامتحم آدمی تھا۔

"سارجنٹ میجر موریس..." وائیٹ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ایک دوسرے کے درمیان ہیلو ہیلو کا تبادلہ ہوا اور موریس کرسی گھسیٹ کر آتشدان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وائیٹ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "اکیس سال پہلے جب تم ہندوستان گئے تھے تو تم ایک دبلے پتلے نوجوان تھے۔ مگر اب دیکھو تو..."

موریس ہنسنے لگا۔

"ہندوستان؟... تو آپ اکیس سال تک ہندوستان میں رہے؟" ہربرٹ نے پوچھا۔

"ہاں..." موریس نے جواب دیا۔

"میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں ہندوستان جاؤں۔" ہربرٹ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



نے اپنی خواہش کا اظہار کیا "سادھوؤں، جوگیوں اور فقیروں کے دیس میں..."

مورلیس چپ رہا۔ وائٹ نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "مورلیس کل تم بندر کے ایک پنجے کا ذکر کر رہے تھے، میں دھیان سے سن نہ سکا..... کیا بات تھی.....؟"

"کچھ نہیں... کچھ نہیں" مورلیس پریشان نظر آنے لگا۔

"بندر کا پنجہ؟" مسز وائٹ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں... بندر کا پنجہ... جس کے ساتھ جادو اور طلسم کی ایک حیرتناک داستان وابستہ ہے۔"

"جادو... طلسم... اونہہ... کیا بات ہے!" رچرڈ نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

مورلیس نے رچرڈ کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے بندر کا حنوط کیا ہوا پنجہ نکال کر اپنے سامعین کے سامنے کرتے ہوئے بولا.... "یہ بندر کا حنوط کیا ہوا پنجہ ہے... مگر..."

"تم نے یہ کہاں سے لیا؟"

"ہندوستان میں ایک جوگی سے لیا تھا۔ وہ عجیب و غریب آدمی تھا۔ جٹا دھاری... گندہ اور غلیظ... مگر لوگ اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ یہ پنجہ اس نے مجھے دیا تھا۔ اس پنجے کی بدولت تین آدمی، اپنی تین خواہشوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ اب تک دو آدمی اس پنجے کو آزما چکے ہیں... یہ معمولی پنجہ نہیں ہے..."

وائٹ... رچرڈ اور مسز وائٹ بڑی توجہ سے اس کی داستان سن رہے تھے۔

"کیا واقعی بندر کے اس پنجے کی وجہ سے تمہاری خواہشیں پوری ہو گئی تھیں؟"

"ہاں... مگر صرف تین خواہشیں... یہ شرط ہے۔"

بوڑھا وائٹ للچائی ہوئی نظروں سے بندر کے پنجے کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حرص کے شعلوں کی چمک آتشدان کے شعلوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "اب تمہارے لیے تو یہ بیکار ہو چکا ہے... تم اپنی تین خواہشیں پوری کر چکے ہو گے —— اب آخری بار —— یہ پنجہ کسی کی تین خواہشیں پوری کرنے کے بعد بے کار ہو جائے گا... ہے نا؟... تم نے ایسے ہی بتایا تھا نا؟"

"ہاں..." مورلیس نے جواب دیا۔

"پھر تم اسے اپنے ساتھ کیوں لیے لیے پھرتے ہو؟"

"جانے کیوں؟"... مورلیس نے جواب دیا "میں نے سوچا تھا کہ اسے بیچ دوں گا، مگر لوگ بندر کے اس پنجہ کے کرشموں پر یقین نہیں کرتے۔ اس لیے کوئی شخص اسے خریدنے کے لیے تیار نہ ہوا اور جو لوگ تیار ہوئے انہوں نے یہ شرط عائد کی کہ پہلے وہ بندر کے اس پنجے کو آزمائیں گے اور اس کے بعد اس کی قیمت ادا کریں گے۔"

"لیکن تمہارے لیے تو یہ بے کار ہو چکا ہے" وائٹ نے کہا۔

"ہاں..."

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ مورلیس کی نظریں ان شعلوں پر گڑی تھیں اور وائٹ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بندر کے پنجے کو گھور رہا تھا۔ ایک دم.... مورلیس کے چہرے پر تنفر اور دہشت کے ملے جلے اثرات نظر آئے اور اس نے بندر کے پنجے والا ہاتھ آگے کر کے پنجے کو آگ میں پھینکنے کی کوشش کی۔ وائٹ نے اچھل کر پنجہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور چلا کر بولا "کیا کرتے ہو؟"

"کاش تم اسے جل جانے دیتے..." مورلیس نے اداس



لہجے میں کہا۔

"اگر تم اسے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے تو مجھے دے دو" وائٹ نے دل کی بات کہہ ہی دی۔

"میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں، میرے لیے یہ بیکار ہے" مورلیس نے کہا "یاد رکھو اگر اس کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو اس کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا مجھے نہ کوسنا۔"

"مجھے منظور ہے" وائٹ کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔

"وائٹ، تم میرے دوست ہو، میرا مشورہ مانو، اسے آگ میں پھینک دو۔"

"نہیں..." وائٹ نے کہا "اب یہ میرے پاس رہے گا... مگر... اس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے؟"

"اسے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر بلند آواز سے اپنی خواہش کا اظہار کرو" مورلیس نے کہا "مگر تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

"مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں الف لیلے کی کوئی طلسمی کہانی پڑھ رہی ہوں" مسز وائٹ نے حیرت زدہ سا ہو کے کہا۔

رات گذرتی جا رہی تھی۔ یہ لوگ بدستور بیٹھے اشتیاق سے باتیں کر رہے تھے۔ بندر کا پنجہ اب وائٹ کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ رچرڈ نے محسوس کیا جیسے اب اس کمرے کی فضا پہلے جیسی نہیں رہی۔ اسے بوجھل پن کا عجیب سا، ناقابل فہم اور ناقابل اظہار احساس ہو رہا تھا۔ ان کا مہمان، مورلیس اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا —— "وائٹ، اب مجھے اجازت دو۔ میں کل ہندوستان چلا جاؤں گا۔ خدا کرے تم خوش و خرم رہو اور میرا اب بھی یہی مشورہ ہے کہ اسے تلف کر دو... جلا دو... اپنے پاس مت رکھو۔"

وائٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے بوڑھے دوست کا ہاتھ دبایا اور اس کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جب وہ واپس آیا تو اکیلا تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی، آنکھوں میں بے تابی اور بے چینی تھی۔ رچرڈ اور مسز وائٹ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر کہنے لگا "اب میں اپنی پہلی خواہش کا اظہار کرنے والا ہوں۔"

رچرڈ پرے جا بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور بے قاعدہ ہو چلی تھیں۔ مسز وائٹ نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا لیا۔ وائٹ نے جیب سے بندر کا پنجہ نکالا۔ اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اپنی نظریں اس پر گاڑھ دیں اور کانپتی ہوئی بلند آواز میں کہا "میری پہلی خواہش یہ ہے کہ مجھے دو سو پونڈ مل جائیں۔"

الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھی اور اس کی طرف بھاگی... رچرڈ نے اپنے باپ کے سُن اور جامد جسم کو ہلاتے ہوئے پوچھا "ڈیڈی کیا ہوا؟"

"یہ چل رہا تھا..." اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "بندر کا پنجہ حرکت کر رہا تھا..." بندر کا پنجہ فرش پر پڑا تھا۔ "جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس میں جان پڑ گئی یہ میرے ہاتھ میں یوں سرسرانے لگا جیسے سانپ ہو..."

"مگر تمہاری خواہش کب پوری ہو گی؟ مجھے تو کہیں دو سو پونڈ نظر نہیں آ رہے؟" رچرڈ نے کہا "بندر کا مردہ پنجہ کس طرح حرکت کر سکتا ہے؟ یہ آپ کا وہم تھا... وہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔"

"ہاں... ہاں... یہ تمہارا وہم ہو گا" مسز وائٹ نے کہا۔

"میں کیسے مان لوں کہ یہ میرا وہم تھا؟"... وائٹ نے چڑ کر کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



رچرڈ نے اپنے باپ کو آتشدان کے سامنے کرسی پر بٹھا دیا۔ آگ دہک رہی تھی۔ وائیٹ نے بیٹھنے سے پہلے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بندر کا پنجہ فرش سے اٹھایا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا چہرہ زرد اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ باہر ہوا تیزی سے چلنے لگی تھی اور دروازوں اور کھڑکیوں سے ٹکرا کر خوفناک سا شور پیدا کر رہی تھی۔ اس کے شور میں دہشت تھی۔ وہ تینوں چپ چاپ آگ کی طرف منہ کیے بیٹھے رہے۔

اس خوفناک رات کی صبح چمکیلی اور روشن تھی۔ مطلع صاف ہو چکا تھا۔ ناشتے کی میز پر رچرڈ رات کے واقعے کا مذاق اڑاتا رہا۔ مگر وائیٹ ابھی تک زرد نظر آ رہا تھا۔ مسز وائیٹ نے بھی اپنے شوہر کے مزاج کو خوشگوار بنانے کے لیے چند شگفتہ جملے کہے مگر وائیٹ چپ بیٹھا رہا۔ رچرڈ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کارخانے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے باپ سے کہا "ڈیڈی اگر آپ کی خواہش میری عدم موجودگی میں پوری ہو گئی تو میرا انتظار کر کے پیسے خرچ کرنا۔"

مسز وائیٹ نے حسب معمول رچرڈ کے ماتھے کو چوما اور اسے دیر تک گھر سے نکلتے اور سڑک پر چلتے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اپنے کام کاج میں الجھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ دوبارہ وائیٹ کے کمرے میں آئی تو وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی نظریں اپنے گھر کے بڑے گیٹ پر جم گئیں۔ ایک آدمی داخل ہو رہا تھا۔ اجنبی کا قیمتی لباس بڑی خوش اسلوبی سے سلا ہوا تھا۔ مسز وائیٹ دروازے کی طرف گئی۔ اجنبی کا استقبال کیا اور اسے اپنے شوہر کے پاس لے آئی۔ اجنبی کی نظریں کمرے کی چیزوں کو گھورتی ہوئی وائیٹ کے چہرے پر جم گئیں۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے ملوں۔ میں آپ کے بیٹے کے کارخانے سے آیا ہوں.... میرا مطلب ہے جہاں وہ کام کرتا ہے۔"

بوڑھی مسز وائیٹ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ گھبرا کر بولی "خیریت تو ہے نا؟ رچرڈ تو ٹھیک ہے نا؟"

وائیٹ نے اپنی سفید بھنوؤں کو اوپر اٹھا کر اجنبی سے کہا "تشریف رکھیے.... بیٹھ کر بات کیجیے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں...." اجنبی نے غمزدہ لہجے میں کہا اور چپ ہو گیا۔

"کیا رچرڈ زخمی ہو گیا ہے؟ کیا اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟"

"ہاں.... وہ بری طرح زخمی ہوا ہے.... مگر اب اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"اوہ.... میرے خدا.... تیرا احسان.... تیرا شکر" مسز وائیٹ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ مگر اس کی نظریں اجنبی کے چہرے پر پڑیں۔

اجنبی نے ٹھنڈے اور خشک لہجے میں کہا "وہ مشین میں پھنس کر کچلا جا چکا ہے۔"

"مشین میں پھنس گیا؟...." مسز وائیٹ لرزنے لگی۔ وائیٹ نے جلدی سے اسے تھام لیا "صبر کرو.... صبر.... خدا کو یہی منظور تھا...." پھر نظریں اٹھا کر اجنبی سے کہا "رچرڈ.... ہم دونوں بوڑھوں کی اکلوتی اولاد تھی ہمارے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہے۔"

اجنبی ہلکے سے کھنکارا اور کہنے لگا۔ "مجھے کارخانے کے مالکان کی طرف سے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ تک ان کے جذبات پہنچا دوں۔ ہم سب کو رچرڈ کی موت پر بہت دکھ ہوا۔" دونوں بوڑھے چپ رہے۔ بوڑھی عورت کا چہرہ سپید، جسم میں رعشہ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔



وائیٹ کا سپید سر ہل رہا تھا جیسے کہ رہا ہو خدا کی مرضی.... خدا کی مرضی!

"اس حادثے کی تمام ذمہ داری متوفی پر عائد ہوتی ہے" اجنبی نے کہا۔ "اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ اس کے باوجود کارخانے کے مالکوں نے اس کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کے لیے کچھ رقم بھیجی ہے...."

وائیٹ نے اپنی بیوی کا بازو چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی سیاہی نظر آ رہی تھی۔ اس کے خشک لب کئی بار کانپے اور پھر اس نے پوچھا "کتنی رقم؟"

"دو سو پونڈ" اجنبی نے جواب دیا۔

اپنی بیوی کی چیخ سے بے خبر، بوڑھے وائیٹ نے اندھوں کی طرح اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور غش کھا کر گر پڑا۔

قبرستان گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا جہاں رچرڈ دفنا دیا گیا۔ سب کچھ آناً فاناً ہی ہو گیا تھا۔ ان کے دماغ بکھرا گئے تھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ وائیٹ اور اس کی بیوی کو احساس ہونے لگا کہ ان کے بیٹے کی موت ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ یہ بندر کے پنجے کی کارستانی ہے۔

بوڑھے جوڑے پر خاموشی چھا گئی۔ ایک رات جب وائیٹ کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اپنی بیوی کی چیخ سن کر اٹھ بیٹھا۔

"پنجہ...." وہ چیخ رہی تھی "بندر کا پنجہ! کہاں ہے وہ؟ بندر کا پنجہ کہاں ہے؟"

"کیا ہوا؟" بوڑھے وائیٹ نے پوچھا۔

"مجھے بندر کا پنجہ چاہیے" مسز وائیٹ نے کہا "تم نے اسے جلا تو نہیں دیا؟"

"نہیں" وائیٹ بولا "میری میز کی دراز میں پڑا ہے۔ تمہیں کیا چاہیے؟"

مسز وائیٹ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی "آہا۔ آہا.... میں بھی کتنی احمق ہوں کہ بھول ہی گئی تھی۔ تم رچرڈ کے باپ ہو۔ تمہیں یہ خیال کیوں نہ سوجھا.... آہا ہا.... مگر میں ماں ہوں۔ یہ خیال پہلے میرے دل میں ہی آنا چاہیے تھا.... میں ماں ہوں نا۔"

"کیسا خیال، کون سا خیال؟"

"ابھی تم اپنی دو خواہشوں کو پورا کر سکتے ہو.... ہاں باقی دو خواہشیں...."

"کیا ایک ہی خواہش کی تکمیل ہمارے لیے کافی نہیں؟" بوڑھا اب بھی اپنی بیوی کے خیال کو نہ پا سکا تھا۔

"نہیں...." اس کے لہجے میں جوش اور تندی تھی۔ "ابھی جاؤ اور بندر کا پنجہ ہاتھ میں لے کر اس خواہش کا اظہار کرو کہ ہمارا بیٹا دوبارہ زندہ ہو جائے۔"

بوڑھا یوں زمین پر بیٹھ گیا، جیسے کسی نے اس کے بوڑھے اور نحیف شانوں کو دبا کر اسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہو۔ کہنے لگا "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟"

"وقت ضائع نہ کرو۔" اس نے چلا کر کہا "جلدی کرو.... جلدی.... میرا بیٹا.... آہ میرا بیٹا۔"

"جاؤ جا کر سو جاؤ۔" بوڑھے نے کہا "تم ہوش میں نہیں ہو۔"

"تم جلدی کرو، میں کچھ نہ سنوں گی۔" اس کی بیوی نے کہا "ہمارا بیٹا دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایک خواہش پوری ہو سکتی ہے تو دوسری کیوں نہیں؟"

"وہ ایک حادثہ تھا.... اتفاق تھا...."

"نہیں.... نہیں...." وہ اسے گھسیٹنے لگی "تمہیں دوسری خواہش کا اظہار کرنا ہو گا۔ ہمارا بیٹا دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"اسے مرے دس دن ہو چکے ہیں" بوڑھا آہستہ آہستہ کہنے لگا "ہم تو اسے پہچان بھی نہیں سکیں گے.... تمہیں یاد ہے کہ لوگوں نے ہمیں آخری بار اس کا چہرہ بھی نہ دیکھنے دیا تھا وہ مشین میں کچلا گیا تھا۔ اس کا چہرہ اور اس کے اعضا ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ مسخ ہو گئے تھے..." اس کی آواز بھرا گئی "تم اسے اس حالت میں زندہ دیکھ کر مر جاؤ گی۔"

"نہیں.... بوڑھی عورت نے چیخ کر کہا "کیا کوئی ماں اپنے بچے سے ڈر سکتی ہے؟ کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے واپس لاؤ۔ بندر کا پنجہ اسے واپس لا سکتا ہے۔"

بوڑھا لاجواب ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں میز کا دراز کھول کر اس نے بندر کا پنجہ باہر نکالا۔ اسے چھوتے ہی اس نے یوں محسوس کیا جیسے سردی کی تیز لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ تاریکی میں وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تو دروازے سے ٹکرا گیا۔ خوف اور دہشت سے اس کا جسم ٹھنڈے پسینے سے نہا گیا جب وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد ہو چکا تھا۔

"بولو.... مانگو..." وہ چیخی۔

وہ چپ رہا۔

"جلدی کرو۔" وہ پھر چلائی۔

اس نے بندر کا پنجہ بائیں ہاتھ میں لیا اور افسردہ آواز میں بولا "میری دوسری خواہش یہ ہے کہ میرا بیٹا زندہ ہو جائے۔"

بندر کا پنجہ اس کے ہاتھ میں رینگنے لگا اور فرش پر گر پڑا۔ بوڑھا کرسی میں یوں دھنس گیا جیسے اس کی جان نکل گئی ہو۔ مسز وائیٹ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں اپنے بیٹے کے انتظار میں چمک رہی تھیں۔ شمعدان میں جلتی ہوئی شمع کا شعلہ بجھنے سے پہلے آخری بار پھڑپھڑایا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ مسز وائیٹ اپنے شوہر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دونوں چپ رہے۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز ان کے دلوں پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔ اچانک بوڑھے نے دیا سلائی جلائی اور موم بتی لینے کے لیے نیچے والے کمرے میں اترنے والی سیڑھیوں کی طرف چل دیا جب وہ آخری سیڑھی پر پہنچا تو اس نے بڑے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ وہ یوں لرزا کہ دیا سلائی اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور اندھیرا پھیل گیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ دستک پھر سنائی دی۔ پھر تیسری بار....

"یہ کیسی آواز ہے؟" بوڑھی عورت نے چیخ کر کہا۔

"ہوا ہے۔" بوڑھا بولا۔

"نہیں.... یہ رچرڈ کے ہاتھ کی دستک ہے۔" بڑھیا نے اشتیاق سے کہا۔ "وہ اسی طرح دستک دیا کرتا تھا میں اس کی دستک کا مخصوص انداز نہیں بھول سکتی۔" وہ دروازے کی طرف بھاگی مگر اس سے پہلے بوڑھا دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بجھتی ہوئی دیا سلائی کی مدھم لو میں دروازے کے باہر.... شیشے سے ایک ایسا چہرہ دیکھ چکا تھا جو لرزا دینے والا تھا۔ مسلا کچلا اور رونما ہوا چہرہ.... اس نے زور سے اپنی بیوی کا بازو پکڑ لیا۔

"کیا کر رہے ہو؟ دروازہ کھولنے دو" وہ بڑھیا نے چیخ کر کہا "میرا بیٹا آگیا ہے۔ میرا رچرڈ آگیا ہے۔" وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بوڑھے کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہی تھی "مجھے دروازہ کھولنے دو۔ وہ سردی میں ٹھٹھر رہا ہوگا۔"

"خدا کے لیے دروازہ مت کھولو..." بوڑھے نے لرزتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے ہی بیٹے سے خوفزدہ ہو؟" بڑھیا نے قہر آلود لہجے میں کہا "کیسے باپ ہو تم؟.... رچرڈ... میرے بیٹے.... رچرڈ.... میں آ رہی ہوں۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔"



دروازے پر بار بار دستک ہو رہی تھی۔ کمرہ تاریک تھا بوڑھی عورت نے پورا زور لگا کر اپنے آپ کو بوڑھے کی گرفت سے چھڑا لیا۔ بوڑھا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنی اور پھر اپنی بیوی کی آواز "چٹخنی اوہ.... چٹخنی بہت اونچی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا.... اسے کھول دو۔"

بوڑھا اس کی آواز سن کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ وہ دوسرے کمرے میں جا کر تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا.... بندر کا پنجہ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے اسی تلاش کے دوران کرسی گھسیٹنے کی آواز سنی۔ اس کی بیوی کرسی گھسیٹ کر دروازے کے قریب رکھ کر اوپر چڑھ کر چٹخنی کھولنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے کرسی کے گرنے کی آواز سنی اور اسی وقت.... اس کا ہاتھ۔ بندر کے پنجے پر پڑ گیا۔ اس نے اسے جلدی سے اٹھایا۔ اسے بیوی کا واویلا سنائی دیا "جلدی آؤ وائیٹ چٹخنی کھول دو.... وہ باہر ٹھٹھر رہا ہوگا۔ میرا بیٹا...."

اس کی بیوی اسے آوازیں دے رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ بوڑھے نے اپنی بیوی کی چیخ و پکار پر کان نہ دھرا اور بندر کے پنجے کو ہاتھ میں لے کر اپنی تیسری اور آخری خواہش کا اظہار کر دیا۔

دستک کی آوازیں فوراً بند ہو گئیں۔ پھر بوڑھے نے چٹخنی کھلنے کی آواز سنی.... وہ تیزی سے اپنی بیوی کی طرف بھاگا.... جو دروازہ کھول کر باہر دیکھ رہی تھی۔ گلی میں کھمبے کا بلب پیلی روشنی بکھیر رہا تھا.... سنسان اور ویران، گلی میں ایک سایہ نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ بوڑھے کی تیسری خواہش پوری ہو چکی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"اصل واقعہ کا علم صرف دو افراد کو ہے، ایک کھنڈر جیسے مکان میں رہنے والی پاگل عورت کو اور دوسرے صرف مجھ"

# آسیبی پھول

## ولیم کرائے

اب تو میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ بہت معمولی چیزوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ چمکدار دھوپ، گھاس پر پڑنے والے گہرے سائے، سفید گلاب۔ سرخ بالوں والے بچے اور..... ایک معمولی سا نام۔ یعنی 'ہیری' یہ خوبصورت چیزیں بھی بھلا خوفزدہ کرنے والی ہو سکتی ہیں لیکن میرا عجیب حال ہے کہ ان چیزوں کی خوبصورتی ہی میرے لیے خوف کا باعث بن گئی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نھی کرسٹائن نے جب پہلی دفعہ ہیری کا نام میرے سامنے لیا تھا۔ تو اُسی وقت میرے ذہن میں کچھ خدشات پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ اس قدر معمولی تھے کہ میں نے وقتی طور پر اُنہیں زیادہ اہمیت نہ دی۔ کرسٹائن کی عمر اس وقت پانچ سال ہو چکی تھی اور تین ماہ کے اندر اُسے سکول جانا شروع کر دینا چاہیئے تھا۔ وہ بڑا خوبصورت دن تھا۔ حرارت سے بھری ہوئی چمکدار دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور کرسٹائن اپنے معمول کے مطابق پائیں باغ میں کھیل رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ پیٹ کے بل لیٹی ڈیزی کے پھول توڑ توڑ کر بڑی محنت سے اُن کے ہار تیار کر رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں اُس کے ہلکے سرخ بال چمک رہے تھے اور اس کی جلد نہایت سفید نظر آ رہی تھی۔ ہار بنانے کے انہاک میں اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں اور پھولوں پر مرتکز تھیں۔

اچانک اس نے سفید گلاب کی اس جھاڑی کی جانب دیکھا، جس کا گہرا سایہ گھاس پر پڑ رہا تھا، اور مسکراتے



ہوئے بولی۔

"ہاں! میں کرسٹائن ہی ہوں"

یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ اس جھاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی موٹی موٹی ننگی پنڈلیاں اونچے سوتی سکرٹ کے نیچے بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔

"اپنی ممی اور ڈیڈی کے ساتھ" میں نے اس کے الفاظ واضح طور پر سنے۔ ذرا دیر رکنے کے بعد وہ بولی۔ "اوہ۔ لیکن وہ تو میرے ممی اور ڈیڈی ہیں"

اب وہ گلاب کی اس جھاڑی کے سایہ میں چھپ چکی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ روشنی کی دنیا سے نکل کر کسی اندھیرے میں چلی گئی ہے۔ میرے اندر ایک بے چینی کا سا احساس پیدا ہوا اور بلا کسی وجہ کے میں نے اُسے آواز دی۔

"کرس تم کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں ممی"

"اب اندر آ جاؤ"

"اب مجھے جانا ہے۔ خدا حافظ" اس نے گلاب کی جھاڑی کی طرف رُخ کر کے کہا۔ اور گھر کی جانب چلی آئی۔

"کرس تم وہاں کس سے باتیں کر رہی تھی" اس کے اندر آنے پر میں نے پوچھا۔

"ہیری سے"

"ہیری کون ہے؟"

"بس وہ ہیری ہے" اُس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

اس سے زیادہ اس وقت میں اُس سے کچھ معلوم نہیں کر سکی۔ چنانچہ میں نے اُسے کیک اور دودھ دیا۔ جب وہ کھا پی چکی تو میں ایک کتاب میں سے پڑھ کر اُسے کہانی سنانے لگی۔ کہانی سننے کے دوران وہ بار بار باغیچہ کی جانب دیکھتی رہی۔ ایک دفعہ تو اس نے مسکرا کر ہاتھ بھی ہلایا۔ آخر جب وہ بستر پر لیٹ کر سو گئی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ اب وہ محفوظ ہے۔

میرے شوہر جم واپس گھر آئے اور میں نے انہیں اس پُراسرار ہیری کے متعلق بتایا تو وہ ہنس پڑے اور لاپرواہی سے بولے۔

"تو اس نے یہ دلچسپ حرکتیں شروع کر دی ہیں"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی جم"

"مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی حرکتیں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ جو بچے اپنے گھر میں اکیلے ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں ہوتا وہ عموماً اپنے لیے خیالی ساتھی پیدا کر لیتے ہیں بعض بچے گڑیوں کو اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں لیکن کرس کو گڑیوں کا بھی شوق نہیں رہا۔ اس لیے اس نے ایک خیالی ساتھی پیدا کر لیا ہے"

"لیکن اس نے خیالی ساتھی کے لیے یہی ایک نام کیوں چنا ہے؟"

"تم جانتی ہی ہو کہ بچے مختلف باتیں کس طرح سیکھتے ہیں" انہوں نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہ نام اسے کیوں پسند آیا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری پریشانی قطعاً بلاوجہ ہے۔ بالکل بے سبب"

"میں پریشان بالکل نہیں ہوں۔ بس اتنا ہے کہ اس کے لیے میں اپنی ذمہ داری کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتی ہوں۔ اگر وہ میری حقیقی اولاد ہوتی تو شاید میں کچھ لاپرواہی بھی کر جاتی۔ مگر اب نہیں"

"یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کا خوبصورت، صحت مند اور ذہین ہونا تمہاری توجہ کا نتیجہ تو ہے"

"آپ کی توجہ اور خیال بھی تو اس میں شامل ہے"

"یقیناً اس کے لیے ہم بہت اچھے ماں باپ ثابت ہوتے ہیں"

"ساتھ ہی بہت سادہ اور نرم دل بھی"

ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ انہوں نے بڑھ کر مجھے آغوش میں لے کر چوم لیا۔ میری پریشانی گویا ختم ہو گئی۔ لیکن صرف دوسرے دن صبح تک کے لیے۔

اس دن بھی چھوٹے سے ہرے بھرے باغیچہ اور سفید گلابوں پر چمکدار دھوپ پھیلی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کرسٹائن آلتی پالتی مارے گھاس پر بیٹھی ہے اور گلاب کی اُسی جھاڑی کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

"ہیلو" وہ بولی "مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے..... کیونکہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ تمہاری عمر کیا ہے؟ میں پانچ سال سے کچھ ہی بڑی ہوں..... مگر میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ میں جلد ہی سکول جانا شروع کر دوں گی۔ اور ایک نیا سبز لباس پہنا کروں گی تم سکول

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جاتے ہو یا نہیں؟... پھر تم کیا کرتے رہتے ہو؟" اس کے بعد وہ خاموش انہماک کے ساتھ جیسے کچھ سن کر سر ہلاتی رہی۔

میں باورچی خانہ کی کھڑکی میں دیکھ کر خوف سے جیسے شل ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بیوقوف مت ہو۔ بہت سے بچے اپنے لیے خیالی ساتھی پیدا کر لیتے ہیں۔ تم یوں سمجھو کہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ احمق نہ بنو۔

لیکن اس کے باوجود ناشتہ اور کھانے کے درمیان دودھ پینے کے لیے میں نے کرس کو وقت سے پہلے ہی پکار لیا۔

"کیا ہیری کو بھی ساتھ لے آؤں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں" میں نے بلا ارادہ کچھ تلخی کے ساتھ کہہ دیا۔

"خدا حافظ ہیری مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ مگر مجھے دودھ پینے کے لیے جانا چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ گھر کی جانب دوڑی۔ "ممی، ہیری کو دودھ کیوں نہیں مل سکتا؟" اُس نے اندر آتے ہی پوچھا۔

"یہ ہیری کون ہے بیٹی؟" میں نے پیار سے اُسے چمکارا۔

"وہ میرا بھائی ہے۔"

"لیکن کرس، تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ تمہارے ماں باپ کے ہاں تو صرف ایک بچہ ہے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گڑیا سی پیاری سی بیٹی۔ اور وہ تم ہو۔ ہیری تمہارا بھائی کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہیری میرا بھائی ہے ممی۔ اس نے خود مجھے بتایا ہے۔"

اس کے بعد وہ دودھ کے گلاس پر جھک گئی۔ اسے ختم کر کے دودھ کی سفید مونچھوں والے ہونٹ سے ہی بسکٹ کھانے لگی۔ اور میں نے سوچا کہ ہیری نے اس کی بھوک پر بہرحال کوئی بُرا اثر نہیں ڈالا۔

اس روز کے واقعہ کا میں نے جم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے سوچا کہ سب کچھ سن کر وہ پہلے کی طرح پھر میرا مذاق بناتے گا۔ لیکن کرسٹائن کا خیالی ہیری دن بدن اتنی اہمیت اختیار کرتا گیا کہ مجھے لگا کہ وہ میرے اعصاب پر سوار ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اضمحلال ہر آن وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

ایک اتوار کو جم نے کرسٹائن کو اسی طرح ہیری سے باتیں کرتے سنا تو کہنے لگے۔

"بچوں کے خیالی ساتھیوں کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے اس طرح بچوں کو بولنا خوب آ جاتا ہے۔ اب کرس پہلے کی نسبت زیادہ بے تکلفی سے بول سکتی ہے۔"

"مگر ایک خاص لہجہ میں۔" میں نے یکایک کہا۔

"خاص لہجہ میں؟ کس خاص لہجہ میں؟"

"آپ نے دیکھا نہیں۔ اس کا لہجہ کچھ عامیانہ ہے۔"

"لیکن جانِ من، شہر میں رہنے والا ہر بچہ کسی نہ کسی حد تک اس لہجہ کو لازماً اپناتا ہے۔ ابھی کیا ہے۔ اس کا حال تو اس وقت دیکھنا جب وہ سکول جانا شروع کر دے گی اور دوسرے بچوں سے اس کا میل جول بڑھے گا۔"

"مگر ہم دونوں میں سے کسی کا لہجہ یہ نہیں ہے۔ پھر اس نے ابھی سے یہ لہجہ کہاں سے سیکھ لیا۔ سیکھ کہاں سے سکتی ہے سوائے ہیری...."

"سیکھی کہاں سے آخر دودھ والا، صفائی کرنے والا، کوئلہ دینے والا، پھل والا، یہ سب گھر میں آتے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد بھی کچھ کسر باقی رہ جاتی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اس کی وجہ نہیں ہیں۔" میں زبردستی تلخی کے ساتھ ہنسی۔

"تمہاری تسلی اور ذہنی اطمینان کے لیے میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔"

"کیا___؟"

"تم کرس کو لے کر کل ڈاکٹر وبسٹر کے پاس چلی جاؤ اور اسے کرس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع دو۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے؟"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن جب کوئی ایسی بات سامنے آ جائے کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہو تو ماہرانہ مشورہ لے لینا بہتر ہوتا ہے۔"

دوسرے دن میں کرسٹائن کو لے کر وبسٹر کے پاس پہنچی۔ اسے انتظار کے کمرہ میں چھوڑ کر پہلے ڈاکٹر سے اکیلی ملی اور اسے مختصر طور ہیری کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مسز جم، یہ کیس اگرچہ بڑا غیر معمولی ہے لیکن اپنی نوعیت کا



انوکھا کیس ہرگز نہیں ہے۔ میرے علم میں ایسے بہت سے بچے ہیں جن کے لیے ان کے خیالی ساتھی اس قدر حقیقی حیثیت اختیار کر گئے تھے کہ ان کے لیے پریشان ہو کر رہ گئے۔ کرسٹائن بھی تو انہی کی طرح تنہا اور اکیلی بچی ہے۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا بھی تو کوئی نہیں ہے نا؟"

"جی ہاں۔ کوئی بھی بچہ اس کا واقف نہیں ہے آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ہم ابھی تھوڑا عرصہ ہوا آئے ہیں۔ مگر یہ کمی جلد ہی دُور ہو جائے گی۔ جب وہ سکول جانا شروع کر دے گی۔"

"اور آپ دیکھیں گی کہ جونہی اس نے سکول جانا شروع کیا۔ اسکی یہ خیالی تخلیقات ختم ہو جائیں گی۔ فطری بات ہے کہ ہر بچہ اپنے ہم ساتھیوں کی خواہش رکھتا ہے۔ ایسے ساتھی اُسے نہیں ملتے تو اُنہیں خیالی طور پر پیدا کر لیتا ہے آپ جانتی ہوں گی کہ بوڑھے لوگ بھی جو تنہا رہ جاتے ہیں اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں بلکہ بات کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی سُننے والا نہیں ملتا تو اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچوں کا ذہن چونکہ زیادہ زرخیز ہوتا ہے اس لیے وہ بجائے خود سے باتیں کرنے کے خیالی ساتھیوں کو تخلیق کر لیتے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں تو آپ کے لیے پریشان ہونے کی قطعاً کوئی بات نہیں ہے۔"

"یہی بات میرے شوہر بھی کہتے ہیں۔"

"ان کی بات بالکل درست ہے۔ بہرحال آپ کرسٹائن کو ساتھ لائی ہیں تو مجھے علیحدگی میں اس سے چند باتیں کرنے دیجیے۔"

میں کرسٹائن کو لینے انتظار گاہ میں گئی تو وہ کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"ہیری میرا انتظار کر رہا ہے۔"

"کہاں بیٹی؟" میں نے اطمینان سے پوچھا۔

"وہاں۔ وہ گلاب کی جھاڑی کے قریب۔" اس نے سفید گلاب کی جھاڑی کی جانب اشارہ کیا جو ڈاکٹر کے باغیچہ میں بھی موجود تھی۔

"وہاں؟___ وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے باہر کی جانب دیکھ کر کہا۔ اس پر اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی بڑا آدمی کسی پر تحقیر کی نظر ڈالے۔ "ڈاکٹر وبسٹر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی آواز میں کپکپاہٹ محسوس کی۔ "تم اُنہیں جانتی ہو نا؟ وہی ڈاکٹر جو تمہیں ان دنوں مٹھائی لا کر دیا کرتے تھے جب تم بیمار تھیں۔"

"جی ہاں ___ اچھا۔"

وہ بلا تامل ڈاکٹر کے کمرہ میں چلی گئی اور میں باہر انتظار کرتے وقت کچھ بے چینی سی محسوس کرتی رہی۔ دیوار کے پیچھے سے ان کی گفتگو کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے سے باہر نکلے تو ڈاکٹر نے کہا۔

"اسے قطعاً کوئی عارضہ نہیں ہے۔ بس اتنا ہے کہ یہ ننھی گڑیا ایک مضبوط تخیلاتی ذہن کی مالک ہے۔" اس نے اپنی آواز دھیمی کر کے مجھ سے کہا۔ "آپ کے لیے میرا ایک مشورہ ہے مسز جم! اسے ہیری کے بارے میں کھل کر باتیں کرنے کا موقع دیجیے۔ اس میں یہ اعتماد پیدا ہونے دیجیے کہ وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرے۔ مجھے یوں لگا ہے کہ آپ نے اُس کے اس بھائی کو کچھ ناپسند کیا ہے اس لیے وہ اس کے بارے میں آپ سے زیادہ باتیں نہیں کرتی۔" اس نے کرسٹائن کی جانب رُخ کر کے کہا۔ "وہ تو لکڑی کے کھلونے بھی بناتا ہے۔ ہے نا کرس؟"

"جی ہاں ہیری لکڑی کے کھلونے بناتا ہے۔"

"اور وہ لکھ پڑھ بھی سکتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"اور تیر بھی سکتا ہے۔ وہ بہت ہی اچھا بھائی ہے۔" یہ کہتے ہوئے خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"ہیری اس کے لیے بہت اچھا بھائی ثابت ہوگا۔ اس کے بال بھی کرس کی طرح ہی سرخ ہیں۔ ہے نا کرس؟"

"جی ہاں۔ ہیری کے بال سُرخ ہیں۔" اس نے فخر کے ساتھ کہا۔ "بلکہ میرے بالوں سے بھی زیادہ سرخ ہیں۔ اس کا قد ڈیڈی جتنا۔ بس وہ ذرا پتلا ہے۔ وہ آپ جتنا لمبا ہے ممی۔ اس کی عمر چودہ سال ہے وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ لمبا ہے۔ یہ عمر سے زیادہ لمبا ہونا کیا ہوتا ہے؟"

"اس کے بارے میں تمہاری ممی تمہیں گھر جاتے وقت راستے میں بتائیں گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اچھا مسز جم، خدا حافظ گھبرایئے نہیں۔ بس اسے خوب باتیں کرنے کا موقع دیجیے۔ خدا حافظ کرس۔ ہیری کو میرا پیار دینا۔" کچھ دن اور اسی طرح گزر گئے۔ اب تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہر وقت ہر طرف ہیری ہی ہیری تھا۔ کرشاتن ہر وقت اسی کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ آخر جب اس کے سکول جانے کا وقت آیا تو سکول جانے سے ایک دن پہلے وہ کہنے لگی۔

"میں سکول نہیں جاؤں گی۔"

"وہ کیوں بیٹی۔ تم تو سکول جانے کی تیاری کیا کرتی تھی۔ نہیں بیٹی کل تم سکول جاؤ گی۔ وہاں تمہارے جیسے اور بھی بہت سے بچے ہوں گے۔"

"ہیری کہتا ہے کہ وہ سکول نہیں جا سکتا۔"

"وہاں تمہیں اور بہت سے ساتھی مل جائیں گے اور ہیری۔" میں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر پورا عمل کرتے ہوئے ہیری کے وجود کو تسلیم کرنے کی کوشش کی۔ "ہیری بہت بڑا ہے وہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں احمق معلوم ہو گا۔ وہ تو ۱۴ سال کا اچھا خاصا جوان ہے۔"

"میں ہیری کے بغیر سکول نہیں جاؤں گی۔ میں اس سے الگ نہیں رہ سکتی۔" اس نے چیخ چیخ کر کربناک انداز میں رونا شروع کر دیا۔

روتے روتے وہ سو گئی۔ آنسوؤں کے نشانات اس کے خوبصورت چہرے پر اب تک جمے ہوئے تھے۔

ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ میں پردے کھینچنے کے لیے کھڑکی کے قریب گئی۔ باغیچہ میں سنہری دھوپ اور مدھم سایوں کا امتزاج بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے میں محو ہو گئی۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ سفید گلاب کی جھاڑی کے قریب ایک دُبلے پتلے لمبے قد کے لڑکے کا سایہ واضح طور پر میری آنکھوں کے سامنے تیر گیا۔ میں نے جھٹ کھڑکی سے سر نکالا اور غیر ارادی طور پر پکار اٹھی۔

"ہیری۔ ہیری۔"

مجھے یوں لگا کہ گلاب کے سفید پھولوں کے درمیان کوئی سُرخ چیز ایک لمحے کے لیے جھلکی۔ ایک لڑکے کے سر کے گھنگریالے سرخ بال، لیکن پلک جھپکنے کے ساتھ ہی وہاں کچھ نہیں تھا۔ جیسے میں نے خواب میں سب کچھ دیکھا ہو۔

اس رات میں شاید ساری رات ہی اس معاملے پر سوچتی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ میرے شوہر، ڈاکٹر وہیبٹر یا کوئی بھی شخص میرے قلب و دماغ کی کیفیت کو سمجھنے کے قابل نہیں ہے اور اپنی الجھن کو۔ جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ دور کرنے کے لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ دوسرے دن میں اپنے اس خفیہ کام کے لیے روانہ ہو گئی جس کا ذکر میں نے کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ کرشاتن کو سکول میں چھوڑنے کے بعد ایک بس میں سوار ہوئی اور شہر کی اس بیرونی آبادی کی اس بلند بوسیدہ سی چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ گئی جہاں پانچ سال پہلے میں اور جم اکٹھے آئے تھے۔ سب سے اوپر والی منزل پر انجمن بہبود لاوارث بچگان کا دفتر تھا۔ میں ایک ہی سانس میں اُس کی ان گنت سیڑھیاں طے کر کے اپنے جانے پہچانے دروازے پر پہنچ گئی اور دستک دینے لگی۔

دروازہ مس کلیور نے کھولا۔ وہ لمبے قد، سفید بالوں اور جھریوں بھرے مشفقانہ چہرے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور کہا۔

"اوہ مسز جم۔ آپ کی تشریف آوری بڑی خوشی کا باعث ہے کرشاتن کا کیا حال ہے؟"

"وہ بالکل خوش و خرم ہے۔" میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا جلدی میں ہوں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ بلا کسی تمہید کے مطلب کی بات کرنی چاہیے۔" وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھی ہمہ تن متوجہ تھیں۔ "مس کلیور بات یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ عموماً کسی بچے کو گود لینے والوں کو اس کے والدین کے بارے میں اور اس کے والدین کو اس گود میں لینے والوں کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ لیکن کرشاتن کے متعلق مجھے ضرور معلوم

مشہور سائنس دان فراڈے حاضرین کو بتا رہا تھا کہ "مقناطیس بجلی کی رفتار ناپنے کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے۔" اس موضوع پر نئی نئی تحقیقات ہو رہی تھیں لوگوں کو یہ احساس نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں ان تحقیقات سے سائنس کی دنیا میں کیا انقلاب برپا ہو گا۔ ایک شخص نے فراڈے سے سوال کیا "اس چھوٹی سی تحقیق سے بھلا کیا فائدہ پہنچے گا؟"

فراڈے کو غصہ آ گیا۔ اُس نے دریافت کیا "ماں کے پیٹ سے جو چھوٹا سا ننھا منا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اُس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے؟"



ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے؟"

"مجھے افسوس ہے مسز جم۔" انہوں نے کہنا شروع کیا "ہمارا اصول....."

"پہلے مجھ سے ساری بات سُن لیجیے۔" میں نے ان کی بات کاٹی۔ "اس کے بعد آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں فضول قسم کے تجسس کا شکار نہیں ہوں۔"

اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ کرشاتن کی پوری کہانی انہیں سُنا دی۔ وہ خاموشی سے سُنتی رہیں اور ان کے چہرے پر حیرانی کے آثار پھیلتے گئے۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولیں۔

"یہ تو بڑی عجیب کہانی ہے۔ بہت ہی عجیب۔ مسز اس کا مطلب ہے کہ مجھے آپ کے لیے اپنے اصول کو توڑنا پڑے گا لیکن یہ خیال رکھیے کہ کرشاتن کے گھر اور والدین کے بارے میں جو کچھ میں بتاؤں وہ صرف آپ تک محدود رہنا چاہیے۔"

"یقیناً ـــــ آپ بالکل مطمئن رہیے۔"

"وہ لندن کے ایک بہت ہی غریب محلہ میں پیدا ہوئی تھی۔" انہوں نے بتانا شروع کیا۔ "اس کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ ماں، باپ، ایک بیٹا اور کرشاتن خود۔"

"ایک بیٹا بھی؟"

"ہاں جب یہ واقعہ ہوا تو اس کی عمر چودہ سال تھی۔"

"کیا واقعہ؟ کب ہوا؟"

"میرا خیال ہے کہ شروع سے آپ کو بتاؤں دراصل کرشاتن اپنے ماں باپ کا چھوٹا بچہ تھی۔ اس کے ماں باپ ایک بوسیدہ اور پرانے مکان کی سب سے اوپر کی منزل کے صرف ایک کمرہ میں رہائش رکھتے تھے۔ تین افراد کے لیے ان کے پاس جگہ اور ذرائع ناکافی تھے۔ اس پر یہ بھی پیدا ہو گئی۔ یہ تو بڑی مشکل درپیش آئی اس کی ماں کچھ پریشان سی بے سلیقہ، غیر مطمئن رہنے والی بہت موٹی عورت تھی۔ کرشاتن پیدا ہو گئی تو اُس نے اپنی بیٹی کو بے توجہی کا شکار کر دیا۔ مگر کرشاتن کا بھائی اپنی بہن کے ساتھ شروع سے ہی بہت پیار کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے سکول جانا ترک کر دیا۔ اور اپنے تعلیمی مستقبل کو قربان کر دیا۔"

"ایک صبح تڑکے ہی اس عمارت کی نچلی منزل میں رہنے والی ایک عورت کو یوں لگا کہ اس کی کھڑکی کے سامنے اوپر سے کوئی چیز دھماکے کے ساتھ گری ہے۔ وہ عورت فوراً باہر پہنچی تو دیکھا کہ کرشاتن کا بھائی زمین پر پڑا ہے اور کرشاتن اس کی گود میں ہے لڑکے کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ کرشاتن کا چہرہ بھی نیلا پڑ گیا تھا مگر اس کی سانس اب تک آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

اُس عورت نے اپنے گھر کے لوگوں کو جگا کر پولیس اور ڈاکٹر کو اطلاع کرائی اور ان کے آنے کے بعد وہ سب اوپر کی منزل پر پہنچے تو کرشاتن کے گھرانے کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ اسے توڑ کر کھولا گیا تو اندر گیس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ خاوند اور بیوی دونوں بستر میں مُردہ پڑے تھے اور خاوند کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر میز پر موجود تھی جس میں لکھا تھا۔

"زندگی اب ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ میں سب کو مار رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

"پولیس اس نتیجہ پر پہنچی کہ بیوی بچوں کے سو جانے کے بعد اس شخص نے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے گیس کی نالی کھول دی اور خود بھی اپنی بیوی کے قریب بستر میں لیٹ گیا اور پھر موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اسی دوران میں اس کے لڑکے کی آنکھ کھل گئی ہو گی۔ وہ دروازہ کھولنے اور چیخنے کی کوشش میں ناکام رہا ہو گا تو آخری کوشش یہ کی ہو گی کہ کھڑکی کھول کر اپنی بہت پیاری بہن کو گود میں لیے ہوئے نیچے چھلانگ لگا دی۔"

"گویا بھائی نے بہن کو بچانے میں اپنی جان گنوا دی؟" میں نے کہا۔

"بے شک وہ بڑا دلیر لڑکا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ بہن کو بچانے کی نسبت سے اپنے ساتھ رکھنے کا زیادہ خواہشمند تھا۔ بہر حال مس کلیور۔ اس لڑکے کا کیا نام تھا؟"

"اس کے لیے تو مجھے اپنے کاغذات دیکھنے پڑیں گے۔"

اُنہوں نے الماری میں سے کئی فائلیں اٹھا کر اُن کے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ آخر ایک فائل کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"اُن کا خاندانی نام جونز تھا اور یہ چودہ سالہ ہیری کہلاتا تھا۔"

"کیا اس کے بال سُرخ تھے؟"

"ان باتوں کا مجھے علم نہیں ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"مگر کرشان اسے ہیری کہتی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے اپنا بھائی یاد کیسے رہا جبکہ اس کی موت کے وقت وہ چند ماہ کی تھی۔"

"بات ہے تو بڑی الجھی ہوئی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کرشان کے تحت الشعور میں ہیری کا نقشہ پیوست رہا ہے جو اس کے ابتدائی بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بچوں کا حافظہ دیرپا نہیں ہوتا لیکن ان کے ننھے منے ذہنوں میں بھی ماضی کے کچھ نقوش باقی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ ہیری بھی کرشان کی تخلیق نہیں ہے بلکہ اسے اپنا بھائی اس حد تک یاد ہے کہ وہ اُسے دوبارہ حقیقت کا روپ دے لیتی ہے۔"

"کیا آپ مجھے اس مکان کا پتا بتا سکتی ہیں جہاں یہ خاندان رہتا تھا؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" مس کلیور سے پتا لے کر جب میں اس مکان پر پہنچی تو وہ ایک کھنڈر سے زیادہ کچھ نہیں تھا اور اسے لاوارث چھوڑ دیا گیا تھا۔ البتہ ایک ایسی چیز نظر آئی جسے میں دیکھتی ہی رہ گئی مکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں چمک دار ناہموار گھاس کے تنکے لہرا رہے تھے اور اس باغیچہ میں ایک ایسی انوکھی خوبصورت چیز موجود تھی جو غریبوں کی بستی کے کسی مکان میں نہ ہوگی۔ یہ سفید گلاب کی ایک جھاڑی تھی۔ "کون ہو تم؟ یہاں کیا کرنے آئی ہو؟" میں اس آواز سے چونک پڑی۔ دیکھا تو ایک عورت مکان کی نچلی منزل کی ایک کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

"میرا تو خیال تھا کہ اس مکان میں کوئی نہیں رہتا۔"

"ہونا تو ایسا ہی چاہیئے۔ اس کو ناکارہ اور خطرناک قرار دے دیا گیا لیکن مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ کوئی جگہ نہیں جہاں میں چلی جاؤں۔"

"اس واقعہ کے بعد سب لوگ مکان چھوڑ گئے۔ اب یہاں رہنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ ہو سکتا ہے مگر جھگڑا کا ہے کا۔ موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے مگر یہ حقیقت بوڑھا ہونے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔" اس نے مجھے اپنی زردی مائل سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے اپنی کھڑکی میں سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس جگہ گرا تھا وہاں گلاب کی جھاڑی میں۔ اب وہ یہاں آیا کرتا ہے۔ میں اسے دیکھ کرتی ہوں۔ اپنی بہن کو پائے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتا۔"

"کس۔۔۔ آپ کس کے متعلق بتا رہی ہیں؟"

"ہیری جونسن کے بارے میں وہ [illegible] اچھا لڑکا تھا۔" سرخ بالوں والا دبلا پتلا لڑکا۔ بڑے پختہ عزم کا [illegible] تھا۔ جو سوچ لیتا تھا اس پر عمل کر کے رہتا تھا۔ کرشان سے شدید محبت کرتا تھا۔ گلاب کی جھاڑی میں گر کر مر گیا۔ کرشان کو لے کر ان پھولوں کے پاس پہروں بیٹھا رہتا تھا۔ موت بھی اسے یہیں آئی مگر کیا لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ اس سوال کا جواب پادریوں کو دینا چاہیئے لیکن وہ کچھ نہیں بتاتے۔ کون کس کا یقین کرے۔ مگر۔ مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟ جاؤ۔ جاؤ یہ تمہاری جگہ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی جگہ ہے جو مرنے کے بعد نہیں مرتے اور جو زندہ رہ کر بھی نہیں جیتے۔"

اس کے سفید بکھرے ہوئے بالوں کے نیچے سے گھورتی ہوئی جنونی آنکھوں سے میں خوفزدہ ہو گئی۔ پاگل لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر رحم اور ہمدردی کے جذبات اُبھرتے ہیں لیکن خوف اس قدر محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے تمام جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔

"اچھا تو میں جاتی ہوں۔ خدا حافظ۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا اور جلدی جلدی واپس ہو کر لمبے لمبے قدم بھرنے لگی۔ مجھے یوں لگا کہ میرے پاؤں ایک ایک من کے ہو گئے ہیں اور جیسے میں کسی ڈراؤنے





خواب میں انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر بھاگنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ عین میرے سر پر چمک رہا تھا لیکن مجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں تو گویا زمان و مکان کے تمام احساسات کھو چکی تھی اور گرتی پڑتی مشکل سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک ایک آواز سے میں چونک گئی اور میرا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ قریب ہی کسی گھڑیال نے تین بجائے تھے۔

اب کیا کروں؟ اب کیا کروں؟ اب کیا ہوگا۔ میں پتا نہیں شہر کے کس حصہ میں ہوں؟ سکول جانے یہاں سے کتنی دور ہے؟ معلوم نہیں وہاں کون سی بس جائے گی؟

میں نے سخت گھبراہٹ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ہر آنے جانے والے سے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کر دیئے وہ مجھے ایسی خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جس طرح میں نے اس پاگل عورت کو دیکھا تھا۔

آخر مجھے بس مل گئی اور گرد و غبار، پیٹرول کی بُو اور خوفزدگی سے نڈھال ہوئی میں سکول پہنچ گئی۔ کھیل کے وسیع میدان کو بھاگتے ہوئے پار کر کے میں ابتدائی جماعت کے کمرہ میں پہنچی تو میرا سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس نوجوان اُستانی اپنی کتابوں اور کاپیوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھی۔

"میں کرشان جم کو لینے آئی ہوں۔ میں اس کی [illegible] ہوں۔ مجھے [illegible] ہے کہ مجھے دیر ہو گئی۔ وہ کہاں ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کرشان جم؟" اس نے اپنی پیشانی پر بل ڈال کر سوچا اور فوراً چہکتے ہوئے بولی: "اوہ۔۔۔ ہاں مجھے یاد آیا۔ وہ چھوٹی گڑیا سی، سنہری بالوں والی لڑکی نا؟ آپ گھبرائیے نہیں [illegible] مسز جم۔ اس کا بھائی اسے لینے آ گیا تھا۔ ان بہن بھائیوں کی شکلیں [illegible] قدرتی ہیں۔ میں تو [illegible] ہو گئی اور ان کا آپس میں کتنا پیار ہے۔ اس عمر کے لڑکے کو اپنی ننھی سی بہن کو اتنا پیار کرتے دیکھنا بڑا ہی روح پرور ہے۔ میرا خیال ہے آپ کے شوہر کے بال سرخ ہوں [illegible] دونوں بچوں کو یہ رنگ انہی سے ملا ہے نا؟"

"[illegible] کے بھائی نے کہا۔۔۔" [illegible] کہا [illegible] میں [illegible] بے حال [illegible]

[illegible] نے بات تو کوئی نہیں کی تھی [illegible] نے اس سے بار [illegible] بچہ تو مسکرا کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے اب تک [illegible] پہنچ گئے ہوں

گے۔۔۔ لیکن، لیکن آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں مجھے گھر پہنچنا چاہیئے۔"

گرمی سے جلتے ہوئے راستوں پر میں بد حواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی گھر پہنچی۔

"کرس۔ کرشان۔ کہاں ہو تم کرس۔ کرشان!"

"کرشان۔ کرس۔ تم کہاں ہو۔ کرس تم بولتی نہیں۔ کرس۔۔۔ ہیری اسے مت لے جاؤ۔۔۔ مت لے جانا! اسے واپس کر دو۔۔۔ ہیری۔۔۔ ہیری۔ ہے ے ے ری۔"

اس طرح چیختی ہوئی میں گویا پاگل ہو کر باغیچہ میں نکل گئی۔ سورج کی تیز شعاعیں نیزے کی طرح میرے بدن میں اُتر گئیں۔ سفید گلاب دھوپ میں چمک رہے تھے اور فضا بالکل ساکت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایسی جگہ پہنچ گئی ہوں جہاں وحشت ٹپک رہی ہے۔ ایک لمحہ کے لیے یوں محسوس ہوا کہ میں کرشان کے سامنے پہنچ گئی ہوں لیکن اُسے چھو نہیں سکتی۔۔۔ اس کے بعد گلاب کے پھول میرے چاروں طرف ناچ اُٹھے بے شمار گلاب کے پھول۔۔۔ سرخ پھول۔ سرخ۔ سرخ۔ پھر یہ سرخی سیاہی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ سب کچھ سیاہ ہو گیا۔ گھپ اندھیرا اور کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ مٹ گیا۔ میں خود بھی۔

میں ایک ہفتہ بیمار رہی۔ میری بیماری نے ذہنی تھکن اور اعصابی دباؤ کی شکل اختیار کر لی۔ اس دوران میں جم اور پولیس نے مل کر کرشان کی تلاش میں شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن کرشان کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔

اصل واقعہ کا علم صرف دو افراد کو ہے۔ ایک کھنڈر جیسے مکان میں رہنے والی پاگل عورت کو اور دوسرے مجھے۔

اس بات کو کئی سال بیت چکے ہیں۔ لیکن خوف کے سائے میرے دل پر بدستور ہر وقت چھائے رہتے ہیں۔

اور میں بڑی معمولی چیزوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ چمکدار دھوپ۔ گھاس پر پڑنے والے گہرے سائے۔۔۔ سفید گلاب۔۔۔ سرخ بالوں والے بچے۔۔۔ اور۔۔۔ اور ایک معمولی سا نام۔ یعنی۔ ہیری۔ بھلا یہ خوبصورت چیزیں بھی خوفزدہ کرنے والی ہو سکتی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



# ناچتی کھوپڑیاں

پراسرار کہانی

وزیر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کرسی کی طرف دیکھا، اس کا رنگ زرد پڑ گیا، کرسی پر نوجوان کے بجائے ایک خوفناک بلا بیٹھا تھا۔

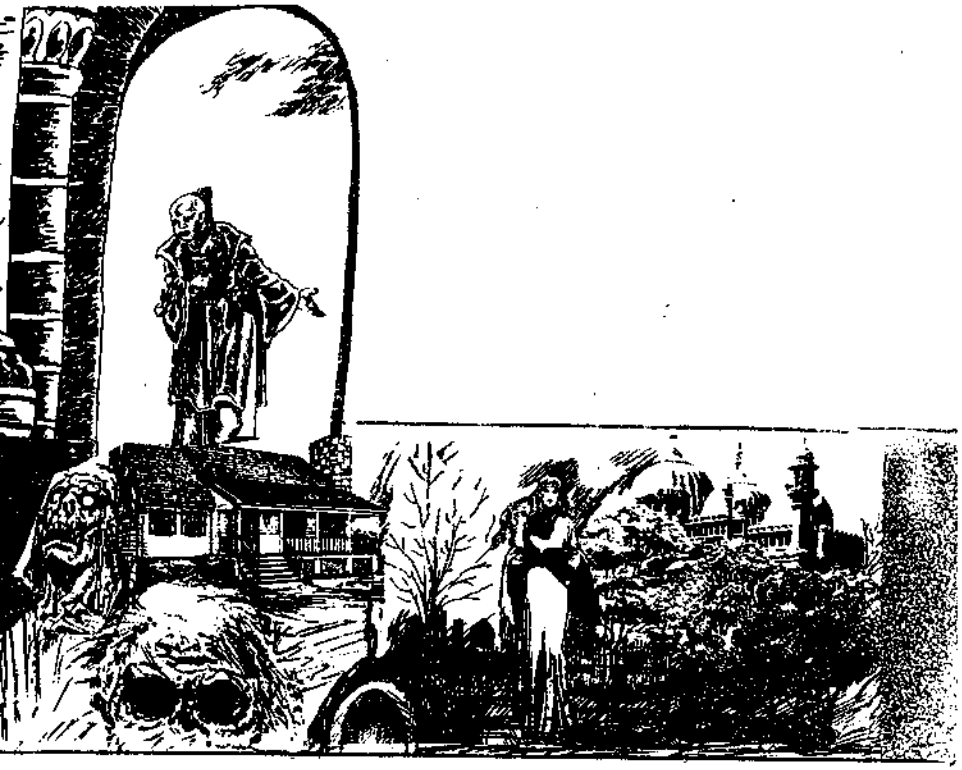







گرمیوں کا موسم تھا۔ اہرام مصر سے کچھ دور دارالسیت نامی گاؤں میں [illegible] کے تحت کنویں کھودے جا رہے تھے۔ تین کنویں تیار ہو چکے تھے اور ان میں صرف برقی موٹریں لگانی باقی تھیں۔ دوپہر کے وقفے میں صرف نصف گھنٹہ رہتا تھا، چند مزدوروں کا خیال تھا اس مختصر سے وقت میں کسی کنویں میں برقی موٹر نصب کرنے کا کام شروع کیا، تو ادھورا رہ جائے گا، اس لیے باقی وقت آرام کرنا چاہیے، ایک تنومند پست قامت مزدور نے کہا، ہمیں وقت ضائع کرنے کے بجائے چوتھا کنواں کھودنا شروع کر دینا چاہیے۔ تجویز معقول تھی۔ تمام مزدوروں نے [illegible] سنبھال لیے اور نشان زدہ زمین کھودنے لگے۔ وقفے کا گھنٹہ بجا، تو وہ دس فٹ گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ انہوں نے [illegible] عالی چچا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ پست قامت مزدور کا گہرا دوست تھا۔ کنویں کے پاس پہنچ کر اس کی نگاہیں اپنے دوست کو تلاش کرنے لگیں، مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ عالی چچا نے دوسرے مزدوروں سے پوچھا، مگر وہ کوئی جواب نہ دے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہے۔ اسے کچھ تشویش ہوئی اور پھر وہ کنویں کی طرف دوڑا۔ قریب پہنچا تو کنویں میں کدال چلنے کی آواز سنائی دی۔ اسے اطمینان سا ہو گیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا —— مزدور پسینے میں شرابور کدال چلا رہا تھا۔

"کیوں شیخ، آج کچھ کھاؤ پیو گے نہیں؟ کھانے کا وقت تو ہو چکا ہے۔" مالی چچا بولا۔

"چچا، تم چلو میں یہ ذرا سا حصہ کھود کر بس ابھی پہنچتا ہوں۔" پست قامت مزدور نے جواب دیا۔ مالی چچا چند لمحے وہیں کھڑا اپنے ساتھی کی کام سے لگن پر رشک کرتا رہا، پھر کینٹین کی طرف چل دیا۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ سکتے میں آ گیا، پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے مڑا۔ اسے یقین تھا چیخ کنویں سے آئی ہے، وہ دوڑ کر کنویں پر پہنچا، اندر جھانک کر دیکھا، تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پست قامت مزدور زمین پر لوٹ رہا تھا، خون کا ایک فوارہ اس کے ماتھے سے اُبل رہا تھا۔ مالی چچا کنویں میں اتر گیا، مگر اس کے پہنچنے تک مزدور کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

مزدور کی ناگہانی موت کی خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی۔ کنویں کے گرد مزدوروں اور دوسرے کارکنوں کی بھیڑ لگ گئی۔ شام گئے پولیس بھی موقعِ واردات پر پہنچ گئی۔ ابتدائی معائنے کے بعد پولیس انسپکٹر نے جو رپورٹ تیار کی، اس کے مطابق زمین کے اندر کوئی ٹھوس چیز تھی، متوفی ایک تنومند آدمی تھا، اس نے کدال پوری قوت سے زمین پر ماری، کدال ٹھوس چیز سے ٹکرا کر اسی رفتار سے اچھلی اور مزدور کی پیشانی میں کھب گئی اور مزدور نے اسی وقت دم توڑ دیا۔

کھدائی کا کام رُک گیا، مزدوروں میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ کیمپ سے بھاگنے کی فکر میں لگ گئے۔ چیف انجینیئر کو خبر ملی، تو وہ بہت پریشان ہوا، مزدوروں کے پاس پہنچا، انہیں سمجھایا بجھایا مگر بے سود، بالآخر پولیس نے دباؤ ڈالا اور وہ کام پر آمادہ ہو گئے۔

البتہ شرط یہ تھی کہ چوتھے کنویں میں مزید کھدائی نہیں کریں گے مگر یہ ناممکن تھا۔ حکومت کی منظور شدہ سکیم سے انحراف چیف انجینیئر کے بس میں نہ تھا، چنانچہ پولیس نے چند مزدوروں کو چوتھے کنویں میں زبردستی اُتار دیا۔ دو مزدور بے دلی سے اس جگہ کدال چلانے لگے جہاں ان کے ساتھی کی موت واقع ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں انہیں احساس ہوا، کدال نرم مٹی کے بجائے کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا رہی ہے۔ خوف و دہشت کی لہر ان کے جسم میں دوڑ گئی، مگر پولیس کے دو کانسٹیبل ان کے سر پر کھڑے تھے، وہ جیسے تیسے کدال چلاتے رہے، مٹی کھدتی رہی اور تھوڑی دیر بعد ایک حیرت انگیز چیز دریافت ہوئی۔ یہی چیز ان کے ایک ساتھی کی موت کا باعث ہوئی تھی۔

یہ لوہے کی موٹی چادر کا بے حد وزنی صندوق تھا۔ ایک بڑا سا تالا اس میں لگا ہوا تھا۔ چیف انجینیئر صندوق کی دریافت پر پھڑک اُٹھا۔ اس نے مزدوروں کو حکم دیا، صندوق کے چاروں طرف سے مٹی کھود کر اسے باہر نکالیں۔ مزدوروں نے حکم کی تعمیل کی۔ صندوق کے گرداگرد بڑا سا گڑھا بن گیا۔ اب مزدوروں نے صندوق باہر نکالنے کے لیے زور لگایا، مگر ناکام رہے۔ یوں لگتا تھا اسے کسی خاص مسالے کے ذریعے زمین کے ساتھ چپکا دیا گیا ہے۔ ایک مزدور نے تجویز پیش کی، صندوق کو باہر نکالنے کے بجائے بالائی سطح کی ریت اور مٹی کو اور کھود لیا جائے تاکہ تالا توڑنے کے بعد صندوق کا ڈھکنا کھولا جا سکے۔ تجویز معقول تھی۔ صندوق کے اُوپر سے ریت ہٹا دی گئی۔ اب تالا کھولنا باقی تھا۔ زنگ آلود اور غیر معمولی حجم کا تالا ایک ہی طریقے سے کھولا جا سکتا تھا، وہ یہ کہ اسے تیز دھار کی کدال سے توڑ دیا جائے۔ مزدور دن بھر کی مشقت سے تھک کر چور ہو چکے تھے، اس لیے یہ کام ایک تنومند کانسٹیبل کے سپرد کیا گیا۔ کانسٹیبل پہلے تو پس و پیش کرتا رہا، پھر انسپکٹر کے حکم کے آگے جھک گیا۔

اس نے کدال اُٹھائی اور تالے پر ضربیں لگانے لگا۔ دو پانچ



منٹ تک پوری قوت سے تالے پر ضرب پر ضرب لگاتا رہا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا اور اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ مگر ایک ضرب ایسی پڑی کہ زنگ آلود تالا تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ پولیس انسپکٹر لپک کر آگے بڑھا، کنویں میں اُترا، صندوق کا کنڈا کھولا اور ڈھکنا اوپر اٹھا دیا۔ ڈھکنا کھلنا تھا کہ ناقابلِ برداشت سڑاند کا بھبکا اُٹھا اور کنویں میں پھیل گیا۔ لوگوں نے اپنے ناک پکڑ لیے۔ انسپکٹر ناک پر رومال رکھ کر جھجکتے ہوئے صندوق پر جھکا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ صندوق سونے کی اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اشرفیوں کے اوپر چمڑے کے دو تین لمبے لمبے ٹکڑے لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔ انسپکٹر نے ہمت کر کے انہیں اٹھایا، ان پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں، پھر اس نے دو تین اشرفیاں اٹھا کر دیکھیں، ان پر بھی اسی طرح کی لکیریں نظر آئیں۔ پولیس انسپکٹر نے چیف انجینیئر سے درخواست کی کہ صندوق کو کنویں سے باہر نکالنے کا انتظام کیا جائے تاکہ اس میں رکھی ہوئی پُراسرار چیزوں کو ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر ان پر مزید تحقیق کی جا سکے۔ چنانچہ راتوں رات قریبی کیمپ سے کرین منگوائی گئی جس نے صندوق کو اس کے قدیم مسکن سے اکھاڑ کر پولیس کے مسلح ٹرک پر لاد دیا۔

❖ ❖ ❖

پولیس نے اپنی رپورٹ مصر کی مرکزی حکومت کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں حکومت نے محکمۂ آثارِ قدیمہ کو ہدایت کی کہ "چوتھے کنویں" کو مزید کھدوایا جائے۔ آثارِ قدیمہ کے ممتاز ماہر ڈاکٹر عبداللہ کو اس نئے تحقیقی پروجیکٹ پر روانہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عبداللہ کی اعانت کے لیے ان کا اسسٹنٹ حلیم، بیٹی فوزیہ جو آثارِ قدیمہ کی طالبہ تھی اور ایک باورچی بھی جائے واردات پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر عبداللہ اور فوزیہ دن بھر صندوق سے نکلنے والی اشرفیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی تحریر شناخت کرنے کے لیے موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور حلیم کھدائی کے کام کی نگرانی کرتا، جو اب ایک وسیع رقبے میں ہو رہی تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت ڈاکٹر عبداللہ کنویں سے ملنے والے مٹی کے ایک پُراسرار ڈبیے پر تحقیق کر رہے تھے کہ خیمے کی چق اُٹھی اور ایک مزدور ہانپتا ہانپتا اندر داخل ہوا۔

"یا شیخ... ادھر... کھدائی کے دوران... میں... قبر برآمد... ہوئی ہے۔" مزدور نے رُک رُک کر پیغام دیا اور اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔

ڈاکٹر عبداللہ مزدور کے الفاظ سنتے ہی اچھل پڑے، تیزی سے لپکتے خیمے سے باہر نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کنویں کی طرف روانہ ہو گئے۔ فوزیہ بھی اپنے باپ کے پیچھے دوڑی۔

کنویں پر پہنچ کر ڈاکٹر عبداللہ نے دیکھا، مزدوروں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے، کدالیں ایک طرف رکھی ہیں اور وہ خوفزدہ انداز میں آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے تسلی دے کر ان کی ہمت بڑھائی اور انہیں دوبارہ کام پر لگا دیا۔

چند ہی لمحے بعد ایک مزدور نے چیخ ماری، کدال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری، خوف کے مارے وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بتایا، قبر میں سے کسی جانور کے غرانے کی آواز آ رہی ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر کے لیے کام بند کرا دیا، خود کنویں میں اُترا اور قبر سے کان لگا کر بیٹھ گیا، مگر اسے کسی جانور کے غرانے کی آواز سنائی نہ دی۔ اس نے چند اور مزدوروں سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا، مگر انہیں بھی کچھ سنائی نہ دیا، چنانچہ متفقہ طور پر طے ہوا، چیخ مارنے والے مزدور کو محض واہمہ ہوا ہے۔ قبر کے اندر کوئی جانور نہیں ہے۔

مسلسل چار گھنٹے کی جدوجہد کے بعد مکمل قبر برآمد کر لی گئی۔ یہ قدیم اور پُراسرار قبر پندرہ فٹ لمبی اور اڑھائی فٹ چوڑی تھی۔ سرہانے کسی نادرِ روزگار پتھر کا تعویذ تھا جو مرورِ زمانہ کے سبب سیاہ پڑ چکا تھا۔ پوری قبر خوبصورت نقش و نگار سے مرصع تھی، البتہ کئی جگہ سے شگاف پڑے ہوئے تھے جن سے قبر کے اندر کی تاریکی صاف نظر آ رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



قبر کو چھیڑے بغیر کھدائی کا کام جاری رہا، اس لیے کہ قبر کی برآمدگی کے ساتھ ہی کسی عمارت کے نشان نظر آنے لگے تھے۔ دس روز کی مسلسل کھدائی کے بعد منقش پتھر کی ایک دیوار برآمد ہوئی، پھر ایک بڑی سی محراب کے آثار دکھائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ اور کھدائی ہوئی، تو کوئی دیو ہیکل عمارت منظرِ عام پر آجائے گی۔ کھدائی کا سلسلہ جاری رہا۔ اب مختلف قسم کا سامان برآمد ہونے لگا۔ زنگ آلود لوہے کے سریے، شہتیر، کمانیاں، مختلف برتن، پتھر کے مجسمے اور جانوروں کی شبیہیں۔ رفتہ رفتہ ایک شاندار عمارت کا کھنڈر دریافت ہو گیا۔ اونچے اونچے دروازے، پختہ فرش، مرصع میزیں، صندوق، پختہ اور بلند چبوترے عمارت کی قدیم عظمت کی غمازی کر رہے تھے۔

اسسٹنٹ حلیم اور فوزیہ خوش تھے کہ انہوں نے اس عمارت کی دریافت میں حصہ لے کر علم آثارِ قدیمہ کی بڑی خدمت کی ہے، لیکن ڈاکٹر عبداللہ کسی گہرے خیال میں گم تھے۔ انہوں نے عمارت کی ایک ایک چیز پر تحقیق کی، مگر پتہ نہ چل سکا کہ یہ عمارت کس نے تعمیر کرائی، کب تعمیر ہوئی اور یہ کہ برآمد شدہ قبر میں کون مدفون ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اشرفیوں سے بھرے ہوئے صندوق سے ملنے والے چمڑے کے ٹکڑوں کی تحریر شناخت کی جاتی۔ ڈاکٹر اپنی تمام کوششوں کے باوجود تحریر شناسی میں ناکام رہا تھا؛ چنانچہ اس نے چمڑے پر لکھی ہوئی تحریر ایک مزدور کے ذریعے قاہرہ کے ایک مشہور تحریر شناس ماہر رضوان کو بھجوا دی۔

* * *

اب تک کھدائی کنویں کے ایک جانب ہوتی رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دوسری جانب سے بھی کھودنے کا حکم دے دیا۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ گیارہ بجے کا عمل ہو گا، دو مزدور کھدائی میں مصروف تھے، اچانک وہ دلدوز آواز میں چیخنے لگے۔ ڈاکٹر عبداللہ اطلاع ملتے ہی کنویں کی طرف بڑھے، جھانک کر دیکھا، تو دہشت کی ایک لہر ان کی رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دونوں مزدور کنویں کی تہہ میں بُری طرح اچھل کود رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک ہیبت ناک انسانی کھوپڑی شیطانی انداز میں ناچ رہی تھی۔ مزدور کھوپڑی سے ٹکراتے ہی چیخ اٹھتے اور بے حال ہو کر زمین پر گر پڑتے۔ اگلے ہی لمحے کوئی غیبی طاقت انہیں دوبارہ کھڑا کر دیتی اور چیخ پکار کا خوفناک عمل دوبارہ شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے رسہ منگوایا اور اس کی مدد سے دونوں مزدوروں کو باہر نکال لیا۔ مزدور کنویں سے نکل آئے، تو کھوپڑی اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئی۔

خاصی دیر کے بعد مزدوروں کے ہوش و حواس برقرار ہوئے، لیکن وہ اپنے اچھلنے کودنے کی کوئی توجیہہ بیان نہ کر سکے۔ ڈاکٹر عبداللہ اپنے اسسٹنٹ حلیم کے ساتھ کنویں میں اتر گئے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں گولیوں سے بھرا ہوا پستول تھا اور انگلی لبلبی پر تھی۔ انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا۔ اگر کھوپڑی نے ذرا بھی تنگ کرنے کی کوشش کی، تو اس پر فائر کر دیں گے۔ حلیم کے پاس ایک تھیلا تھا۔ ڈاکٹر اور حلیم ڈرتے ڈرتے، پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے ہوئے کھوپڑی کے پاس پہنچ گئے۔ پھر ڈاکٹر نے ہاتھ آگے بڑھا کر بڑی تیزی سے کھوپڑی کو دبوچ لیا اور حلیم کے تھیلے میں ڈال دی۔ اب وہ واپس باہر آنے کے لیے مڑے۔ اچانک ڈاکٹر کا پاؤں ایک نرم جگہ میں دھنسا اور پھر کسی سخت سی چیز سے ٹکرا کر رک گیا۔ ڈاکٹر نے پھرتی سے اپنا دھنسا ہوا پاؤں نکالا۔ کدال کی مدد سے نرم زمین کھودی گئی۔ صرف دو فٹ نیچے اچھا خاصا قبرستان موجود تھا۔ حلیم مارے خوف سے لرزنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی اور کھوپڑیاں اور بوسیدہ انسانی اعضا جمع کرنے لگا۔ چند منٹ بعد بہت سی کھوپڑیاں، مسخ شدہ انسانی اعضا اور بوسیدہ ڈھانچے تھیلے میں بند کر کے وہ دونوں خیمے میں لوٹ آئے۔

رات کافی بیت چکی تھی، مگر ڈاکٹر عبداللہ کے خیمے میں لالٹین ابھی تک روشن تھی۔ انہوں نے ایک بڑے سے میز پر کنویں سے لائی ہوئی کھوپڑیاں اور دوسرے انسانی اعضا ترتیب



سے لگا دیے تھے اور خود کرسی پر بیٹھے مختلف اعداد کی جمع تفریق میں مشغول تھے۔ قریب ہی ان کی بیٹی فوزیہ اپنے بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔ لالٹین کی مدھم پیلی روشنی میں ڈاکٹر عبداللہ جونہی کسی عضو کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسرے مقام پر رکھتے، خیمے کے کینوس پر ہولناک سائے تیرنے لگتے، مگر ڈاکٹر ان توہمات سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے جمع شدہ اعداد کو آخری ترتیب دی، پھر ان کا ایک ضخیم کتاب میں مندرج عبارت سے موازنہ کیا۔ اس طرح ڈاکٹر ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گئے۔ سامنے میز پر رکھے ہوئے مختلف انسانی اعضا صرف نوجوان لڑکیوں کے تھے۔ قبرستان کس عہد کا تھا اور لڑکیاں کون تھیں؟ ڈاکٹر اس گتھی کو سلجھانے کی دیر تک کوشش کرتے رہے، مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ بالآخر وہ اسی دہشت سے اٹھے اور بستر پر جا کر دراز ہو گئے۔ جلد ہی انہیں نیند آ گئی۔

خیمے کی فضا میں کچھ دیر تک پُراسرار خاموشی اور خوفناک سناٹا طاری رہا، پھر باہر سے تیز ہوا کا شور سنائی دینے لگا۔ دور جنگلی جانوروں کے چیخنے چلانے اور دھاڑنے کی بے ہنگم ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں۔ شور و شغب کی یہ فضا زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ چاروں طرف دوبارہ پہلا سا سکوت چھا گیا۔ ڈاکٹر عبداللہ کے خیمے میں سوئی ہوئی فوزیہ کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے پاؤں کے تلوے سہلا رہا ہے۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے اس کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ خیمے کا دروازہ ڈوریوں کے ساتھ اچھی طرح بندھا ہوا تھا۔ خیمے میں ان دو باپ بیٹی کے علاوہ کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ فوزیہ پر ایک لمحے کے لیے خوف طاری ہوا، مگر اس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ "شاید اس نے خواب دیکھا ہے" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ اسی عالم میں اس کی نظر میز پر رکھی ہوئی کھوپڑیوں پر پڑی اور پھر۔۔۔ اس کی نظروں کے سامنے ہیولے سے ناچنے لگے۔ خیمے کی دیوار میں سے ایک سایہ ابھرتا ہوا نظر آیا جو لمحہ بہ لمحہ واضح شکل اختیار کرتا چلا گیا، پھر اس نے دیکھا ایک وجیہہ نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چمکدار آنکھیں، سفید لباس، چوغہ، لمبی لمبی انگلیاں، دراز گیسو۔ فوزیہ کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے چلانے کی کوشش کی، مگر آواز جیسے اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کے اعصاب کا تناؤ شدید تر ہو گیا۔ معاً اس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے گویائی پر مجبور کر رہی ہے۔

"آئیے، تشریف رکھیے۔" فوزیہ پُراسرار نوجوان سے مخاطب ہوئی۔

نوجوان بڑے طمطراق سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا اور فوزیہ کے بستر کے قریب پہنچ کر دونوں بازو پھیلا دیے۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے کھنچ گئے۔ یوں نظر آتا تھا وہ لپک کر فوزیہ کا گلا دبوچ لے گا۔

"تشریف رکھیے نا۔۔۔ تشریف رکھیے۔۔۔ یہ کرسی حاضر ہے۔" فوزیہ نے نوجوان سے دور سرکنے کی کوشش کرتے اور ہکلاتے ہوئے کہا۔ نوجوان کا ردِ عمل خاصا مصالحت آمیز ہو گیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلایا اور دور رکھی ہوئی کرسی کو گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

خیمے کے پُرسکوت ماحول میں کرسی گھسیٹنے کی آواز سے ڈاکٹر عبداللہ کی آنکھ کھل گئی۔

"کون ہے؟" ڈاکٹر کی پاٹ دار آواز گونجی۔

فوزیہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا، پھر اس کی نگاہیں دوبارہ کرسی پر لوٹ آئیں۔ سارے خوف کے اس کا رنگ پیلا زرد ہو گیا۔ کرسی پر نوجوان کے بجائے ایک موٹا تازہ خوفناک بلا بیٹھا تھا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ فوزیہ نے چیخ ماری اور اوندھے منہ گر کر بے ہوش ہو گئی۔

ڈاکٹر عبداللہ لپک کر اپنی بیٹی کی طرف بڑھے، اس کا جسم

بُری طرح لرز رہا تھا، ہونٹ سختی کے ساتھ ایک دوسرے سے بھنچے ہوئے تھے اور سارا جسم پسینے میں شرابور تھا، پھر وہ دروازے کی طرف پلٹے، دروازہ پوری طرح بند تھا اور ڈوریاں اُسی طرح تنی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر دوبارہ فوزیہ کے پاس پہنچے اور اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اِتنے میں قریبی خیمے کے مزدور پہنچ گئے۔ انہوں نے فوزیہ کے چیخنے اور کسی خوفناک چیتے کے غرّانے کی آوازیں اپنے کانوں سے سُنی تھیں۔ ڈاکٹر نے مزدوروں کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا: "تشویش کی کوئی بات نہیں، فوزیہ سوتے میں اکثر ڈر جاتی ہے۔" مزدور واپس تو چلے گئے، مگر رات بھر گوناگوں اندیشوں کے تانے بانے بُنتے رہے۔ اُن کا خیال تھا جلد ہی کوئی بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ وہ نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتے، مگر پولیس کے خوف نے اُن کے پاؤں باندھ رکھے تھے۔

* * * * * *

پندرھویں روز بھی کھدائی کا کام معمول کے مطابق جاری رہا۔ غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے آسمان پر بادل چھا گئے، پھر بجلی کوندنے لگی اور موسلادھار بارش ہونے لگی۔ مزدور اپنے خیموں میں دبک گئے۔ ڈاکٹر عبداللہ اور فوزیہ کچھ دیر تک مطالعہ کرنے کے بعد سو گئے۔ آدھی رات کے قریب اچانک فوزیہ کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا وہی پُراسرار ہیولیٰ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ فوزیہ کے اعصاب معطّل ہو گئے اور وہ حواس باختہ ہو گئی، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے چیخ مارنے کی کوشش کی، مگر گھگھی بندھ گئی۔ نوجوان نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا، ساتھ ہی اُس کے لب ہلنے لگے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا، مگر فوزیہ کو کوئی لفظ سُنائی نہ دیا۔ پھر اُس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے فوزیہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ فوزیہ میں نہ جانے کہاں سے قوت آ گئی، وہ اُٹھ رہی ہوئی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ فوزیہ نے دیکھا نوجوان چوتھے کنوئیں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ چوتھے کنوئیں کے اسرار سے واقف تھی۔ رات کے وقت ایک مشکوک سائے کے ساتھ وہاں جانا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا، مگر اس کے قدم خود بخود اُٹھتے چلے جاتے تھے۔ چوتھے کنوئیں کے کنارے پہنچ کر نوجوان رُک گیا۔ فوزیہ بھی ایک طرف جا کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے کنوئیں کے اندر جھانکا، پھر نہایت بھونڈے اور بے ہنگم انداز میں قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی کنوئیں کے اندر سے چھن چھن کی آواز بلند ہوئی، پھر کیا دیکھتی ہے کھوپڑیاں اُچھلتی کودتی اُوپر آ رہی ہیں۔ فوزیہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی، مگر یُوں محسوس ہوا نوجوان نے اُس کا راستہ روک لیا ہے اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے ہیں۔ اتنے میں کھوپڑیاں کنوئیں سے باہر آ گئیں اور وہ ان دونوں کے اردگرد حلقہ بنائے اُودھم مچا رہی تھیں۔ ان کا حلقہ لمحہ بہ لمحہ تنگ ہوتا جاتا تھا۔ اُس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی، مگر بدحواسی میں ایک کھوپڑی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ وہ دوبارہ اُٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی کہ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ تو اپنے بستر پر موجود تھی۔ خیمے میں لیمپ کی ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے والد ڈاکٹر عبداللہ قریب ہی مزے کی نیند سو رہے تھے۔ پردے کی ڈوریاں بدستور کسی ہوئی تھیں۔

اس روز کے بعد فوزیہ کی صحت بگڑنے لگی۔ اُس کا جسم ہر وقت بخار میں پُھنکتا رہتا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا فوزیہ کچھ دنوں کے لیے اپنی خالہ کے ہاں قاہرہ چلی جائے۔ اگلے روز ہفتہ تھا اور ڈاکٹر کو کسی ضروری کام سے دارالسیف جانا تھا، چنانچہ طے پایا وہ اُسے اتوار کی صبح کو قاہرہ چھوڑ آئے گا۔

ڈاکٹر کو کیمپ سے روانہ ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ پوسٹ مین آ گیا۔ اُس نے ایک سربمہر اور رجسٹرڈ لفافہ دیا۔ لفافے کی پیشانی پر سُرخ روشنائی سے لفظ "ذاتی" لکھا ہوا تھا۔ فوزیہ نے



لفافہ ڈاکٹر کے بستر پر رکھ دیا۔ ڈاکٹر شام ڈھلے تک نہ آئے، تو اس نے رات کا کھانا کھایا اور دوائی پی کر سو گئی۔ رات گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر واپس آئے، وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کھانا کھائے اور فوزیہ کو دیکھے بغیر بستر پر دراز ہو گئے۔

خیمے میں سکوت پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ اور فوزیہ گہری نیند سو رہے تھے۔ یکایک قریب کے جنگل سے بھیڑیوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ خیمے کے قریب آ رہی تھیں۔ یُوں لگتا تھا بھیڑیوں کے غول کے غول خیمے کی طرف بڑھ رہے ہیں، پھر آوازوں کا یہ سیلاب یکدم تھم گیا، مگر ہوا بدستور زوروں پر رہی۔ معاً ایک جھونکا آیا اور خیمے کی لالٹین بُجھ گئی، جس سے چاروں طرف ایک ناقابلِ برداشت اندھیرا پھیل گیا۔ فوزیہ کا درجۂ حرارت بڑھ گیا تھا اور بخار کی شدت سے اُس کے جسم سے آگ نکل رہی تھی۔ اُسے یُوں محسوس ہوا جیسے خیمے میں ہوا کا زوردار جھونکا آیا ہے۔ اگلے لمحے اُس نے اسی پُراسرار ہیولے کو اُبھرتا اور سُرخ سُرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھا۔

"اُف خدایا! پھر وہی مصیبت آ گئی۔" ہیولے کے چہرے پر مضحکہ خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھیں عجب شیطانی چمک سے روشن ہو گئیں۔ اُس نے دو تین لمبے قدم اُٹھائے اور فوزیہ کو گلے سے دبوچ لیا، پھر اس نے دیکھا ہیولیٰ اُسے سر پر اُٹھائے ایک گہرے اور تاریک غار میں اُتر رہا ہے۔ فوزیہ کو کیمپ میں آئے کئی ہفتے ہو چکے تھے، مگر اُس نے یہ غار پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ہیولیٰ غار کے اندر ایک کونے میں پہنچ کر رُک گیا اور اُسے زمین پر پٹخ دیا، پھر اُس نے دیکھا وہ اس شیطان کی گرفت میں ہے۔ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا، تاہم اس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا، پُوری قوت سے اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی اور پھر جیسے اس نے اُسے دھکیل کر گرا دیا۔ وہ اس کشمکش سے بُری طرح ہانپ رہی تھی، معاً باہر زور سے کوئی آہٹ ہوئی۔ وہ چونک گئی۔ اُس نے دیکھا وہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ خیمے کا پردہ بدستور ڈوریوں سے بندھا ہوا تھا، اندر اُس کے باپ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اُس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ اُس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا اور بخار اور تیز ہو گیا تھا۔ پھر اچانک اُس پر خود رفتگی کا عالم طاری ہو گیا، وہ بستر سے اُٹھی، خیمے کے پردے کی ڈوریاں کھولیں اور ایک کُرسی اُٹھا کر باہر نکل گئی۔

پچھلی رات کو ڈاکٹر عبداللہ کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے محسوس کیا اُن کی کمر کے نیچے کوئی سخت سی چیز رکھی ہوئی ہے۔ بستر کو ٹٹولا، تو ایک بڑا سا لفافہ پڑا تھا۔ رات کو دارالسیف سے ڈاکٹر اتنے تھکے ہوئے آئے تھے کہ اس لفافے ہی پر لیٹ کر سو گئے۔ جلدی سے لالٹین روشن کی، غور سے لفافے کو دیکھا۔ لفافہ قاہرہ سے قدیم تحریروں کے ماہر رضوان نے بھیجا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے جلدی جلدی چاک کیا۔ کاغذات کا ایک پلندہ اندر سے نکلا، ساتھ چمڑے کے وہ ٹکڑے بھی تھے جو اشرفیوں سے بھرے ہوئے صندوق سے برآمد ہوئے تھے۔ رضوان نے چمڑے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ لی تھی اور اپنی رپورٹ بھیجی تھی۔ اُس نے لکھا تھا:

"چوتھے کنوئیں کی گہرائی میں موجود قدیم عمارت طوفو سردار کا محل ہے۔ یہ شخص آج سے کئی صدیاں پہلے اس محل میں رہتا تھا۔ اس کے پاس دولت کے انبار موجود تھے۔ دولت کی کثرت نے اُسے عیش و عشرت میں ڈال دیا۔ اس کی راتیں نوجوان عورتوں کے ساتھ گزرتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ہوسناکی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے ہاتھوں کسی نوجوان عورت کی عزّت محفوظ نہ رہی۔ اس کے کارندے شکاری کتوں کی طرح منڈلاتے رہتے اور طوفو جس عورت کی طرف اشارہ کرتا، اُسے دبوچ کر لے آتے۔ ہر رات ایک نیا بدنصیب شکار اُس کی ہوس کا نشانہ بنتا اور صبح ہوتے ہی موت کے گھاٹ اُتر جاتا۔ بالآخر اس کی نظر شہر کے حاکم کی جواں سال بیٹی شیبا پر پڑی۔ طوفو کے کارندے ایک تاریک اور طوفانی رات میں شیبا کو اٹھا کر لے آئے۔ لڑکی نے اپنے بچاؤ کو اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



خبیث انسان نما درندے سے بچانے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ خوفو رات بھر داد عیش دیتا رہا، صبح اُٹھ کر حسبِ معمول اُسے قتل کرا دیا۔ لوگوں میں اپنی لڑکیوں کے گم ہو جانے پر خوف و ہراس تو پہلے ہی پھیلا ہوا تھا، حاکمِ شہر کی بیٹی گم ہوئی تو کہرام مچ گیا۔ پولیس حرکت میں آگئی۔ واقعات کی کڑیاں ملنے لگیں، جلد ہی سردار خوفو کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ الزام صحیح ثابت ہوا۔ عدالت نے فیصلہ سنایا، خوفو سردار کو زندہ درگور کر دیا جائے۔ فیصلہ سُننے کے بعد خوفو نے عدالت سے استدعا کی: مجھے اپنی عالی شان حویلی میں دفن کیا جائے۔ عدالت نے اُس کی یہ درخواست منظور کر لی، چنانچہ خوفو کو جیتے جاگتے ایک خوبصورت اور منقش قبر میں دفن کر دیا گیا۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق اُس کی دولت کا دسواں حصہ اشرفیوں کی صورت میں ایک بڑے سے صندوق میں بھر کر ان کے اُوپر چمڑے کے کاغذات رکھ دیے گئے جن پر خوفو کے سوانح حیات درج تھے۔

ڈاکٹر نے رپورٹ پڑھ کر ایک طرف رکھ دی۔ لالٹین بجھانے سے پہلے اُس نے خیمے کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر فوزیہ کے بستر پر پڑی تو اوسان خطا ہو گئے۔ بستر خالی پڑا تھا۔ خیمے کے پردے کی طرف دیکھا، وہ کھلا تھا۔ "فوزیہ" وہ چیختے ہوئے باہر نکلے، مگر باہر خوفناک سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر نے پھر چیخ چیخ کر آوازیں دیں: "فوزیہ، فوزیہ" مگر ان کی ہر پکار سناٹے میں ڈوب کر رہ گئی، کہیں سے کوئی جواب نہ ملا، البتہ کیمپ میں ہلچل مچ گئی، لوگ بھاگم بھاگ ڈاکٹر کے خیمے پہنچے اور پھر فوزیہ کی تلاش میں چاروں طرف پھیل گئے۔ صبح طلوعِ آفتاب کے وقت کچھ لوگوں نے دیکھا، فوزیہ کی لاش ایک درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے اپنے دوپٹے کا پھندا اُس کے گلے میں تھا، ایک گُرسی ایک طرف گری پڑی تھی۔ فوزیہ کا چہرہ کالا سیاہ اور سخت ڈراؤنا ہو گیا تھا جیسے اُس نے کربناک اذیت سے جان دی ہو۔ ڈاکٹر عبداللہ کے خیمے پر لاش لائی گئی، تو اپنی اکلوتی بیٹی پر نظر ڈالتے ہی ایک ہوک سی اُن کے سینے میں اُٹھی اور پھر جیسے کسی نے اُن کے دل کو اپنے چنگل میں دبوچ لیا، وہ بے ہوش ہو کر گرے اور اگلے ہی لمحے اُن کی جان ہوا ہو گئی۔

پولیس کی چوکی کیمپ کے قریب پہلے ہی سے قائم تھی خبر سُنتے ہی پولیس کے سپاہی ڈاکٹر عبداللہ کے خیمے پر پہنچ گئے۔ فوزیہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔ پولیس افسر نے ڈاکٹر کے خیمے کا جائزہ لیا۔ ماہرِ تحریر رضوان کی رپورٹ پڑھ کر اسسٹنٹ حلیم نے کہا آثارِ قدیمہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ فوزیہ کے کاغذات میں اُس کے ہاتھ کی ایک ڈائری مل گئی۔ اس میں پچھلے دو تین ہفتوں سے جو کچھ اُس کے ساتھ پیش آ رہا تھا، اُس کی تفصیلات تاریخ وار درج تھیں۔ ایک ہیولے اور خوفناک بلے کا ذکر تقریباً ہر تاریخ میں تھا۔ ایک دن پہلے کی تاریخ میں کھوپڑیوں کے رقص کا تذکرہ بھی تھا۔ سب لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ فوزیہ واہمے کا شکار ہو گئی۔

کھدائی کا کام کئی روز تک بند رہا۔ کیمپ کی فضا سوگوار ہونے کے ساتھ ساتھ دہشت ناک بھی تھی۔ آخر حکومت اور پولیس کے دباؤ سے مزدوروں نے ڈرتے ڈرتے پھر کام شروع کیا۔ اب حلیم کی ساری توجہ اس منقش قبر پر مرکوز تھی جس کا ذکر رضوان نے بھی کیا تھا۔ اُس نے مزدوروں سے کہا اس قبر کو گرا دو، لیکن کسی کو حوصلہ نہ ہوا۔ اُنہیں متذبذب دیکھ کر وہ خود آگے بڑھا، ایک مزدور سے کدال لی اور تختۂ قبر کے شکستہ حصول پر تابڑ توڑ ضربیں لگانے لگا۔ جلد ہی پتھر ٹوٹ کر الگ ہو گئے اور قبر کھل گئی۔ حلیم نے ایک نظر اندر ڈالی، تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اندر ایک خوفناک بلا مُردہ پڑا تھا۔ شاید قبر کھودتے وقت ایک ضرب اُس پر بھی لگ گئی تھی، مگر وہ کہاں سے آیا تھا؟ ایک نوجوان کا ہیولیٰ اور کھوپڑیوں کا رقص تو وہمی دماغ کی اختراع ہو سکتا ہے مگر یہ بلا . . . . . ؟ اور پھر حلیم سوچنے لگا کہیں وہ بھی تو وہم کا شکار نہیں ہو رہا؟

ایک عجیب و غریب قتل کی

پُراسرار روئداد

# پُراسرار قتل

عجیب کہانی

"آپ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اپنے آپ کو غم اور غصے کے اثرات سے محفوظ رکھیں" ڈاکٹر مینل نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

مسز بارٹر کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا، اس قسم کی باتوں سے اطمینان کے بجائے اس کے شک و شبہے میں اضافہ ہوا ہے۔

"آپ کا دل بے شک کمزور ہے، مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں" ڈاکٹر نے بات جاری رکھی: "بہرحال آپ اپنے مکان میں لفٹ ضرور لگوا لیں۔ کیوں! آپ کا کیا خیال ہے؟"

ڈاکٹر مینل غریبوں کے بجائے امیروں کا علاج کرنا بے حد پسند کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ امیر لوگ اس کی ہدایات پر بلاچون وچرا عمل کرتے۔

"ہاں تو، لفٹ ضروری ہے" ڈاکٹر نے اپنا سامان لپیٹتے ہوئے کہا: "اس طرح آپ محنت اور تھکاوٹ سے بچ جائیں گی۔ تھوڑی سی ورزش بُری نہیں، لیکن سیڑھیاں چڑھنے سے اجتناب کریں اور سب سے اہم یہ کہ اپنے دل و دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالیں بس یہی طریقہ ہے اپنی صحت کو زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنے کا۔"

ڈاکٹر، مسز بارٹر کے بھتیجے کو ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا: "گو آپ کی آنٹی کی صحت بہت خراب ہے اور دل کمزور ہو چکا ہے، لیکن پرہیز اور ہدایات پر عمل کر کے خاصے عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں۔ انہیں پُرسکون زندگی گزارنی چاہیے۔ ہر وقت مصروف رہنا چاہیے اور زیادہ سوچ بچار نہ کریں، زیادہ سے زیادہ خوش رہیں تاکہ خیالات بٹے رہیں . . . آخر میں ایک بات یاد رہے کوئی معمولی سا صدمہ بھی جان لیوا ہو سکتا ہے۔"

چارلس بہت ہی سُلجھے ہوئے دماغ کا نوجوان تھا۔ خدا نے اسے عقل و ہمت کی بے پناہ توفیق دی تھی۔ ڈاکٹر کے الفاظ سے اس کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں اُمڈ آئیں۔

اسی شام چارلس نے گھر میں ریڈیو سیٹ لگوانے کی تجویز پیش کی تاکہ آنٹی کا دل بہلا رہے۔ مسز بارٹر نے مخالفت کی۔ وہ پہلے ہی فکرمند تھیں کہ لفٹ پر خاصے اخراجات اُٹھیں گے لیکن چارلس بضد رہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"مجھے نئے زمانے کی چیزیں بالکل پسند نہیں۔" مسز بارٹر نے کہا: "ممکن ہے برقی لہریں میرے دل و دماغ پر اثر انداز ہوں۔"

"آنٹی، آپ کا خیال غلط ہے۔ ریڈیو دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ اس کی موجودگی آپ کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرے گی۔" چارلس نے جواب دیا۔

مسز بارٹر کو بالآخر رضامند ہونا پڑا اور رغبت کے ساتھ ہی ساتھ ایک ریڈیو سیٹ بھی گھر میں آ گیا۔ چارلس نے آنٹی کو ریڈیو کے تمام رموز اچھی طرح سمجھا دیے۔ وہ بے حد خوش تھی کہ سعادت مند بھتیجا اس کا بے حد خیال رکھتا ہے، چنانچہ وہ بھی چارلس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ قبل ازیں مسز بارٹر نے اپنی ایک بھتیجی میری کو اپنے پاس رکھا اور اسے وارث بنانا چاہتی تھی، لیکن میری نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کیا۔ وہ اپنی آنٹی کو خوش نہ کر سکی۔ بچی سے محبت کرنے میں وہ ہمیشہ بخل سے کام لیتی اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی۔ بعد ازاں اس نے ایک ایسے نوجوان سے شادی کر لی جس کو مسز بارٹر ناپسند کرتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ مسز بارٹر نے اسے ماں کے پاس بھیج دیا۔ بھتیجیوں کو نااہل سمجھ کر اس نے اپنی توجہ بھتیجوں کی طرف مبذول کی۔ چارلس کو وہ پہلے ہی سے پسند کرتی تھی۔ وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا، گزرے ہوئے دور کے تذکرے بڑی دلچسپی سے سنتا اور ہمیشہ اس کو آرام پہنچانے کی فکر میں رہتا۔ مسز بارٹر بھی اس کی سعادت مندی پر پھولے نہ سماتی۔ جب پوری طرح مطمئن ہو گئی، تو انہوں نے اپنے وکیل کو نیا وصیت نامہ تیار کرنے کو کہا۔ تھوڑے دنوں میں وصیت نامہ تیار ہو گیا اور مسز بارٹر نے دستخط کرنے کے بعد اسے وکیل کی تحویل میں دے دیا۔

ریڈیو کی بدولت مسز بارٹر بے حد خوش رہنے لگی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی ریڈیو کے پاس آ بیٹھتی اور دنیا بھر کے اسٹیشن سنتی۔ یہ خوشی بھی چارلس کی مرہونِ منت تھی، اس لیے اس کے دل میں اپنے بھتیجے کی محبت گویا گھر کر گئی۔

(۲)

گھر میں ریڈیو آئے تقریباً تین ماہ گزرے تھے کہ ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ چارلس کسی برج پارٹی میں گیا ہوا تھا۔ مسز بارٹر کمرے میں اکیلی تھی اور ریڈیو کے سامنے بیٹھی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اچانک موسیقی کا پروگرام بند ہو گیا اور کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی، پھر کسی مرد کی صاف اور شستہ آواز سنائی دی:

"میری، کیا تم میری آواز سن رہی ہو، میں بارٹر بول رہا ہوں . . . . . میں بہت جلد تمہیں لینے آ رہا ہوں، تیار رہنا۔ تیار رہو گی نا؟"

اس کے بعد موسیقی کا پروگرام پھر شروع ہو گیا۔ مسز بارٹر کرسی پر حیران و ششدر بت بنی بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کیسی ہے۔ کہیں میں نے کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھا۔ ریڈیو سے بارٹر کی آواز کیسے آ سکتی ہے؟ اس کو مرے تو عرصہ گزر گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ پھر خیال آیا یہ میرے کمزور دل کا نتیجہ ہے، ممکن ہے بڑھاپے کی اعصابی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوا ہو؟ تاہم اس نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے بھی نہ کیا اور اسے بھلا دینا چاہا، لیکن یہ کچھ ایسی نوعیت کا تھا کہ لاکھ کوشش کے باوجود ذہن سے محو نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہے۔

کچھ عرصے بعد اسی قسم کا دوسرا واقعہ پیش آیا۔ اب کے بھی وہ کمرے میں بالکل تنہا تھی۔ ریڈیو پر آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اچانک خاموشی چھا گئی اور دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی:

"بارٹر تم سے مخاطب ہے۔ میں تمہیں لینے کے لیے اب بہت جلد آنے والا ہوں۔"

آرکسٹرا پھر پہلے کی طرح پورے زور شور سے بجنے لگا۔ مسز بارٹر نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ رات کے دس بج چکے تھے



اس نے اپنے بازو پر چٹکی لی تو یقین ہوا کہ وہ بیدار ہے، جو کچھ اس نے سنا ہے بیداری کے عالم میں سنا ہے اور اس کے مرحوم شوہر نے اس کے ساتھ بات چیت کی ہے۔ چارلس نے خلائی لہروں کے متعلق جو لیکچر دیا تھا اس کے الفاظ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ اس نے سوچا ممکن ہے کوئی بھٹکی ہوئی لہر آسمان تک پہنچ گئی ہو اور بارٹر کی روح نے اس کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کر کے ہونے والے واقعہ کی اطلاع دی ہو۔ مسز بارٹر نے گھنٹی بجائی، اس کی خادمہ الزبتھ حاضر ہوئی۔

"الزبتھ، میری الماری کی بائیں ہاتھ والی دراز میں سب سامان تیار ہے، اس کی چابی اپنے پاس رکھو۔" مسز بارٹر نے ہولے سے کہا۔

"کونسا سامان تیار ہے مادام؟" الزبتھ نے دریافت کیا۔

"میری تجہیز و تکفین کا۔" مسز بارٹر نے کہا: "کیا تمہیں یاد نہیں سامان ٹھیک ٹھاک کرنے میں تم نے میری مدد کی تھی؟"

"مادام، ایسا خیال دل میں نہ لائیے، اب تو آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔" الزبتھ نے روتے ہوئے کہا۔

"ہر شخص کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔" مسز بارٹر فلسفیانہ انداز میں کہنے لگی: "میری عمر اب ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی ہے۔ تم بے وقوف ہو کہ روتی ہو، بھلا بڑھاپے کے بعد بھی کسی پر جوانی کے دن آتے ہیں؟ زندگی کا تو فقط ایک ہی انجام ہے، اور وہ ہے موت۔ اس منزل تک سب کو جانا ہے۔"

الزبتھ روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ مسز بارٹر نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ "بہت خدمت گزار اور مخلص عورت ہے، اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔" مسز بارٹر نے دل میں سوچا، "نہ معلوم وصیت میں اس کے لیے میں نے کتنے پونڈ چھوڑے ہیں، غالباً پچاس۔ اس کو سو پونڈ ملنے چاہئیں۔ یہ میرے پاس عرصے سے کام کر رہی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا

دوسرے دن مسز بارٹر نے اپنے وکیل کو خط لکھا کہ "وصیت نامہ بھیج دے وہ دیکھنا چاہتی ہے اور الزبتھ کے لیے زیادہ رقم درج کرنا چاہتی ہے۔

اسی دن دوپہر کے کھانے کے دوران میں چارلس نے ایک حیرت انگیز بات کہی:

"آنٹی۔" چارلس نے پوچھا: "اسٹڈی کے کمرے میں انگیٹھی پر کس شخص کی تصویر رکھی ہوئی ہے، خود پہنے بڑی بڑی مونچھوں والا یہ آدمی تو بالکل مسخرہ لگتا ہے۔"

"یہ تمہارے چچا بارٹر کی جوانی کی تصویر ہے۔" مسز بارٹر نے کہا۔

"آنٹی مجھے معاف کر دیجیے، میں نے چچا کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے۔ دراصل مجھے اس بات پر حیرت ہے . . . . ." چارلس ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"چارلس، تمہیں کس بات پر حیرت ہے؟ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" مسز بارٹر نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں آنٹی، میرا خیال ہے مجھے دھوکا ہوا ہے۔" چارلس نے مبہم سا جواب دیا۔

"چارلس، میری خواہش ہے جو بات تم کہتے کہتے رک گئے تھے وہ مجھے بتاؤ۔" مادام نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"چچی جان، ایسی کوئی بات نہیں، آپ کو بالکل فکرمند نہیں ہونا چاہیے، میرا خیال ہے کہ یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔" چارلس نے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔

"چارلس، میں حکم دیتی ہوں کہ میری بات کا جواب دو۔" مادام نے قدرے غصے میں کہا۔

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہونے لگیں چچی جان، دراصل بات یہ ہے کہ میں نے تصویر والے آدمی کو پچھلی رات دیکھا ہے۔ وہ کونے والا کمرہ ہے نا، اس کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ صبح میری نظر تصویر پر پڑی۔ میں نے فوراً پہچان لیا، وہ شخص اس انگیٹھی والی تصویر سے حیران کن مشابہت رکھتا تھا۔ ممکن ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



یہ سب نظر کا دھوکا ہو لیکن چچی جان، پہلے تو مجھے ایسا دھوکا کبھی نہیں ہوا۔ ۔ ۔ "

"تم نے انہیں کونے والے کمرے میں دیکھا تھا؟" مسز بارٹر نے دوبارہ دریافت کیا۔

وہ بے حد حیران تھی، کونے والا کمرہ اس کے شوہر کا ڈریسنگ رُوم تھا۔ اس نے سوچا شاید اس کے خاوند کی رُوح ابھی تک ڈریسنگ رُوم میں موجود ہے۔

شام کے وقت چارلس گھر میں نہ تھا۔ مسز بارٹر بے چینی کے عالم میں ریڈیو کے پاس بیٹھی پراسرار آواز کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا تیسری بار بھی وہی آواز آئی، تو اس بات میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ اب وہ دُنیا میں چند روز کی مہمان ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور جب ریڈیو کا پروگرام بند ہو گیا، تو اسے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آرزش لیجے میں بہت دُور سے آتی ہوئی مخصوص آواز سنائی دی:

"میری، میرا خیال ہے تم بالکل تیار ہو۔ ۔ ۔ ۔ میں جمعہ کو آؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ رات کے نو بجے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈرنا مت۔ ۔ ۔ ۔ تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ۔ ۔ بس تیار رہنا!"

پھر فوراً ریڈیو پروگرام شروع ہو گیا۔ مسز بارٹر کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا — بڑی مشکل سے اٹھی اور لکھنے کی میز پر جا بیٹھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا:

"آج رات ٹھیک نو بجے میں نے صاف طور پر اپنے مرحوم شوہر کی آواز سُنی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جمعہ کی رات کو نو بجے مجھے لینے آئے گا — اگر اس روز میں مر جاؤں، تو میری خواہش ہے کہ اس سب لوگوں سے کر دیا جائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ رُوحوں کی دُنیا سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔"

اس نے ایک بار تحریر کو غور سے پڑھا، اسے لفافے میں بند کیا اور گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد الزبتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ مسز بارٹر کرسی سے اٹھی۔ لفافہ الزبتھ کو دیا اور بولی:

"الزبتھ، اگر جمعہ کی رات کو میں مر جاؤں، تو یہ لفافہ ڈاکٹر مینل کو دے دینا۔ اس سلسلے میں مجھ سے کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی ہوں — ہاں! میں نے اپنے وصیت نامے میں تمہارے لیے پچاس پونڈ چھوڑے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تمہیں سو پونڈ ملیں۔ اگر میں مرنے سے پہلے بنک نہ جا سکی، تو چارلس میرے مرنے کے بعد انتظام کر دے گا۔"

دوسرے روز مسز بارٹر نے چارلس سے کہا: "اگر اس کو کوئی حادثہ پیش آ جائے، تو الزبتھ کو مزید پچاس پونڈ دے دیے جائیں۔"

"چچی آپ کو وہم ہو گیا ہے۔" چارلس نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "آپ بالکل صحت مند ہیں۔ میری دعا ہے کہ ہم آپ کی نوویں سالگرہ منائیں۔"

مسز بارٹر نے چارلس کو کوئی جواب نہ دیا، صرف مُسکراتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی: "چارلس، جمعہ کی شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میرے ایک دوست نے برج کھیلنے کی دعوت دی ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں گھر پر رہوں، تو نہیں جاؤں گا۔" چارلس نے کہا۔

مسز بارٹر نے کہا: "نہیں، نہیں، میری یہ خواہش نہیں، میں اس رات بالکل تنہا رہنا چاہتی ہوں۔"

٭ ٭ ٭

جمعہ کی شام گھر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مسز بارٹر معمول کے مطابق کرسی پر انگیٹھی کے قریب بیٹھی تھی۔ وہ کوچ کی تیاری کر چکی تھی۔ صبح بنک بھی گئی اور پچاس پونڈ نکلوا کر الزبتھ کو دے دیے — مادام نے اپنی تمام چیزیں ٹھیک کر کے رکھ دی تھیں۔



اس نے ایک بڑا سا لفافہ کھولا اور اندر سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ یہ وصیت نامہ تھا جو اس کے وکیل نے ہدایت کے مطابق بھیجا تھا۔ ایک بار پڑھ لینے کے بعد دوبارہ غور سے نظر ڈالی۔ یہ ایک مختصر سا مراسلہ تھا جس میں اُس نے پچاس پونڈ کا تذکرہ الزبتھ کے نام اور پانچ پانچ سو پونڈ کے دو تہہ کے دو بہنوں کے نام چھوڑے تھے اور باقی سب کچھ اپنے پیارے بھتیجے چارلس کے نام لکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا سر کئی بار ہلایا۔ وہ سوچ رہی تھی اس کی وفات کے بعد چارلس بہت امیر آدمی بن جائے گا۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، نو بجنے میں تین منٹ باقی تھے، وہ بالکل تیار تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آخر نو بج گئے۔ اس نے بے چینی سے ریڈیو کا بٹن دبا دیا، وہ آج پھر اس خصوصی آواز کی منتظر تھی، لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی، تھوڑی دیر بعد پھر وہی آواز آئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر آنے والا چلتے چلتے رُک گیا اور دروازہ آہستہ سے کھلا۔ خوف سے مسز بارٹر کا جسم کانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں اُدھ کھلے دروازے پر جم گئیں۔ دفعتاً اس کا ہاتھ لڑکھڑایا اور وصیت نامہ سامنے جلتی ہوئی انگیٹھی میں جا گرا۔ اس کے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکلی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں ایک جانی پہچانی صورت کھڑی تھی: "آخر بارٹر اس کو لینے کے لیے آ ہی گیا۔" اس کا دل ڈوبنے لگا اور وہ کرسی سے گر پڑی۔

ڈاکٹر مینل کو بلایا گیا۔ چارلس کو بھی برج پارٹی پر اطلاع دی گئی، لیکن دوا دارو کرنے سے پہلے ہی اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ چچی کی موت چارلس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔

دوسرے دن الزبتھ نے مسز بارٹر کا خط ڈاکٹر مینل کو دیا۔ ڈاکٹر نے بڑی دلچسپی سے اسے پڑھا اور کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے، تمہاری مالکہ اپنے شوہر کو تصور میں دیکھا کرتی تھی اور اُس سے باتیں کرتی تھی۔ اسی وجہ سے اُس کی موت ہوئی۔"

اگلی رات جب گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ بے خبر سو رہے تھے، چارلس آہستہ سے اٹھا اور چوری چھپے اپنی چچی کے کمرے میں گیا اور ایک تار جو ریڈیو کے کیبن سے اس کے کمرے تک چلا گیا تھا، الگ کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ شام کو سخت سردی تھی، چارلس نے اپنے کمرے میں آگ روشن کی اور اپنی مصنوعی داڑھی اور مونچھیں اس میں پھینک دیں اور اپنے چچا کے کچھ پُرانے کپڑے ایک صندوق میں چھپا کر رکھ دیے۔ ریڈیو کی اسکیم چارلس کے زرخیز ذہن میں اس وقت پیدا ہوئی جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ کوئی معمولی سا واقعہ بھی مسز بارٹر کی جان لے سکتا ہے۔ بہر حال اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ مسز بارٹر کی تجہیز و تکفین بخیر و خوبی ہو گئی اور چارلس پر کسی کو شک بھی نہ گزرا۔

چند روز بعد الزبتھ نے چارلس کو اطلاع دی کہ مسز بارٹر کا وکیل ملنے آیا ہے۔ چارلس تو اس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس نے وکیل کو خوش آمدید کہا۔ وکیل ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

"مسٹر چارلس، آپ نے جو خط میرے نام لکھا، میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ آپ کو شاید یہ خیال ہے کہ مسز بارٹر کا وصیت نامہ میرے پاس ہے۔"

"ہاں، میرا تو یہی خیال ہے۔" چارلس نے کہا: "چچی نے مجھے یہی بتلایا تھا۔"

"انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا، ان کا وصیت نامہ پہلے میرے پاس ہی تھا۔" وکیل نے جواب دیا۔

چارلس نے بے چینی سے کہا: "کیا مطلب؟ پہلے پاس تھا اور اب نہیں؟"

"جی ہاں۔" وکیل نے جواب دیا: "مسز بارٹر نے مجھے لکھا تھا کہ وصیت نامہ ان کو واپس بھیج دیا جائے۔"

یہ سُن کر چارلس بے چین ہو گیا۔

وکیل نے پوچھا: "کیا آپ نے ان کی ذاتی چیزوں میں وصیت نامہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



# گمشدہ دن

ڈبلیو ایف ہاروے

"تو کیا مجھے کسی شیطانی قوت نے اپنا آلۂ کار بنایا تھا... نہیں نہیں... ایسا نہیں ہوسکتا" وہ بڑبڑایا۔





تلاش کیا ہے؟"

چارلس نے جواب دیا "جی ہاں، الزبتھ نے ان کی ذاتی چیزوں میں کافی تلاش کیا، مگر نہیں ملا۔"

وکیل نے الزبتھ کو بلایا۔ الزبتھ نے بتایا کہ مسز بارٹر کی وفات کے بعد اس نے انگیٹھی میں جلے ہوئے کاغذ اور لفافے کی راکھ دیکھی تھی۔

چارلس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

وکیل کچھ سوچ کر کہنے لگا "میرا خیال ہے آخری دنوں میں مادام آپ سے ناراض ہوگئی ہوں گی، چنانچہ انہوں نے وصیت نامہ نذر آتش کرنے کے لیے واپس منگوا لیا۔"

"جی نہیں، وہ آخر تک مجھ سے بے حد خوش تھیں۔" چارلس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

دفعتاً چارلس کی آنکھوں میں چچی بارٹر کی موت کا منظر گھوم گیا۔ مسز بارٹر ایک ہاتھ سے اپنا دل پکڑے بیٹھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے ایک کاغذ پھسل کر دہکتی ہوئی آگ میں جا گرا۔ چارلس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں وکیل سے پوچھا "اگر وصیت نامہ نہ ملا، تو کیا ہوگا؟"

وکیل نے جواب دیا "ان کے پرانے وصیت نامے پر عمل درآمد کیا جائے گا جس کی رو سے ان کی تمام جائیداد کی وارث ان کی بھتیجی میری ہے۔"

وکیل کے جانے کے بعد چارلس بے حد پریشان نظر آتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اس کی تمام ہوشیاری اور چالاکی میری کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ وہ خیالات میں غرق تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر مینل کا فون تھا، وہ کہہ رہا تھا "مسز بارٹر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ اس کا دل بے حد کمزور ہوچکا تھا اور وہ اس ناکارہ دل کے سہارے زیادہ سے زیادہ صرف دو ماہ تک زندہ رہ سکتی تھی۔"

چارلس نے سر پیٹ لیا۔ کاش اس نے دو ماہ انتظار کر لیا ہوتا۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا، اپنی چچی کو ریڈیو کے ذریعے قتل کر کے میں نے بھیانک گناہ کیا ہے۔ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی —— ذہن پر ہر وقت خیالات کا ہجوم رہتا۔ رفتہ رفتہ وہ اعصابی بیماری کا شکار ہوگیا! ایک روز ایسی ہی پریشانی کے عالم میں ایک تحریر تیار کی جس میں اس نے ایک کاغذ پر لکھا: "میری چچی اپنی موت نہیں مری تھی، بلکہ میں نے قتل کیا تھا۔" پھر پوٹاشیم سائنائڈ کا ایک چمچ حلق میں انڈیل لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے اپنے مکان کا جنوبی کاریڈور بہت پسند ہے، شاید اس لیے کہ جس تنہائی، سکون اور یکسوئی کی مجھے ضرورت ہوتی ہے، وہ یہیں نصیب ہوتی ہے۔ آپ ... جانتے ہی ہیں کہ ایک پڑھنے لکھنے کا شغل رکھنے والے شخص کے لیے تنہائی اور یکسوئی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ میں یقیناً اس اعتبار سے بے حد خوش بخت آدمی ہوں کہ مجھے ایسا مکان مل گیا ہے جس کا جنوبی کاریڈور نہایت پُرسکون ہے۔ میں نے اپنی میز یہیں لگا رکھی ہے اور پُرسکون ماحول میں کسی قسم کی دخل اندازی کے بغیر میں اس جگہ گھنٹوں لکھتا اور پڑھتا رہتا ہوں۔ اوّل تو یہاں مجھے تھکن کا احساس ہی کم ہوتا ہے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو میں فوراً اُس کھڑکی کے نزدیک جا کھڑا ہوتا ہوں جو باغ کی جانب کھلتی ہے ــــ باغ خاصا وسیع و عریض ہے اور اس میں طرح طرح کے پھول پودے اور درخت لگے ہیں۔ میں ہمیشہ اس باغ کی تازگی اور شادابی کا خیال رکھتا ہوں اور اسی لیے یہ باغ بھی میرا خیال رکھتا ہے۔ چند لمحے باغ کا نظارہ آنکھوں میں طراوت اور دماغ میں فرحت بھر دیتا ہے۔ میں دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنی میز پر آ جاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

آپ پوچھیں گے میں ان دنوں کیا لکھ رہا ہوں۔ جناب! اپنی آپ بیتی قلم بند کر رہا ہوں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میری زندگی عجیب و غریب واقعات و حوادث سے بھری ہوئی ہے۔ اب اتنے برس بیت جانے کے بعد اوراق اُلٹتا ہوں تو خود مجھ پر تحیّر کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور بعض اوقات یقین ہی نہیں آتا کہ یہ واقعات مجھ پر گزرے ہیں۔ انہی پُراسرار اور تحیّر خیز واقعات میں سے ایک واقعہ مجھے ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے اور ہزاروں مرتبہ اُس پر سوچ بچار کرنے کے باوجود میں اس کی توجیہ نہیں کر پایا۔ جتنا غور و فکر کرتا ہوں، اُتنا ہی اُلجھتا جاتا ہوں اور اس اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا میرے ہاتھ نہیں آتا۔ اگر آپ سُننا چاہیں تو عرض کیے دیتا ہوں۔

اُن دنوں میں جنوبی انگلستان کے ایک خوبصورت، لیکن قدرے غیر آباد علاقے کے ایک گرجے میں جونیئر پادری تھا۔ بڑے پادری کا نام کینن ایلڈرڈ تھا اور مجھ سے چھوٹے پادری کو فرانسس کہتے تھے۔ حقیقت میں یہ دونوں بہت نفیس آدمی تھے۔ بہت جلد ہم تینوں میں اُنسیت پیدا ہو گئی اور چونکہ چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا، اس لیے قدرتی طور پر ہم ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں بھی شریک رہتے۔ رات، کھانے کے بعد دیر تک نشست رہتی، اُس میں دُنیا جہان کی باتیں ہوتیں، فنونِ لطیفہ سے لے کر ریاست تک اور سیاست سے بھوت پریت اور رُوحوں کے قصّوں تک ہر موضوع ہماری دسترس میں ہوتا بعض اوقات ساری ساری رات انہی باتوں میں کٹ جاتی۔ کوئی فکر تھا اور نہ پریشانی۔ ایسی ہی ایک رات کا ذکر ہے۔ ہم تینوں نادیدہ مخلوقات کے بارے میں سرگرمی سے بحث کر رہے تھے۔ کینن کہہ رہا تھا: "میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں، یہ وہ راز ہے جسے اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں جانتے اور وہ یہ ہے کہ مافوق الفطرت قوّتیں خود بھی مصروفِ عمل ہوتی ہیں اور کبھی کبھی وہ ہم جیسے انسانوں کو بھی اپنا آلۂ کار بنا لیتی ہیں۔"

"بے شک! یہ بات درست ہے۔" میں نے کہا: "یہ عجیب قوّت بعض انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے ذہن پر اثر انداز ہو کر اُنہیں اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور پھر اپنے معمول سے ایسے ایسے کام لے لیتے ہیں کہ اُسے خبر تک نہیں ہوتی۔ مثلاً، ایسے افراد چاہیں تو اپنے معمول کو حکم دے کر اُس سے قتل تک کروا سکتے ہیں۔"

فرانسس حیرت زدہ ہو کر ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر اُس نے کہا: "خدا رحم کرے! یہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو؟ میں یہ بات کبھی نہیں مان سکتا... خُدا نے انسان کو زبردست قوّتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ کوئی اور مخلوق خواہ وہ کتنی ہی مافوق الفطرت کیوں نہ ہو، کسی انسان کو اپنا آلۂ کار نہیں بنا سکتی۔ انسان کو یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ رُوحوں کو طلب کر سکتا ہے اور خبیث شیطانی طاقتوں کو زیر کر لیتا ہے، بلکہ وہ چاہے تو اُن سے اپنے کام بھی نکلوا سکتا ہے... تاہم یہ ممکن نہیں کہ کوئی خبیث رُوح کسی انسان پر غلبہ حاصل کرے اور اُسے اپنے مقاصد کے تحت کام کرنے پر مجبور کر دے... البتہ میں اتنا مان سکتا ہوں کہ خبیث قوّتیں اکثر اوقات خبیث افراد کے قریب آ جاتی ہیں..."

ہم دونوں نے فرانسس کو اپنی بات پر قائل کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا ــــ آخر تنگ آ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور میں نے کہا فرانسس، بے شک تم اس وقت یہ حقیقت تسلیم نہ کرو، مگر ــــ ایک دن ایسا آئے گا جب تم اس کے قائل ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد ہماری نشست برخاست ہو گئی اور ہم اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔

٭

اگلے ہفتے مجھے سالانہ چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے یہ پروگرام طے پا چکا تھا کہ ہم تینوں باری باری چھٹیاں لے کر کہیں گھومنے جایا کرتے تھے۔ اس کے دو مقاصد ہوتے، ایک یہ کہ ہم گھوم پھر کر تفریح کر لیتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com





اور پھر سال بھر کے لیے تروتازہ ہو جاتے — اور دوسرا یہ کہ دُور دراز کے علاقوں میں ایسی جگہ منتخب کر لیتے جہاں نوجوانوں کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے لیے سالانہ کیمپ لگا سکیں۔ اب کے چھٹی کی باری میری تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ چھٹیاں ڈیونشائر میں اپنے چچا کے ہاں گزاری جائیں، اُن کے ہمراہ شکار کھیلنے جاؤں اور ساتھ ہی ساتھ کیمپ لگانے کے نقطۂ نظر سے اردگرد کے مضافات کا جائزہ بھی لے لوں؛ چنانچہ اگلی صبح میں ڈیونشائر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی کے پاس بات کرنے کے لیے بھی وقت نہ تھا، لہٰذا میں نے اگلے ہی روز کوچ کرنے اور اکیلے گھومنے پھرنے کا ارادہ کر لیا اور ایک ایسے بے رونق اور ساحلی علاقے کا انتخاب کیا جہاں کی آبادی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھی۔ دراصل ایسے ہی علاقوں کے نوجوانوں کو راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ڈنزلے تک دس دن کا واپسی ریلوے ٹکٹ لیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ ٹکٹ پر بائیس ستمبر بروز سوموار کی مُہر لگی تھی۔

میں جب ڈنزلے پہنچا تو ساحل خلافِ توقع چھوٹے چھوٹے جہازوں اور کشتیوں سے پٹا پڑا تھا جو شاید کسی طوفان کی پیش گوئی کے سبب اس چھوٹے سے ساحل پر آ لگی تھیں۔ پورے قصبے میں مچھیروں اور ملاحوں کی آمد سے رونق سی ہو گئی تھی۔ میں بھی ڈنزلے کی ایک کشتی سرائے میں ٹھہر گیا۔ یہ رات میں نے یہیں گزاری۔ اگلے روز یعنی منگل کے دن ایک مختصر سا سفری تھیلا لیے چٹانوں کے ساتھ ساتھ ساحلِ سمندر پر چلنا شروع کر دیا۔ شام کا دُھندلکا چھا جانے کے بعد مجھے ایک اجنبی کسان کی بیل گاڑی میں لفٹ مل گئی جو شیڈزہوم تک جا رہا تھا — وہاں پہنچ کر میں نے وہ رات کشتی سرائے میں گزاری جو اپنے چرچ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ اگلی صبح یعنی بدھ کے روز میرا موڈ آنے جانے کا نہ بن سکا اور میں نے اُس دن اُسی بستی کے قرب و جوار میں گھومنے پھرنے کا فیصلہ کیا۔ کشتی سرائے کے بوڑھے مالک مسٹر روفس سے ایک ڈوری بنسی اُدھار لی اور سہ پہر تک مچھلی کے شکار سے خوب جی بہلاتا رہا۔ اس سیر سپاٹے کے دوران ایسٹر کے کیمپ کے لیے بہت اچھی جگہ بھی پسند آ گئی۔ یہ جگہ ریپ مُور کہلاتی تھی۔ بدھ کی رات میں نے وہیں ریپ مُور میں گزاری اور جمعرات کو میں فرینک سٹون اینچ کی بستی میں چلا آیا اور رات کا کھانا وہاں کے گرجا گھر کے پادری کے ساتھ کھایا جو لیگی کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ بڑی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ جمعے کا دن میں نے گارٹن میں گزارا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گارٹن سرائے کی مالکہ نے طوطے کا پنجرہ اپنے کمرے میں لٹکا رکھا تھا۔ طوطا حیرت انگیز



طور پر سدھا ہوا تھا۔ دیر تک اُس دلچسپ طوطے سے باتیں کرتا رہا۔ اگلی صبح یعنی ہفتے کے روز میں ایک لمبی سیر پر نکل کھڑا ہوا۔ بہت پُرلطف سماں تھا۔ سمندر کی لہروں سے اُٹھتی ہوئی پھوار میرے چہرے سے آ کر ٹکراتی تو مجھے بہت بھلا لگتا۔ میں اس ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار سے اُس وقت تک لطف اندوز ہوتا رہا جب تک میرا راستہ مشرق کی طرف نہ مُڑ گیا اور میں اُس سڑک پر ہو لیا جو خلیج کے آخر تک جاتی تھی۔ میں ایک چھوٹے سے راستے پر چل پڑا جس پر خشک خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ راستہ استعمال نہیں ہوتا۔ دوپہر ہونے تک میں سطحِ مرتفع کی سب سے اُونچی چٹان پر پہنچ چکا تھا۔ بھوک کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور تھیلے سے سینڈوچ نکال کر کھانے لگا۔ اس کے بعد اپنی سمت کا جائزہ لینے کے لیے نقشہ نکالا، مگر اُسے پڑھنا اتنا سہل نہ تھا۔ ایک تو میں اجنبی، اور پھر تمام علاقہ ایک ہی جیسی چٹانوں اور ایک ہی جیسے راستوں سے محیط — پھر بھی میں نے مختلف نشانیوں سے اپنی پوزیشن کا اندازہ لگا ہی لیا۔ نقشے کے مطابق وہی شیڈزہوم کی بستی نزدیک ترین جگہ تھی جہاں میں رات بسر کر سکتا تھا اور جہاں میں نے منگل کی رات گزاری تھی۔ میں کسی تذبذب کے بغیر شیڈزہوم کی طرف چل دیا۔ اُس وقت دن کے دو بج چکے تھے۔

مجھے راستہ تلاش کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ راستہ چلتے چلتے اچانک بند ہو جاتا اور قوی ہیکل چٹانیں کھڑی مُنہ چڑا رہی ہوتیں، اور کبھی اچانک تین چار سمتوں میں بیک وقت رستے کھلنے لگتے اور اُن میں سے کسی ایک کا انتخاب مشکل ہو جاتا۔ میں نے اندازے کے مطابق جنوب کی طرف سفر جاری رکھا اور خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ پتھروں اور چٹانوں کے سائز میں کمی آنے لگی اور زمین ہموار ہوتی چلی گئی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ میں صحیح راستے پر چل رہا ہوں اور آبادی قریب ہے لیکن اچانک ایک ٹیلہ نمودار ہوا جو دُور تک چلا گیا تھا۔ پیدل چلتے چلتے میری ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ یہاں رات بسر کرنے کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ پھر یہ کہ میرے پاس پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے شیڈزہوم پہنچنے کے سوا اور کوئی نجات کی راہ نہ تھی۔

میں جونہی بلندی پر چڑھتی اور پھر نیچے اُترتی پگڈنڈی پر سے نیچے آیا تو ویسا ہی بڑا سا ٹیلہ پھر سامنے تھا۔ اچانک اُبھرنے سے خوف اور دہشت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تنہائی کے شدید احساس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے اُٹھتے ہوئے قدم خودبخود رُک گئے جیسے انہیں زمین نے جکڑ لیا ہو — میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میرا اگلا قدم آگے کی طرف بڑھے گا یا میں پیچھے کی طرف دوڑ لگا دوں گا۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پانے کی سرتوڑ کوشش کی، لیکن جونہی میں اُس بڑے پتھر کے پہلو سے راستہ کاٹ کر گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لاش چت پڑی ہے۔ یہ ایک سیاہ فام دراز قد جوان تھا۔ اُس کے گھنگھریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں پوری طرح کھلی جیسے کسی کو گھور رہی ہوں اور نیم وا ہونٹوں میں سے چمکیلے دانت جھانک رہے تھے۔ گردن پر ایک ریشمی اسکارف لپٹا ہوا تھا اور کانوں میں ملاحوں کی سی بالیاں تھیں۔ اُس ویرانے میں ایک لاش دیکھ کر خوف اور دہشت سے میرا بُرا حال تھا اور پسینے کے قطرے میری پیشانی سے بہہ نکلے تھے۔ اس کے باوجود میں آگے بڑھا اور لاش کو قریب سے دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اُسے مرے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں۔ اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سرد اور لٹھے کی مانند سفید تھے۔ سبز رنگ کی قمیص چیتھڑے چیتھڑے ہو چکی تھی اور لاش کا سینہ بُری طرح نوچا کھسوٹا گیا تھا۔ گھبراہٹ اور پریشانی کے باوجود میرے ذہن میں عجیب سی تشبیہ اُبھری جیسے کوئی بڑا سا طوطا پَر پھیلائے مرا پڑا ہو۔

میں نے اپنا تھیلا زمین پر رکھا اور لاش کے پاس بیٹھ کر اُس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ جونہی میں نے اُس کی کروٹ بدل کر دیکھا تو اُس کی کھوپڑی پر بہت بڑا اور گہرا زخم نظر آیا جو شاید کسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com


کنڈا لیے یا پتھر سے لگایا گیا تھا۔

میں نے پولیس میں رپورٹ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ نزدیک ترین پولیس اسٹیشن شیڈز ہوم ہی میں تھا۔ شیڈز ہوم میرے اندازے کے مطابق ابھی دس میل دُور تھا۔ اب مَیں نے دوڑنا شروع کر دیا، کیونکہ وقت سہ پہر سے بھی کچھ آگے نکل چکا تھا۔ کوئی دو تین میل کی دوڑ کے بعد چھوٹی سی ریلوے لائن دکھائی دی جو غالباً کوئلے کی کسی کان سے کوئلہ لانے والی چھوٹی ٹرین کی تھی۔ تھوڑی ہی دُور چلا ہُوں گا کہ دُور سے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ یقین کیجیے اُس خوشی کو مَیں آج تک فراموش نہیں کر سکتا جو اس وقت انجن کی وِسل سُن کر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی اور اعصاب شکن تنہائی اور سکوت کا طلسم ٹوٹ سا گیا تھا۔ میری رفتار میں کچھ کمی واقع ہو گئی تو مَیں سوچنے لگا کہ وہ بدنصیب شخص کون ہو سکتا ہے اور اس بے آباد جگہ کیا کرنے آیا تھا، اور اگر کسی اور جگہ قتل کر کے اُسے یہاں پھینکا گیا ہے تو قاتل نے اُس کی لاش اس طرح کُھلی کیوں چھوڑ دی۔ وہ اُسے آسانی سے کسی چٹان کی دراڑ یا کھوہ میں دفن کر سکتا تھا۔ اس کے لیے کسی خاص تردّد کی ضرورت بھی نہ تھی، صرف ایک چھوٹا سا گڑھا کافی ہوتا۔ سوچتے سوچتے میں شیڈز ہوم کے قریب پہنچ گیا تھا اور آبادی ایک میل سے زیادہ دُور نہ تھی۔ اچانک گرجاگھر کے گھنٹے نے سکوت توڑ دیا۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن

ہائیں! ہفتے کے روز گرجے کا گھنٹہ کیوں بج رہا ہے؟۔۔۔ شیڈز ہوم جیسی چھوٹی جگہ پر تو سیٹرڈے سروس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور تجہیز و تکفین کا انتظام بھی اتنی چھوٹی جگہوں پر شام کے وقت نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ ہفتے کی شام اور گرجے کا گھنٹہ! کیوں؟ اسی شش و پنج میں اُلجھا ہُوا آگے بڑھتا گیا۔ بستی کا بازار آ گیا تھا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام دکانیں بند ہیں اور لوگ اتوار کے مخصوص لباس میں ادھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ مَیں نے سب سے پہلے پولیس اسٹیشن تلاش کیا، یعنی اُس کانسٹیبل کا جھونپڑا جو اکیلا اس آبادی میں پولیس اور کسی حد تک عدالت کا کام سنبھالے ہُوئے تھا۔ وہ چھوٹے موٹے جھگڑے وہیں لوگوں کے سامنے نپٹا دیا کرتا تھا اور یُوں بار بار ہیڈ آفس رپورٹ کے لیے جانے سے بچ جاتا۔ آبادی میں بھی امن قائم تھا۔ کاٹیج کے دروازے پر پہنچ کر مَیں نے دستک دی تو اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت نکلی جو کانسٹیبل کی بیوی تھی۔ اُس نے بتایا کہ مسٹر کانسٹیبل گھر پر موجود نہیں اور وہ اگلی صبح آئیں گے۔ کچھ کہنے کا فائدہ نہ تھا۔ عجیب سی بات یہ کہ جس واقعے کی اطلاع دینے مَیں پاگلوں کی طرح دوڑتا ہُوا آیا تھا اُس کی اطلاع نہ دینے پر مجھے طمانیت کا احساس ہُوا جیسے میرا کوئی بہت بڑا راز افشا ہونے سے بچ گیا ہو۔ مَیں اپنی اس کیفیت پر خود ہی حیران ہوتا ہُوا سیدھا کشتی سرائے میں چلا آیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ مَیں نے دو تین مرتبہ دستک دی تب کہیں جا کر سرائے کی بُوڑھی مالکہ نمودار ہُوئی۔ اُس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ بولی: "آؤ آؤ، تمہیں جگہ مل سکتی ہے۔ اتفاق سے تمہارا پہلے والا نمبر تین کیبن خالی ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر چلے جاؤ۔ لڑکیاں باہر گئی ہُوئی ہیں، اس لیے کھانے کو جو کچھ موجود ہے تمہیں وہی لینا پڑے گا۔" "ٹھیک ہے کوئی بات نہیں" کہہ کر مَیں اُسی کیبن میں چلا گیا۔۔۔ اور مُنہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو مسز شینٹو کھانا لگا رہی تھیں۔۔۔ مَیں آتش دان کے قریب بیٹھ گیا کیونکہ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ مسز شینٹو برتن لگاتے ہُوئے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں: "دراصل ہمارے ہاں گاہک صرف موسم بہار اور سردیوں کے شروع میں آتے ہیں باقی سارا سال ہم افلاس میں کاٹتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا گاؤں بہت ہی قابلِ رحم ہے۔ ہمیں تو ایک مسافر سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہر آنے والے کی خوب پہچان ہو جاتی ہے۔ کوئی ایک مرتبہ ٹھہر جائے تو ہم اُسے پہچاننے میں تمام عمر غلطی نہیں کر سکتے، اور آپ تو پھر ابھی پچھلے منگل کو یہاں ٹھہرے تھے۔ اچھا جناب! یہ رہا آپ کا کھانا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا۔"



وہ جانے کے لیے مُڑی ہی تھی کہ مَیں نے کہا: "وہ تو سب ٹھیک ہے، مسز شینٹو! لیکن کیا بات ہے آج سرائے میں بڑی خاموشی چھائی ہُوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہفتے کی شام تو بہت رش ہوتا ہے۔"

"اتوار کو ہم زیادہ بزنس نہیں کرتے، صرف باہر سے آ کر ٹھہرنے والے مسافروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارا لائسنس چھ دن کا ہوتا ہے۔ اتوار کو ہم چھٹی کرتے ہیں۔ معاف کرنا مجھے شاید کوئی بچہ بلا رہا ہے۔ اس وقت مَیں اکیلی کام کر رہی ہُوں، لڑکیاں چرچ گئی ہُوئی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے اندر گئی لہٰذا میرے چہرے پر ان الفاظ کا ردِعمل نہ دیکھ سکی۔ "اتوار! تو آج اتوار ہے؟ عجیب۔۔۔" بازار کا سارا منظر میرے سامنے گھوم گیا جو واقعی اتوار کی نشاندہی کر رہا تھا۔ "نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ابھی صبح ہفتہ تھا اور شام کو اتوار کیسے ہو گئی؟" سامنے کیلنڈر پر نظر پڑی تو اُس کی تاریخ بدلی ہُوئی تھی۔ اتوار اٹھائیس ستمبر۔۔۔ آدھ گھنٹہ پہلے گرجاگھر کی گھنٹی بجتے ہُوئے بھی سُن چکا تھا۔ لوگ بھی ادھر اُدھر اتوار کی سی فراغت سے گھوم پھر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ آج ہفتہ نہیں ہے، مجھے غلطی لگی ہے اور پچھلے ہفتے کا کوئی ایک دن مَیں نے کہیں ضائع کر دیا، لیکن کہاں؟ مَیں نے پریشان ہو کر اپنی پاکٹ ڈائری نکالی۔ ہر تاریخ کے آگے اُس دن کا مختصر احوال درج تھا۔ میرا خیال ہے مجھے اپنے سفر کے آغاز کی تاریخ دیکھنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے اُسے درج کرنے میں مجھ سے غلطی ہُوئی ہو اور اُسی ترتیب سے مَیں ڈائری میں غلط دن نوٹ کرتا رہا ہُوں۔ مَیں نے اپنے ٹکٹ کا وہ بقیہ آدھا حصّہ نکال کر دیکھا جو چیکنگ کے بعد مجھے واپس کیا گیا تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ واقعی مَیں نے اپنا سفر بروز پیر، بائیس ستمبر کو شروع کیا تھا۔ رات ڈُرنلے میں سویا تھا اور منگل کو شیڈز ہوم کی اسی سرائے میں ٹھہرا تھا جہاں مَیں اس وقت موجود ہُوں۔

بدھ، ریپ مُور اور جمعرات، فرینک سٹون ایج میں اور جمعے کا دن مَیں نے گارٹن میں گزارا۔ اگلے دن یعنی آج صُبح ہفتے کو گارٹن سے کوچ کیا تو راستے میں لاش ملی جس کی اطلاع دینے مجھے شیڈز ہوم آنا پڑا لیکن یہاں آ کر معلوم ہُوا کہ آج اتوار ہے۔ آخر یہ سب کیا ماجرا ہے؟ میرے ہر دن کی مصروفیت کا حال میری ڈائری میں درج ہے حتّٰی کہ سرائوں کے بل وغیرہ تک موجود ہیں۔ پھر یہ پورے چوبیس گھنٹے کا ایک دن کہاں کھو دیا مَیں نے؟ مَیں سوچ سوچ کر چکرا رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھار کی چھوٹی موٹی بدحواسی کے سوا جو ہر نارمل انسان سے ہو سکتی ہے مجھ سے اتنی بڑی بدحواسی کبھی سرزد نہ ہُوئی تھی۔ مَیں بار بار گزشتہ ہفتے کی مصروفیات یاد کرتا، لاکھ ذہن پر زور ڈالتا، یہ بات کسی طرح عقل میں نہ آتی کہ آج صبح ہفتے کو چلا تو شام ہوتے ہوتے اتوار کیسے آ گئی۔ مَیں جتنا سوچتا، اتنا ہی اُلجھتا اور پریشان ہو جاتا۔

کھانا ختم کر کے اپنا ہیٹ اُٹھایا اور سرائے سے باہر نکل آیا۔ جلدی جلدی گرجاگھر کی طرف روانہ ہُوا۔ گیٹ پر رُک کر سگریٹ سُلگانے کے بہانے اندر سے آنے والی آواز پر کان لگا دیے۔ واقعی یہ پادری کے دُعائیہ کلمات کی آواز تھی۔ اس کا مطلب ظاہر تھا کہ اندر اتوار کی عبادت ہُوئی ہے جو اب ختم ہونے کو تھی۔ مَیں ایک عجیب اُلجھن اور ڈپریشن کے بوجھ تلے دبا، بھاری قدموں سے چلتا، واپس سرائے میں آیا اور سیدھا اپنے کیبن میں چلا آیا اور سوچنے لگا کہ یہ سارے کا سارا قصبہ کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ ان سب کی یادداشتوں کو کیا ہو گیا ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ میری یادداشت دُرست ہے۔ خواہ مخواہ یہ سب کے سب مجھے پاگل کیے دے رہے ہیں۔ اس خیال نے وقتی طور پر مجھے تسلی ضرور دی اور مَیں بستر میں لیٹ گیا لیکن رہ رہ کر ذہن میں اُٹھنے والے سوالات دبائے نہ جا سکے۔ اچانک میری نظر مینٹل پیس پر رکھے کاٹج ہسپتال کے خیراتی کیش بکس پر جا پڑی جو مسافروں کے لیے رکھا ہُوا تھا کہ وہ حسبِ توفیق مقامی مریضوں کے لیے کچھ خیرات اس میں ڈال جائیں۔ کیش کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



خیال کوندے کی طرح لپکا کیوں نہ میں اپنی کیش بک دیکھوں جس میں روزانہ اخراجات کا حساب اور بلوں کی ادائیگی کا اندراج ہے شاید وہ اس معمّے کے حل کرنے میں کچھ مدد کر سکے۔ میں نے جلدی سے اپنی کیش بک نکالی اور بے صبری سے ورق اُلٹے پہلی نظر میں مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ انہی بستیوں اور سراؤں کے بل تھے جہاں میں اپنی یادداشت کے مطابق وقت گزار چکا تھا۔ کوئی نیا نام یا مقام سامنے نہ آیا۔ میں نے دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا تو ایک عجیب سی بات سامنے آئی کہ شیڈز ہوم کے بل کی ادائیگی دگنی درج تھی۔ گویا میں نے منگل کے علاوہ بدھ کو بھی یہیں قیام کیا ہوگا۔ اب میں نے بیل بجائی اور مسز شینٹو کو صبح کے ناشتے کا آرڈر دینے کے بہانے بلایا اور جب وہ آرڈر لے کر جانے لگیں تو میں نے بظاہر بے پروائی سے سوال کیا:

"مسز شینٹو! میں بھلا پہلے کس دن آپ کے یہاں ٹھہرا تھا؟"

"جناب! منگل اور بدھ کی رات آپ یہاں ٹھہرے تھے اور جمعرات کی صبح یہاں سے پیدل روانہ ہو گئے تھے۔ اچھا! جناب، شب بخیر! ناشتہ آپ کو ٹھیک آٹھ بجے مل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میرا خیال درست نکلا کہ بدھ کی رات ہی ساری گڑبڑ ہوئی ہے اور میرا دن شیڈز ہوم ہی میں کھویا ہے۔ مسز شینٹو کے رویے سے ایک بات صاف ظاہر تھی کہ میں بہرحال، اس دن ایک نارمل آدمی کی طرح رہا ہوں گا کوئی حرکت مجھ سے ایسی سرزد نہیں ہوئی جس کی بنا پر مسز شینٹو کسی شبہے میں مبتلا ہوتی۔ ایک اور بات یہ بھی طے تھی کہ میں نے وہ سارا دن باہر گھومنے پھرنے میں گزارا ہوگا اور رات کو آکر سو رہا ہوں گا، کیونکہ بل میں دوپہر کے کھانے کا ذکر نہیں تھا، تاہم یہ اُلجھن اپنی جگہ برقرار تھی کہ وہ دن کس مصروفیت میں گزرا ہوگا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں ساڑھے نو بج گئے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اپنی توجہ ہٹانے اور نیند لانے کی خاطر میں نے کچھ پڑھنے کی ٹھانی اور سائڈ بورڈ سے شمع اُٹھا کر پلنگ کے سرہانے رکھ لی۔ اس

چھوٹے سے کمرے میں جہاں ضرورت کی ہر چیز تھی، وہاں ایک چھوٹا سا شیلف کتابوں کا بھی تھا جس میں پانچ سات کتابیں اور کچھ پرانے رسالے رکھے تھے۔ انہی پرانے رسالوں میں سے میں نے ایک پرچہ اُٹھایا اور اپنے بستر پر لیٹ کر ایک کہانی پڑھنی شروع کی اور آخر تک ختم کر ڈالی۔ اُس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ کہانی کے آخر میں پورے صفحے پر ایک تصویر چھپی تھی جس پر عنوان درج تھا: "ایک ایسا منظر جسے وہ کبھی نہ بھلا سکا"۔ تصویر دیکھ کر میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اُف میرے خدا! یہ تو ہُوبہو وہی منظر تھا جو میں آج دیکھ کر آ رہا تھا کہ ایک شخص ایک ملاح کی لاش پر جھکا ہُوا بالکل اُسی انداز سے اُسے دیکھ رہا تھا جیسے میں آج اُس ویرانے میں گھٹنوں کے بل جھک کر اُس لاش کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ دل ہلا دینے والی بات یہ تھی کہ تصویر میں مقتول کی شکل و شباہت اور حلیہ بھی وہی تھا اور وہی کھلی آنکھیں تھیں اور چت لیٹنے کا انداز اور کانوں میں بالیاں بھی اُسی انداز کی تھیں۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ تصویر دیکھنے کے بعد میری کیا حالت ہُوئی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

ایک احساسِ جُرم جانے کیوں میرے ضمیر سے چمٹ کر رہ گیا۔ میری یادداشت کا کھو جانا اور پھر ویرانے میں لاش کا دیکھنا اور پھر اُسی لاش کی تصویر ایک پرانے رسالے میں پا لینا، ضرور ان کے پیچھے کچھ نادیدہ عوامل کارفرما ہیں اور ان کا میری ذات سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ اوہ، تو کیا واقعی میں کسی اَن دیکھی طاقت کا آلۂ کار تو نہیں بن رہا؟ کیٹن کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا جو کہہ رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن میری بات کے قائل ہو جاؤ گے۔ میں کس کا آلۂ کار تھا، اور کیوں تھا، یہ تو میں نہیں جانتا تھا، لیکن اس پاگل کر دینے والی اُلجھن سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں پولیس کو اس لاش کی اطلاع کے علاوہ اپنی یادداشت کے کھو جانے اور دوسرے حیران کُن واقعات کا ذکر بھی کر دوں۔ کبھی خیال آتا ممکن ہے پولیس اپنی تفتیش کا آغاز ہی مجھ سے کرے اور میں خواہ مخواہ کی مصیبت میں مبتلا ہو کر کسی دوسرے کی سزا بھگتنے



پر مجبور ہو جاؤں۔ پھر سوچا کہ اپنے آپ کو ضمیر کی سزا سے بچانے کا یہی ایک راستہ ہے۔ اگر میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں تو خوف کس بات کا؟ ورنہ شبہات کے خار میری رُوح میں کھٹکتے رہیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے میں اطمینان سے بستر میں لیٹ گیا۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

✻

صبح کے نو بجے میں نیند سے بیدار ہُوا۔ کھڑکی میں سے سُورج کی کرنیں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ پوری نیند کر لینے سے میری طبیعت خاصی تر و تازہ تھی اور رات کے خوفناک خیالات اب محض خواب کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے سرہانے سے اُٹھا کر رسالہ واپس اُسی شیلف میں رکھ دیا اور غسل خانے میں گھس گیا۔ تیار ہو کر باہر نکلا تو مسز شینٹو کو ناشتے سمیت منتظر پایا۔

"صبح بخیر مسٹر! کیا آپ آج بھی گھومنے جائیں گے؟ اگر پسند کریں تو کچھ سینڈوچ اور پانی کی بوتل وغیرہ تیار کر دوں؟"

"ہاں، مسز شینٹو! بالکل ٹھیک ہے۔ میں شام کو چار پانچ بجے سے پہلے نہ لوٹ سکوں گا۔"

"بہت بہتر سر!" یہ کہتے ہُوئے مسز شینٹو دروازے سے نکل گئیں اور جونہی میں نے ناشتہ ختم کیا، وہ سینڈوچز کا پیکٹ لے کر پہنچ گئیں۔

تقریباً گیارہ بجے میں سرائے سے باہر نکل آیا۔ پھر نہ چاہتے ہُوئے بھی میرے قدم خود بخود کل کے راستے پر اُٹھنے لگے اور میں نے کوئی مزاحمت بھی نہ کی۔ آخرکار میں اس چٹان تک پہنچ گیا جہاں میں کل دوپہر لاش دیکھ کر گیا تھا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اب وہاں کوئی لاش تھی نہ اُس کا کوئی نشان۔ میں جلدی سے چٹان کے اُوپر چڑھ گیا اور دُور دُور تک دیکھتا رہا کہ شاید کوئی جانور اُٹھا کر لے گیا ہو لیکن تاحدِ نظر ایسی کوئی علامت نہ ملی۔

میرا پہلا قیاس یہی تھا کہ شاید میں نے جگہ پہچاننے میں غلطی کی ہے اور ویسی ہی کسی ملتی جلتی چٹان پر آ گیا ہوں۔ تب میں نے جُھک کر اپنے ہی قدموں کے نشان تلاش کرنا چاہے اور فوراً اپنے بوٹوں کے نشان پہچان لیے جو یہیں ایک جگہ رُک کر میرے آنے والے راستے کی طرف مُڑ گئے تھے۔ اب اس میں شک کی ذرا گنجائش نہ تھی کہ جگہ یقیناً وہی ہے۔ تو پھر لاش کہاں گئی؟ یہ ممکن ہے کہ یہاں سرے سے کوئی لاش ہی نہ ہو۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنا دماغ گھومتا ہُوا محسوس ہُوا پھر ایک خیال کوندے کی طرح لپکا کہ یقیناً میرا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے اور یہ سب کچھ میرا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ میں اُس وقت یقینی طور پر دورے کی کیفیت میں تھا۔ بے بس ہو کر میں گھٹنوں کے بل جُھک گیا اور خدائے بزرگ و برتر سے رحم کی بھیک مانگنے لگا اور پھر اُٹھ کر بوجھل قدموں سے واپس شیڈز ہوم چل پڑا۔ راستے میں فیصلہ کیا کہ میں کل ہی اپنی چھٹی ختم کرا لوں گا اور واپس جا کر کسی اچھے نیورو سپیشلسٹ سے اپنا معاینہ کراؤں گا۔ مزید اذیت برداشت کرنا میرے بس میں نہیں۔

سرائے میں پہنچ کر میں نے تھوڑا سا آرام کیا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک ایک باتونی بُڈھے سے باتیں کرتا رہا۔ میں جب نیند سے نڈھال ہونے لگا تو اُٹھ کر اپنے کیبن میں آ گیا جہاں کچھ اور پُراسرار واقعات میرے تعاقب میں تھے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر بیٹھا تو مسز شینٹو نے تازہ اخبار لا کر رکھ دیا۔ جونہی میں نے اخبار اُٹھا کر دیکھا میرے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ کر پلیٹ میں گر گیا۔ اخبار بدھ یکم اکتوبر کا تھا، جبکہ میرے حساب سے آج منگل تیس ستمبر کا دن تھا۔ بدحواسی کے عالم میں ناشتہ اَدھورا چھوڑ کر میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور کمرے میں آ گیا۔ میرے چہرے کے تغیرات سے شاید مسز شینٹو نے یہ سمجھا کہ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ جھٹ پٹ ٹھنڈے مشروب کا گلاس لیے میرے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئیں۔

"میرا خیال ہے مسٹر! آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ آپ آرام کیجیے اور یہ مشروب پیجیے۔" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہُوئے میں نے کہا: "مسز شینٹو! جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میں اپنی یادداشت کھو رہا ہوں۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ منگل کو میں کل میں کیا کرتا رہا۔"

"اوہ، گھبرائیے نہیں، جناب! ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ خدا آپ پر رحم کرے! میں آپ کو بتاتی ہوں کل آپ نے سارا دن ساحلی چٹانوں میں گزارا۔ صبح ناشتے کے وقت میں نے آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے سینڈوچ بھی بنا کر دیے تھے اور رات کو کھانے کے بعد دیر تک آپ اس بُڈھے مسافر سے باتیں کرتے رہے جو آج صبح صبح اپنے جہاز کے ساتھ روانہ ہو گیا۔"

"اچھا تو پھر میں، پیر کو کیا کرتا رہا؟" میں نے پوچھا۔

"اُس دن بھی جناب نے سارا دن باہر ہی گزارا تھا۔ آپ مجھ سے ایک کُھرپا مانگ کر لے گئے تھے۔ شاید کسی پرندے کو دفن کرنا تھا۔ ہاں! کسی سبز طوطے کا نام لیا تھا آپ نے مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ آپ اُس رات بہت دیر سے لوٹے تھے۔"

"اچھا! تو آپ جلدی سے میرا بل لائیے۔ میں واپس جا رہا ہوں، آج اور ابھی۔" مسز شیلفو چلی گئیں تو اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے میں نے رسالے کی وہی جلد نکالی جس میں مقتول ملاح کی تصویر تھی۔ جلد جلد ورق اُلٹ کر اس کہانی کے اختتام پر پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں اس قسم کی کوئی تصویر موجود ہی نہ تھی۔ میں زور زور سے چیخنا چاہتا تھا، لیکن بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو رکھا اور رسالے کی ابتدا میں مندرجات دیکھنے شروع کر دیے۔ مندرجات کے مطابق اس تصویر کو کیپشن سمیت موجود ہونا چاہیے تھا اور جب رسالے کو اچھی طرح اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تصویر والا صفحہ کسی نے بڑی صفائی سے پھاڑ لیا ہے۔ رسالہ بند کر کے تقریباً دوڑتا ہوا نیچے اُترا اور میں نے قریبی اسٹیشن پہنچ کر دم لیا۔ گاڑی پکڑی اور اعصاب کے تنتاتے ہوئے پولیس اسٹیشن جا کر پولیس انسپکٹر کو پوری کہانی من و عن سنا دی۔ پہلے تو انسپکٹر کو میری کہانی پر یقین ہی نہ آیا اور وہ مجھے پاگل سمجھتا رہا، لیکن جب میں نے اپنا تعارفی کارڈ پیش کیا تو اُسے ماننے ہی بنی۔ اُسی وقت دو مددگاروں کے ہمراہ میرے ساتھ روانہ ہو گیا اور دو تین دن کی سرگرم تفتیش سے خاصے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ لاش میری بتائی ہوئی جگہ سے مل گئی جسے بڑی چٹان کی دراڑ میں تھوڑی سی جگہ کھود کر اس ہوشیاری سے چھپایا گیا تھا کہ اگر نشان دہی نہ کی جاتی تو قیامت تک کسی کو معلوم نہ ہو سکتا۔

دورانِ تفتیش ایک گیم کیپر کی شہادت نے سارا کام آسان کر دیا۔ اُس نے بتایا کہ چوبیس ستمبر کو میں نے یہاں دو آدمی گزرتے دیکھے تھے جن میں سے ایک پادری کے لباس میں تھا اور دوسرے کا حلیہ بیرونی ملاحوں کا سا تھا۔ میں نے انہیں پکارا لیکن وہ رُکے نہیں، شاید فاصلہ زیادہ تھا اور آواز اُن تک نہ پہنچ سکی۔ وہ پادری میں ہی تھا۔ میرے بارے میں پوری چھان بین کی گئی اور کئی ماہر ڈاکٹروں کو بُلا کر میرا معائنہ کرایا گیا اور مجھے پورے طور پر صحت مند قرار دیا گیا۔ آخر کار یہ ثابت ہوا کہ قتل کی یہ واردات میرے پہلے گمشدہ دن کے دوران مجھ سے سرزد ہوئی تھی اور اُسے چھپانے کی حرکت دوسرے گمشدہ دن میں ہوتی رہی ——

میں نے کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اس فیصلے پر سر جھکا دیا تھا، کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سب کچھ مجھی سے سرزد ہوا ہے، تاہم یہ افسوس ضرور تھا کہ میری اس غریب ملاح سے کبھی کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ اُس سے میری کوئی دشمنی تھی اور پھر کیپٹن ایلڈرڈ کے الفاظ اور اُس کی آنکھوں کی چمک مجھے یاد آئی تو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ تو کیا مجھے کسی شیطانی قوت نے اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا؟ کیپٹن نے اپنی بات منوانے کے لیے تو ... نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عمر قید کی سزا بھگتنے سے لے کر آج تک میرا کوئی دن گم نہیں ہوا۔ رہا ہونے کے بعد جب میں سیدھا اپنے چرچ میں ایلڈرڈ کیپٹن سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اُسی دن سے غائب ہے جس دن مجھ سے ایک معصوم اور بے گناہ ملاح قتل ہوا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com